آجکل

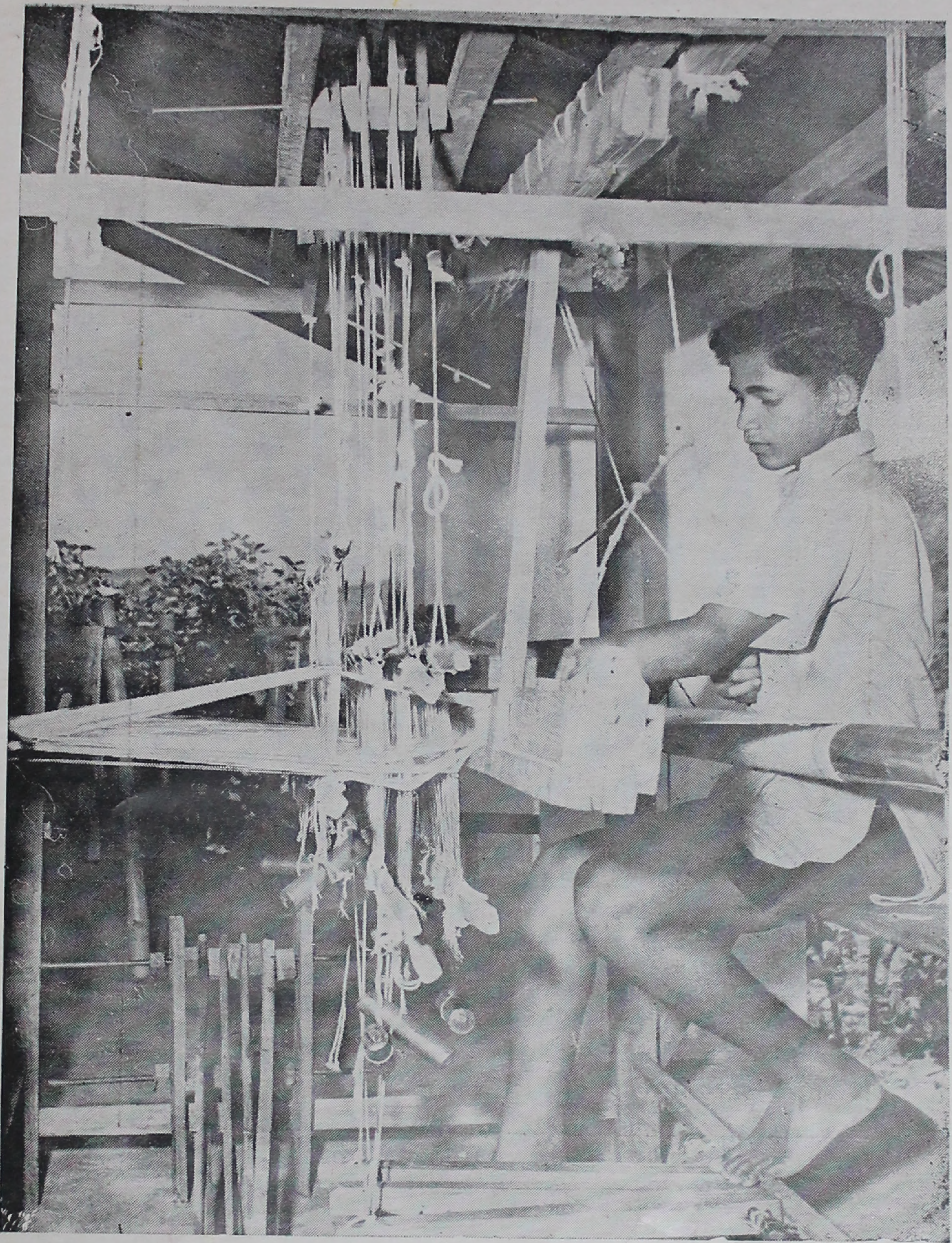
افسانہ نمبر



شراون شک سمت ۱۸۸۶

اگست سنہ ۱۹۶۴ء

ایک روپیہ



ایک آدی باسی لڑکا کرگھا چلا رہا ہے

ترتیب

سرورق:- ایک کتھک رقاصہ

رسالے کی پشت پر:- پرائم منسٹر ہاؤس - جسے ایک قومی یادگار بنادیا گیا ہے

جلد ۲۴ - نمبر ۱

شراون شک سمہ ۱۸۸۶

اگست سنہ ۱۹۶۴ء

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل سالنامہ

دہلی

افسانہ نمبر

سالانہ چندہ:-	ہندوستان میں:-	سات روپے
	پاکستان میں:-	سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے:-		۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمت فی پرچہ:-	ہندوستان میں:-	۶۰ پیسے
غیر ممالک سے:-	پاکستان میں:-	۶۰ پیسے (پاک)
		۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مرتبہ وشائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ گورنمنٹ

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ملاحظات

پنڈت جواہرلال نہرو کے انتقال کے بعد ملک پر جو افسردگی چھائی تھی اس کے آثار گو ابھی باقی ہیں لیکن یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ ان کے جانشینوں نے ان کے نقشِ قدم پر چل کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان کی یک جہتی بے مثال ہے اور وہ اتحاد و آشتی کی راہ پر چلتا رہے گا۔

اردو کے ہمہ جہت ادیب اور شاعر ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد افق کی صد سالہ برسی دلّی میں منائی جانے والی ہے۔ افق مرحوم بڑے طباع شاعر، قابل مترجم اور اچھے نثر نگار تھے۔ ان کی نظمیں آج سے ساٹھ ستّر برس پہلے کورس میں شامل تھیں۔ رامائن، مہابھارت اور راجستھان کے ترجمے آج تک مقبولِ عوام ہیں۔ اس تقریب کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل ہو چکی ہے جس کے صدر جناب گوپی ناتھ امن اور اراکین میں افق صاحب کے صاحبزادے جناب منوّر لکھنوی بھی شامل ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ تقریب حسن و خوبی سے سرانجام ہو گی اور افق صاحب کے غیر مطبوعہ کلام کو شائع کرے گی۔

مصر اور یورپ میں چھ سال کے قیام کے بعد اردو کے مشہور ادیب جناب ملک رام صاحب دلّی تشریف لے آئے ہیں۔ ان کے ورودِ مسعود پر ادارہ ان کی خدمت میں ہدیۂ خوش آمدید پیش کرتا ہے اور متوقع ہے کہ 'آج کل' پر ان کی سابقہ نوازشات کا سلسلہ جاری رہے گا۔

یہ خبر نہایت اندوہ ناک ہے کہ پاکستان میں حال ہی میں دو نامور ادیبوں کا انتقال ہو گیا۔ افسوس کہ مولانا صلاح الدّین احمد اور الحاج مولانا حامد حسن قادری اس عالمِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

مولانا صلاح الدّین احمد نے اردو زبان و ادب کی بہت خدمت کی۔ انھوں نے پنجاب اکادمی قائم کی اور بعد میں اردو فاؤنڈیشن کی طرح ڈالی۔ جس کا نصب العین اردو کی کلاسکی کتابیں شائع کرنا تھا۔ مولانا نے زندگی میں سیکڑوں بلند پایہ مضامین لکھے۔ امید کی جاتی ہے کہ ان کے مضامین کا مجموعہ جسے ڈاکٹر وزیر آغا مرتّب کر رہے تھے 'صریرِ خامہ' کے نام سے شائع ہو گا۔ مولانا صلاح الدّین احمد نے اپنا مکان، ادبی دنیا کا سارا اثاثہ اور ذاتی لائبریری اردو فاؤنڈیشن کی تحویل میں دے دی تھی۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوں گے۔

پروفیسر حامد حسن قادری اردو کے مشہور ادیب، مشہور نقاد اور مشہور استاد تھے۔ آپ ۱۸۸۷ء میں بچھراؤں ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ایک مدّت دراز تک سینٹ جانس کالج آگرہ میں استاد رہے۔ آپ کو اردو، فارسی اور عربی پر یکساں عبور تھا۔ موصوف چالیس کے قریب کتابوں کے مصنّف ہیں جن میں داستانِ تاریخِ اردو، نقد و نظر، کمالِ داغ، انتخابِ مومن اور تاریخِ مرثیہ گوئی کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ اپنے بچّوں کے پاس کراچی چلے گئے تھے اور وہیں آپ کا انتقال ہوا۔

تاریخ ہائے وفات

منجانب غمزدہ تمنا بجنوری
۱۹۶۴ء

قطعہ تاریخ وفات جانگزا
۱۹۶۴ء

حاکم عالی جاہ پنڈت جواہر لعل نہرو آنجہانی
۱۳۷۱ ف
وزیر اعظم ملک ہند

کہ بعارضۂ از انواع قلب
۱۳۷۱ ف
بتاریخ مخالف
۱۹۶۴ء
موسومہ لبست و ہفت منسوب زماہ مئی
۱۳۷۱ ف

سن دگرگوں یک ہزار نہ صد و شصت و چار عیسوی
۱۹۶۴ء
بروز چہار شنبہ بوقت ساعت دو

انتقال فرمود

غم باندازۂ نہرو
۱۳۷۱ ف

تمنا گفت تاریخش کہ ہیہات
جواہر لعل نہرو رفت و بگزشت
۲۰۲۱ بکرمی

•

سید مسعود حسن بکیم پور

تیرے سینے پر مہکتا تھا گلِ شادابِ امن
ذات سے تیری تھی روشن محفلِ اربابِ امن

ایک مدت سے تھا ملک ایشیا بیتابِ امن
تو نے چھڑکا سوختہ جانوں کے دل پر آبِ امن

صرف کر دی صلح کی کوشش میں ساری زندگی
محو ہے خوابِ عدم میں کر کے پورا خوابِ امن

تیری ذاتِ نیک تھی بحرِ سیاست کا صدف
قلب میں تیرے تھا پنہاں گوہرِ نایابِ امن

دیکھ کر دورِ خزاں کو سب عنادل تھے خموش
تو نے چھیڑا بوستاں میں نغمۂ مضرابِ امن

مل گیا مسعود کو یہ مصرعۂ سالِ وفات
ہو گئے رخصت جواہر لال نہرو بابِ امن
۱۹۶۴ء

•

احتشام احمد اسد

کہاں سے آئے زمانے کو اب قرار اے دل
دکھائی دیتے ہیں سب لوگ سوگوار اے دل

اسد نے ایسی مصیبت کی ضبط کی تاریخ
کنارِ ہند سے رخصت ہوئی بہار اے دل
۱۹۶۴ء

•

حامد بھکاوی

پنڈت نہرو سے

سکوت کیسا ہے ان لبوں پر
یہ کیوں اداسی سی چھا رہی ہے ؟

یہ لب جنھوں نے
فضائے خاموش کو ترنّم عطا کیا ہے
یہ لب جنھوں نے
مسائلِ زندگی کے عقدوں کو وا کیا ہے
خموش کیوں ہیں ؟

یہ لب جنھوں نے
ہمیں تکلّم کی حُسن کاری
ہمیں تبسّم کا راز بخشا
خموش کیوں ہیں ؟

یہ لب جنھوں نے
ہمیں شعورِ وطن پرستی
حیات کا بانکپن دیا ہے
خموشش کیوں ہیں ؟
یہ خامشی زندگی کی قدروں کی ترجماں ہو سکے گی کیسے ؟
یہ خامشی زندگی کی خاطر علامتِ جہد ہو گی کیسے ؟

رحمٰن جامی

بے تاج بادشاہ

(سانیٹ)

ہے دل ہر ایک آج غم سے گھائل
جدائی اس کی سہی نہ جائے
ہے بات دُکھ کی کہی نہ جائے
کہ قوم کی قوم اب ہے بسمل

دلوں پہ اس کی تھی حکمرانی !
وہ ایک بے تاج بادشہ تھا
وہ بے سہاروں کا تھا سہارا
تھا دل ہر ایک اس کی راجدھانی

•

وہ ایک ہندوستاں کا دھن تھا
تھی جس کی عزّت دلوں میں سب کے
تھی اک محبّت دلوں میں سب کے
وہ ایک مہکا ہوا چمن تھا

نہ مل سکے گی پھر ایسی خوشبو
چمن چمن اب ہے ذکرِ نہرو

•

کرشن چندر

کنواری

میگی ایلیٹ اسّی برس کی پُر وقار خاتون ہیں۔ بڑے قاعدے اور قرینے سے سجتی ہیں۔ یعنی اپنی عمر، اپنا مرتبہ، اپنا ماحول دیکھ کر سجتی ہیں۔ لبوں پہ ہلکی سی لپ سٹک، بالوں میں دھیمی سی خوشبو، رخساروں پہ پوڈر کا شائبہ سا۔ اتنا ہلکا کہ گالوں پہ رنگ معلوم نہ ہو کسی اندرونی جذبے کی چمک معلوم ہو۔ ہر شام ان کی لاغر کلائی کا کنگن بدل جاتا ہے۔

میگی ایلیٹ کے پاس چاندی کے چھ سات کنگن ہیں جنھیں وہ بدل بدل کے پہنتی ہیں۔ کسی مرد کو اپنے قریب دیکھ کر میگی ایلیٹ آج بھی اچانک گھبرا جاتی ہیں۔ پھر رک کر کچھ عجیب طرح سے شرما کر مسکراتی ہیں جیسے یہ مسکراہٹ دیکھنے والے سے اپنا بدن چرا رہی ہے۔ اس مسکراہٹ کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ مس میگی ایلیٹ اپنی طویل عمر کے باوجود ابھی تک کنواری ہیں۔ ان کے تبسّم میں ایک عجیب ان چھوئی سی کیفیت ہے...!

میگی ایلیٹ برونٹ کریم بھائی کے خاندان میں ستائیس برس کی عمر میں آگئی تھیں۔ وہ کارنوال کی رہنے والی تھیں۔ برونٹ کریم بھائی انھیں لندن سے اپنی سیکرٹری بنا کے لائے تھے۔ اور میگی ایلیٹ نے بھی بمبئی جانا اس لیے پسند کر لیا کہ وہ انگلینڈ میں اپنی محبّت کی بازی ہار چکی تھیں۔ وہ اس تکلیف دہ ماحول سے دور بھاگ جانا چاہتی تھیں: جہاں انھیں اپنی محرومی کا احساس کسی پالتو کتّے کی طرح ہر دم اپنے پیچھے پیچھے تعاقب کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ لندن چھوڑ کر بمبئی آگئیں۔ مگر سیکرٹری کی حیثیت سے زیادہ دیر تک نہ چل سکیں۔ کیونکہ ابھی محبّت کی محرومی کا احساس نیا نیا تھا۔ اس لیے وہ برونٹ کریم بھائی سے ملاقات کرنے کے لیے آنے والے مردوں سے بلا ضرورت تلخی کا سلوک کر بیٹھتیں۔ برونٹ کریم بھائی نے انھیں سیکرٹری کے عہدے سے الگ کر دیا۔ مگر نرم دل کے آدمی تھے اس لیے انھوں نے میگی ایلیٹ کو مسز کریم بھائی کی سیکرٹری بنا دیا۔

کئی برس میگی ایلیٹ مسز کریم بھائی کی سیکرٹری رہیں۔ جب مسز کریم بھائی کی وفات ہو گئی تو انھیں مسز کریم بھائی کے بچّوں کی گورنس بنا دیا گیا۔ برونٹ کریم بھائی مر گئے۔ بچّے جوان ہو گئے۔ لڑکیوں کی شادی ہو گئی۔ وہ خاندان سے باہر چلی گئیں۔ مگر میگی ایلیٹ خاندان کے اندر ہی رہیں۔ اب وہ برونٹ کریم بھائی کے سب سے بڑے لڑکے ارشاد کریم بھائی کی بیوی سکینہ کو انگریزی پڑھانے اور مغربی آداب سکھانے پر مامور تھیں۔ اور ان دنوں برونٹ کریم بھائی کے خاندان کے ساتھ بمبئی سے مسوری آئی ہوئی تھیں۔ کیونکہ گرمیوں میں برونٹ مرحوم کا سارا خاندان مسوری آتا تھا۔ ڈفل ڈوک کے مشہور دیوداروں والی گھاٹی پہ دو منزلہ کریم کاٹیج انگریزی گھاس والے لان اور انگریزی پھولوں والے قطعوں اور سلیٹی بجری والی روشوں اور سکینہ کریم بھائی کی اونچی سوسائٹی والی پارٹیوں کی وجہ سے بے حد مشہور تھا۔ جی۔سی کلب کی رنگینیت مشکل نہ تھی مگر سکینہ کریم بھائی کی دعوتوں میں بُلایا جانا بہت مشکل تھا اور اس کے لیے بڑی تگڑم کرنا پڑتی تھی۔ میں چونکہ تاش کا عمدہ کھلاڑی ہوں اور سکینہ کو برج سے عشق ہے، اس لیے میں اپنی دو ہزار روپے ماہوار کی قلیل آمدنی کے باوجود

کریم کا ٹیج کی دعوتوں میں بلایا جانے لگا۔ پھر اسی تاش کے چسکے کے طفیل سکینہ مجھے سہ پہر کی چائے میں بھی بلانے لگی۔ ہوتے ہوتے میرے دن کا بیشتر حصہ کریم کاٹیج میں گزرنے لگا اور سکینہ کی لڑکی عائشہ مجھے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہے، کیا ہرج ہے۔ اول تو سکینہ خود اس قدر سمجھدار ہے کہ اپنی سب سے بڑی لڑکی کو کبھی اپنی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ پھر مس ایلئیٹ اس قدر محتاط رہتی ہیں۔ پھر میں خود اس قدر ڈرپوک ہوں کہ کبھی کسی لڑکی کو لے کر بھاگ نہیں سکتا۔ اس لیے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھنا، انگلیوں کو چھو لینا، عائشہ کے ہات سے چائے کا پیالہ لے لینا، اس کی بڑھائی ہوئی پلیٹ سے مورین کریم کھالینا اور کبھی کبھی تاش کے دوران میں ذرا مخصوص لہجے میں اُسے 'پارٹنر' کہہ دینا بھی میرے لیے کافی ہے۔ چلئے زندگی میں پارٹنر نہ بنے تاش کے کھیل میں بن گئے! اور یوں غور سے دیکھا جائے تو زندگی کی بازی بھی ایک طرح سے تاش کا کھیل ہے۔ اس میں کبھی ہار ہے، کبھی جیت ہے۔ کبھی پتے اچھے آتے ہیں کبھی بُرے آتے ہیں۔ کبھی پارٹنر سے جھگڑا ہوتا ہے صلح و صفائی بھی ہوتی ہے۔ حساب کتاب بھی ہوتا ہے۔ اس طرح اپنے پتے کھیلتے کھیلتے ہم بھول جاتے ہیں کہ ان پتوں سے باہر بھی کوئی دنیا ہے۔ جہاں گلاب کھلے ہیں۔ مالی کی بیوی بیمار ہے۔ ایک لکڑ ہارا لکڑیاں لے کر بیچنے کے لیے بازار جا رہا ہے۔ ڈونڈی والوں کے کپڑے پھٹے ہیں۔ آسمان پر سپید بادل گھوم رہے ہیں۔ دیودار کی شاخ میں بلبل نے گھونسلہ بنایا ہے۔ مالی کے بیٹے نے گوپھیا سنبھالا ہے۔ یکایک ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو فضا میں تیرنے لگتی ہے اور عائشہ تنک کر مجھ سے کہتی ہے ۔ 'کیا سوچ رہے ہو، اپنا پتا جلدی سے چلو'۔

میں گھبرا کر اپنے پتے دیکھنے لگتا ہوں۔ کیوں کہ تاش کا کھیل کسی کے لیے زیادہ دیر تک رک نہیں سکتا۔ پھر وہ وقت بھی آئے گا۔ جب زندگی کی ساری تاش سمیٹ کر الگ رکھ دی جائے گی تمھاری قسمت کا بادشاہ اور یکہ بیگم اور غلام سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور تم اس تاش میں سے ایک پتہ نکال نہ سکو گے۔ کسی کو پارٹنر نہ کہہ سکو گے۔ تمھاری بازی ختم ہوئی اور بس اتنی ہی تمھاری بازی تھی ..... اس لیے اپنا پتا جلدی سے چلو۔

اصل میں جو میں اس طرح سے سوچتا ہوں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک دفعہ محبت کی بازی ہار چکا ہوں۔ دوبارہ زندگی کو داؤ پر لگانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میری طرح سنا ہے مس ایلئیٹ بھی اس میدان میں ہار چکی ہیں۔ مگر پھر بھی داؤ لگانے سے باز نہیں آتیں۔ یہ بھی ان کی زندگی سے گہری محبت کا ثبوت ہے۔ ہمیشہ مجھ سے چہل کرتی رہتی ہیں۔ حالانکہ جانتی ہیں، کچھ نہیں ہو سکتا۔ بھلا بتیس برس کے مرد اور اسی برس کی عورت کے درمیان کیا ہو سکتا ہے۔ مگر چہل کرنے سے باز نہیں آتیں۔ "پاشا اپنے ماتھے کی لٹ سنبھال لو۔ ورنہ میرا دھیان اپنے پتوں میں نہیں رہ سکتا۔" "پاشا کہاں دیکھ رہے ہو، کیا دیودار کے اس پیڑ پر تاش کے پتے لٹکے ہیں؟" — "اب کے میں ضرور جیتوں گی۔ کیوں کہ میرے پتوں میں ایک پاشا بھی ہے۔" وہ میرے نام کی خاطر بادشاہ کو پاشا کہنے لگی ہیں۔ مس ایلئیٹ کے معصوم مذاق سے سبھی محظوظ ہوتے ہیں۔ عائشہ بھی ہنس دیتی ہے۔ پھر میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ کر آنکھیں جھکا لیتی ہے۔ وہ جھکی جھکی آنکھیں مجھے اپنے پاس بلاتی ہیں۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں ہے۔ میں دونوں ہات بڑھا کر عائشہ کو اپنے بازوؤں میں لے سکتا ہوں۔ مگر نہیں لے سکتا۔ کیوں کہ تاش کھیلنے والے دوسرے بھی تو ہوتے ہیں۔ ایک طرف عائشہ کی ماں سکینہ بیٹھتی ہے۔ دوسری طرف کریم بھائی اسٹیٹ کے منیجر عاقل فاضل بھائی بیٹھے ہیں، جنھوں نے عائشہ کے لیے نیروبی کے ایک کروڑپتی تاجر کا بیٹا ڈھونڈ رکھا ہے۔ زندگی کی تاش کس قدر آسان ہوتی اگر دوسرے کھیلنے والے نہ ہوتے۔ اب تم ان سہمی سہمی نگاہوں کے چھوٹے چھوٹے پتے میری طرف کیوں پھینکتی ہو عائشہ۔ ان دُگی تگیوں سے کیا ہوگا۔ جبکہ یکہ اور بادشاہ، بیگم اور غلام اور نہلے پہ دہلا دوسروں کے ہات میں ہیں؟ نو بِڈ پارٹنر!

اپنا ہنسی مذاق مس ایلئیٹ سے تو چلتا ہی تھا۔ مگر اس کی کیفیت ایک معصوم چہل سے زیادہ نہ تھی۔ البتہ ماسٹر متین احمد کے سلسلے میں مس ایلئیٹ زیادہ سنجیدہ نظر آتی تھیں اور دن بدن گہری دل چسپی

کا ثبوت دے رہی تھیں۔ ماسٹر متین احمد یہاں مسوری میں آکر تین ماہ کے لیے ملازم رکھے گئے تھے۔ بچوں کو پڑھانے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے۔ اسٹیٹ منیجر فاضل بھائی نے بہت سوچ سمجھ کے متین احمد صاحب کو ماسٹر مقرر کیا تھا۔ کیوں کہ ماسٹر متین احمد خاصے بوڑھے تھے۔ ۷۰ برس کے قریب عمر ہوگی۔ دو بیویاں یکے بعد دیگرے وفات پا چکی تھیں۔ پوتوں نواسوں والے تھے۔ چھڑی لے کر اور سر جھکا کر اور اپنی گری ہوئی مونچھوں کو اور بھی گرا کر چلتے تھے۔ سرخ و سپید رنگت میں بڑھاپے کا پیلا پن اور بڑھاپے کی جھریاں آگئی تھیں مگر اس عمر میں بھی حوصلہ جوان رکھتے تھے اور دل گیر تخلص کرتے تھے۔ اپنا کلام جو آج تک کہیں نہ چھپا تھا مس ایلیٹ کو ہر روز سناتے تھے۔ مس ایلیٹ ہر چند کہ اردو شاعری میں کوئی استعداد نہ رکھتی تھیں، ایک مصرع پر مصرع اٹھاتی تھیں اور اس کوشش میں رہتی تھیں کہ کسی طرح گرہ بھی لگ جائے۔ حالانکہ اس نیک دل خاتون کی شاعرانہ صلاحیتوں کی معراج ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل سٹار سے آگے نہ بڑھی تھی۔ مگر اب وہ دونوں ماسٹر متین احمد اور مس میگی ایلیٹ کبھی کبھی برآمدے کے کسی کونے میں بیٹھے ہوئے، کبھی کسی لان پر ٹہلتے ہوئے، ڈفل ڈوک کے دیوداروں میں گھومتے ہوئے شاعری پر بحث کرتے رہتے تھے۔ اور بحث کے دوران میں میگی ماسٹر جی کا مفلر ٹھیک کرتی جاتی تھیں ورنہ سردی لگ جانے کا اندیشہ ہے اور سردی میں شعر ٹھٹھر جاتے ہیں۔ کبھی ان کے سر کی ٹوپی کا رخ بدل دیتی تھیں۔ کہ "یوں زیادہ اچھا لگتا ہے۔" کبھی ان کا ہاتھ پکڑ کے ڈوک کے نالے کے پتھروں پر قدم جا کر چلتی ہوئی نالہ پار کر جاتیں۔ ہر روز شام کو نالہ پار کرنا ضروری تھا۔ مرد کے بازو کا سہارا کتنا اچھا لگتا ہے۔ مرد کی انگلیوں کا مضبوط لمس، جیسے کسی کمزور بیل کو پیڑ مل جائے۔ صحت میں آج بھی میگی ماسٹر جی سے بہتر نظر آتی تھیں۔ مگر نالہ دیکھتے ہی چھ سال کی بچی کی طرح ڈرنے اور کانپنے لگتی تھیں اور اپنے سارے جسم کا بوجھ غریب ماسٹر جی پر ڈال دیتی تھیں۔ ماسٹر جی بھی ہانپتے کانپتے ہونٹ چباتے دمے کے مریض کی طرح سانس لیتے ہر روز بڑی بہادری سے مس میگی ایلیٹ کو نالہ پار کرا دیتے تھے۔ پھر دم اس قدر پھول جاتا کہ نالے کے اس پار پتھر پر بیٹھ کر دیر تک منہ سے کچھ

نہ بول سکتے۔ وادی کا منظر دیکھتے رہتے۔ اپنے سانس کی دھونکنی ٹھیک کرنے میں انھیں کئی منٹ لگ جاتے۔ مگر وہ خاموشی کے اس لمبے وقفے کو کسی طرح اپنی جسمانی کمزوری پر محمول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جب دم میں دم آتا تو کہتے: — "یہاں سے وادی کا منظر اس قدر خوب صورت دکھائی دیتا ہے کہ یہاں آتے ہی میں دم بخود ہو جاتا ہوں۔ منہ سے کچھ بول نہیں سکتا۔"

"یہی حالت میری بھی ہوتی ہے۔" میگی بھی اپنی پھولی ہوئی سانس کو قابو میں کرتے ہوئے کہتی — "یہ وادی بالکل تمھاری شاعری کی طرح خوب صورت ہے۔"

بہت دیر تک وہ دونوں چپ رہتے۔ کیونکہ واپسی میں نالے کو پھر پار کرنا ہوتا۔ ماسٹر متین احمد بڑی نا امیدی سے نالے کو دیکھتے اور ان کی ہمت ڈوب ڈوب جاتی اور وہ دل ہی دل میں سوچتے۔ کل سے میں میگی کو ادھر سیر کرنے کے لیے نہیں لاؤں گا۔ مگر میگی کی یہی تو ایک کمزوری تھی۔ نالے کے اس چند گز کے پاٹ میں وہ سب کچھ پا لیتی تھی۔ وہ سب کچھ جو اسے اس زندگی میں کبھی نہ ملا۔ اس مختصر سے فاصلے میں وہ کسی کی بیوی ہو جاتی، کسی کا سہارا لے لیتی۔ کسی کے کندھے سے سر لگا دیتی۔ کسی کی گہری قربت کا احساس کر لیتی۔ بالکل اس الھڑ کنواری کی طرح ہو جاتی جو کسی خطرے کے سمے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کسی مرد سے لپٹ جاتی ہے۔ نالے کے پار جا کر وہ پھر ایک انگریز عورت ہو جاتی تھی۔ اپنے آپ میں مکمل، مضبوط اور خود مختار۔ مگر نالہ پار کرتے ہوئے کمزوری کے یہ چند لمحے بڑے قیمتی ہوتے تھے۔ اور وہ ہر روز بڑی بے صبری سے ان چند لمحوں کا انتظار کرتی تھی۔

پھر ایک دن اس کی زندگی میں پام آ گئی۔ پامیلا تھوراٹ اس کی بمبئی کی سہیلی تھی۔ پامیلا نے بمبئی کے ایک تاجر سے شادی کی تھی۔ چند سال بمبئی میں رہ کر مسٹر تھوراٹ اور ان کی بیوی منگلور چلے گئے تھے چند سال خط و کتابت ہوتی رہی۔ پھر خط و کتابت بند ہو گئی۔ اب بیس بائیس برس کے طویل وقفے کے بعد جب پامیلا تھوراٹ اچانک مسوری میں اسے نظر آ گئی تو دونوں سہیلیوں کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ نہ صرف یہ کہ دونوں نے کئی منٹ تک مصافحہ کیا بلکہ آواز میں

لرزش بھی تھی - اور آنکھ میں آنسوؤں کا شبہ تک پیدا ہو گیا تھا۔

پام اس عرصے میں دو شوہر بھگت چکی تھی - وہ بے چارے دونوں مر چکے تھے مگر پام ساٹھ برس کی ہو کر بھی اپنی شوخی و طراری کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی - اپنی فطرت میں پام میگی سے بالکل الگ تھی - میگی دُبلی تھی تو پام موٹی - میگی سنجیدہ تھی تو پام بات بے بات قہقہہ لگانے والی - میگی ہلکا سا میک اپ کرتی تھی تو پام بالکل گہرا - بالکل جوان عورتوں کا سا میک اپ کرتی تھی - اس کی آواز ابھی تک بہت اچھی تھی اور اُسے بہت سے فحش لطیفے یاد تھے - نہیں نہیں - اس کی کوئی اولاد نہ تھی - پہلے شوہر سے ایک لڑکی ہوئی تھی - وہ دو سال کی عمر میں چل بسی - دوسرا شوہر ایک اینگلو انڈین تھا - وہ ہر وقت شراب میں دُھت رہتا تھا اور کبھی کبھی اُسے پیٹتا بھی تھا - کبھی کبھی مرد پیٹے تو بڑا مزا آتا ہے - پام نے میگی کو سرگوشی میں بتایا - کیوں کہ اس کے بعد مرد پر پچھتاوے کا ایک شدید دَورہ پڑتا ہے - اس میں وہ عورت کو بڑی شدّت سے منانے پر مجبور ہوتا ہے - اس دَورے میں بڑی احمقانہ باتیں کرتا ہے - روتا ہے - ہات جوڑتا ہے - پاؤں پڑتا ہے - کبھی کبھی اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر نیا فراک تک سلوا دیتا ہے - پام کو جب بھی کسی نئے فراک کی ضرورت ہوتی تھی وہ اپنے شوہر کو کسی نہ کسی طرح پیٹنے پر مجبور کر دیتی تھی - شوہر رکھنا عمدہ چیز ہے مگر آہ .... اب تو بڑھاپا آ گیا - پام اک آہ بھر کے چپ ہو گئی۔

" تم تو بالکل بچّہ ہو - بالکل بچّہ ! میگی نے بڑی عمر کی بہن کا رشتہ لیا اور پام کی اُلجھی لٹ ٹھیک کرنے لگی - " یہ بال کیسے بنا رکھے ہیں ..؟" میگی کے لہجے میں ممتا کی لرزش سی آ گئی - جسے سن کر پام کچھ اور پھیل گئی - اٹھلا کر بولی :

" اب ہم سے نہیں ہوتا میگی - "

" تم کہاں ٹھہری ہو ؟ " میگی نے پام سے پوچھا -

پہلے تو کلارکس میں ٹھہری تھی - ایک گجراتی فیملی کے ہمراہ احمد آباد سے آئی تھی - ان لوگوں کو جلد ہی واپس جانا پڑ گیا - خاندان میں کوئی موت ہو گئی تھی - وہ لوگ سب چلے گئے ہیں - مگر ایسی گرمی میں واپس احمد آباد نہیں جا سکتی - اس لیے میں ان کی ملازمت سے الگ ہو گئی ہوں - اور اب مسز ٹریورز کے چھوٹے سے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہری ہوں - بڑی کمینی عورت ہے - ابھی تک دو روز کی ابلی ہوئی پتیوں کی چائے پیتی ہے - جیسے یہ مسوری نہ ہو - انگلینڈ ہو اور جنگ ابھی تک جاری ہو - "

میگی پام کو مسز ٹریورز کے بورڈنگ ہاؤس سے کریم کاٹیج میں اُٹھا لائی اور اس سے ایسی محبّت اور شفقت سے پیش آنے لگی جیسے پام اس کی برابر کی سہیلی نہ ہو - کوئی چھوٹی سی بچّی ہو - میگی پام کے بال بناتی - پام کے کپڑے نکالتی - اس کے کپڑوں پر استری کرتی - اس کو مشورہ دیتی - وہ کون سی چیز کھائے ، کون سی چیز نہ کھائے - کبھی کبھی اُسے ایک سخت گیر ماں کی طرح ڈانٹ بھی دیتی اور پام میگی کی محبّت پا کر بے طرح اٹھلانے لگی تھی اور ساٹھ برس کی ہو کر تیس برس کی خاتون کی سی ادائیں دکھانے لگی - اور جب دیکھتی کہ میگی کی محبّت بہت زور مار رہی ہے تو تتلا تتلا کر باتیں کرنے لگتی !

اب میگی ، پام اور ماسٹر جی (ماسٹر مبین احمد) کا ٹگڈم بن گیا تھا - تینوں برآمدے کے دوسرے کونے میں الگ لے جا کر بیٹھتے تھے - تاش کھیلتے تھے - اپنی بیماریوں اور ان کی دواؤں پر مختلف زاویوں سے بحث کرتے تھے اور ہر وقت تین شریر بچّوں کی طرح مسرور اور مگن نظر آتے تھے - آپس میں ان کی کیا باتیں ہوتی تھیں یہ تو ہم نہیں جان سکے البتہ اتنا ضرور احساس ہونے لگا کہ ان تینوں میں گاڑھی چھن رہی ہے - ماسٹر جی جو پہلے صرف میگی پر اپنی پوری توجہ صرف کرتے تھے اب میگی کے اصرار کرنے پر پام پر بھی کسی قدر اپنی توجہ دینے لگے - آہستہ آہستہ یوں ہو گیا کہ تعلقات برابر کے ہو گئے - ماسٹر جی اپنی آدھی توجہ میگی اور آدھی توجہ پام کو دیتے تھے اور کسی طرف ڈنڈی نہ مارتے تھے - بہت دنوں تک یہ سلسلہ چلا - پھر ہوتے ہوتے غیر شعوری طور پر پام کی طرف پلڑا جھکتا چلا گیا - کیوں کہ پام ساٹھ برس کی تھی اور میگی اسّی برس کی - پام کے چہرے پر جھرّیاں بہت کم تھیں اور پام کسی قدر زندہ دل تھی اور کیسے عمدہ لطیفے سناتی تھی - میگی کی روح بلاشبہ پام سے بہتر معلوم ہوتی ہے - اس کے جذبے میں سچّائی اور شدّت بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے - مگر جسم کو جلد ہر سے

دیکھو ہڈیاں سی نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور پام تو بالکل گرم پانی کی بھری ہوئی ربڑ کی بوتل کی طرح آرام دہ معلوم ہوتی ہے۔ اور شریر پام پلڑا اپنی طرف جھکتے دیکھ کر غریب ماسٹر کو اور بھی اُکسانے لگی اور اکسانے لگی۔ اور اپنی سہیلی کی ساری خاطر و مدارات بھول کر اُسے جلانے پر تُل گئی۔

بے حیا پن! میگی نے دل ہی دل میں سوچا۔ پہلے تو میگی نے طرح دی اور بار بار وہ طرح دیتی رہی۔ کبھی نگاہیں پھیر لیتی جیسے اس نے کچھ دیکھا نہ ہو۔ پھر یوں غائب ہو جاتی جیسے اس نے کچھ سنا نہ ہو۔ پھر جب دل خون ہونے لگتا اس وقت بھی یوں ہنس دیتی جیسے کچھ ہوا نہ ہو۔ مگر پلڑا جھکتا ہی گیا۔ اور ہم دیکھتے رہے اور ان تینوں سے دُور ہی دُور اپنے برج کی میز سے اس دلچسپ ڈرامے کو دیکھتے رہے جو اب اپنی معراج کو پہونچ رہا تھا۔

ایک مہکتی ہوئی نارنجی شام میں جب ہوا کی خنکی بڑھ گئی تھی اور ہم لوگ جی۔سی کلب میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ عائشہ اور میں کالے رنگ مرمر کے پتھروں والے چبوترے پر کھڑے سکینہ اور فاضل بھائی کا انتظار کر رہے تھے، جو اپنے اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے گئے تھے۔ گئی تو عائشہ بھی تھی مگر کمرے سے جلدی نکل آئی تھی کیونکہ اس طرح سے ہم دونوں کو اکیلے میں ساتھ رہنے کے لیے چند منٹ مل جاتے تھے۔ اس وقت عائشہ ایک کالے شیر کی پیٹھ پر بیٹھی ہوئی تنک مزاجی سے بار بار اپنے دائیں پاؤں کا سینڈل ہلا رہی تھی اور قریب کے مرمریں ستون پر چڑھی ہوئی زرد گلاب والی بیل سے پھولوں کی کچی کلیاں توڑ توڑ کر میرے پاؤں پر پھینک رہی تھی۔ ایک کلی میری پتلون کی موہری میں جا اٹکی اور میں اسے نکالنے کے لیے جو جھکا تو مجھے عائشہ کا سُرخ ہوتا ہوا چہرہ اور اس کے سینے کے تھرتھراتے ہوئے ابھار اپنے بہت قریب نظر آئے۔ کیونکہ عائشہ بہت قریب سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جھکے جھکے اس کی طرف ایک لمحہ کے لیے دیکھا۔ وہ میرے اس قدر قریب تھی کہ میں اس کے سانس کی آنچ اور اس کے حسن کی پگھلتی ہوئی لَو اپنے رخساروں پر محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹ ذرا سے کھل گئے تھے اور بالکل منتظر تھے۔ ایسے میں میں نے سکینہ کو برآمدے کے اندر کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں نے جلدی سے پتلون کی موہری سے زرد گلاب کی کچی کلی کو نکالا اور سیدھا ہو کر اُسے زور سے دور پھینک دیا۔

"بزدل!" عائشہ ناگن کی طرح پھنکاری۔ پھر سکینہ کو آتے دیکھ کر سنبھل گئی۔

میگی اور پام اور ماسٹر جی بھی تینوں باہر جا رہے تھے مگر کلب کو نہیں۔ نالے پر سیر کرنے کے لیے کچھ دنوں سے یہ اکٹھے سیر کرنے کے لیے نالے کو جاتے تھے۔ آج سردی بڑھتی ہوئی دیکھ کر میگی اپنے دبلے چھریرے بدن میں جھرجھری محسوس کر کے کانپ اُٹھی۔ اس نے پام اور ماسٹر جی دونوں کی طرف دیکھ کر کہا:

"ٹھہرو! میں اندر سے اپنا اونی کوٹ پہن کے آتی ہوں...."

"اونی کوٹ موسمِ گرما کی رت میں؟" پام نے طنز آمیز انداز میں سوال کیا۔

مگر میگی اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دے کر اندر چلی گئی۔

چند لمحوں تک تو پام چپ رہی اور اپنے دونوں کولھوں پر ہات رکھ کر اِدھر اُدھر ڈولتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایک شریر چمک نمودار ہوئی اور اس نے سر کے اشارے سے ماسٹر متین احمد کو اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔

ماسٹر متین احمد نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا۔ بہت بے چین نظر آئے۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پام کے پیچھے ہو لیے۔ پام نالے کی سمت جا رہی تھی ماسٹر متین احمد کو ساتھ لے کر۔

چند لمحوں میں وہ دونوں نظر سے اوجھل ہو گئے۔ جب نظر سے اوجھل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ماسٹر جی پام کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ پام نے ان کے بازو کا سہارا لے لیا تھا، وہ بازو جو اب تک صرف میگی کے لیے وقف تھا۔ ان کے جانے کے بعد ہی میگی کچھ گنگناتی ہوئی اپنا ہلکا گرے اونی کوٹ پہن کر باہر نکل آئی۔ جب اس نے دیکھا کہ ماسٹر جی اور پام نہیں ہیں تو وہ ایکبارگی ٹھٹھک گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اک دم اس کے کوٹ کی طرح گرے ہو گیا۔

زیرِ لب ہونٹوں کی گنگناہٹ اک دم رک گئی۔ اس نے اِدھر دیکھا، اُدھر دیکھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سکینہ نے پوچھا:

" یہ لوگ کہاں ہیں ؟"

"چلے گئے!" سکینہ نے بے حس لہجے میں کہا۔

میگی کی ڈولتی ہوئی پتلیاں بڑی تیزی سے ادھر اُدھر گھومیں جیسے کوئی پرندہ اچانک زخمی ہو کے تڑپنے لگے۔ سکینہ ان آنکھوں کی اذیت کی تاب نہ لا سکی۔ بڑے غصے سے بولی:-

" میگی تمہیں ہوا کیا ہے۔۔۔۔؟ دیکھتی نہیں ہو۔ یا مَیں تم سے عمر میں کتنی کم ہے؟"

میگی نے ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر سیدھا سکینہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر بڑی نخوت سے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی:-

"عمر کم ہے تو کیا ہوا۔۔۔ میری طرح کنواری تو نہیں ہے!!"

پھر مس میگی ایلیٹ عمر اسی سال۔ ایک عورت، اپنی ایڑی پر گھوم گئی اور ایک ناقابلِ تسخیر غرور سے سر اٹھائے ہوئے برآمدے میں چلی گئیں —— واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں — دروازہ بند ہو گیا ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔ یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ ہنسیں —— یا روئیں؟"

سکینہ اک دم بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں ہم سے چُرا لی تھیں۔ اور اب تیز تیز قدموں سے آگے چل رہی تھی۔ اُن کے پیچھے پیچھے فاضل بھائی جلدی جلدی سے قدم بڑھانے لگے۔

عائشہ نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا۔

میں نے گلاب کی بیل سے ایک زرد کلی کو توڑ لیا۔ اور اسے سونگھتے ہوئے بولا:-

" نو بڈ یا رٹنز!"

جینت نارلیکر —— ایک قابلِ فخر ہندوستانی نوجوان

گزشتہ دنوں مشہور و معروف سائنس دان آئن سٹائن کی کششِ ثقل کی تھیوری پر مزید تحقیق کر کے ہندوستان کے ایک نوجوان سائنس دان ڈاکٹر جینت وشنو نارلیکر نے دنیائے سائنس میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔ ڈاکٹر نارلیکر نے جب سے پروفیسر فرڈ ہائل کے اشتراک سے رائل سوسائٹی میں حاضرین کے سامنے کششِ ثقل سے متعلق اپنی نئی تھیوری پیش کی ہے، اپنا نام لندن کے اخبارات میں نمایاں طور سے دیکھنے لگے ہیں اور آج کیمبرج یونیورسٹی کے لئے باعثِ فخر شخصیت ہیں۔

۲۵ سالہ ڈاکٹر نارلیکر نے نئی تھیوری پیش کر کے ثابت کر دیا ہے کہ کششِ ثقل کے بارے میں بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنس دان آئن سٹائن کی تحقیق مکمل نہیں تھی۔ نیز وہ اس سلسلے کی آخری کڑی بھی نہیں تھی۔

ڈاکٹر موصوف کی پیدائش ۱۹ جولائی ۱۹۳۸ء میں کولہاپور میں ہوئی لیکن ہوش سنبھالنے سے پیشتر ہی وہ اپنے والد کے ساتھ جو آج کل راجستھان پبلک سروس کمیشن کے صدر ہیں، بنارس آگئے جہاں ان کا تقرر ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر جینت وشنو نارلیکر نے اپنے والد کی سرپرستی میں علم ریاضی کی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۵۷ء میں بنارس یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ریاضی، طبعیات اور اعداد و شمار کے مطالعے کے لئے وہ کیمبرج یونیورسٹی تشریف لے گئے۔ پہلے وہ فٹز ولیم ہاؤس سے وابستہ رہے۔ گزشتہ سال انھیں کنگس کالج کا فیلو بنا لیا گیا اور اب وہ وہیں مقیم ہیں۔

علی عباس حسینی

وراثت

نصیر اور نسرین کی ملاقات چوبیس برس بعد پالم کے ہوائی اڈے پر ہوئی۔

نصیر اس طویل مدت کے بعد ہندوستان پلٹا تھا۔ وہ وطن سے بھاگا تھا اسی نسرین کو بھلانے کے لئے۔ وہ نہ جانے کتنے ملکوں میں مارا مارا پھرا، اس نے ان گنت تکلیفیں اٹھائیں، سختیاں جھیلیں اسی نسرین کے ہجر میں۔ اسی غم میں وہ دوسری جنگِ عظیم میں ایک معمولی سپاہی کی طرح بھرتی ہو گیا۔ سیکڑوں بار گولیوں کی بوچھار سے گزرا، کئی بار زخمی ہوا، مرتے مرتے بچا۔ جب آخری بار پاؤں کی ہڈی ٹوٹنے سے ہلکا سا لنگ صحت یاب ہونے پر بھی باقی رہ گیا، تو اسے فوج سے فارغ خطی مل گئی۔ پھر وہ اپنے طور پر ایشیا، افریقہ، جنوبی و شمالی امریکہ، الاسکا، کناڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، انڈونیشیا، ملیشیا میں سیر کرتا رہا، کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی تجارتیں بھی کیں، کہیں اپنے فرم کی شاخیں بھی کھولیں، کہیں اپنے کارخانوں کے بنے ہوئے مال کے لئے نئے نئے معاہدے بھی کئے۔ اس لئے کہ نصیر حقیقتاً ہندوستان کے بڑے پونجی پتیوں میں سے تھا۔ بمبئی اور احمد آباد میں اس کی کاٹن ملیں تھیں۔ کان پور میں ایک ٹینری تھی، گورکھپور میں ایک شکر مل، بھدوہی میں قالینوں کا کاروبار، اور کلکتہ میں جوٹ مل۔ اس کی ایک ٹی اسٹیٹ آسام میں تھی اور ایک کرالا میں۔ اس کی غیر حاضری میں یہ سارا کاروبار اس کے اعزاء اور اس کے معتمد ملازمین بڑے سلیقے سے چلاتے رہے۔ اس کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ اس کے پاس بہت سے کام تھے۔ اس کے پاس دل بہلانے اور غموں کے بھول جانے کے بڑے ذرائع تھے۔ لیکن اس نے لاکھ چاہا کہ نسرین کا خیال دل سے نکال دے، پر وہ نہ نکلا، نہ نکلا۔ ایک تہہ نشین کانٹے کی طرح رگِ جاں میں گھسا وہ ہمیشہ کھٹکتا رہا۔

نسرین اس کی محبوبہ و معشوقہ نہ تھی، اس کی سچی عاشق بیوی تھی۔ کیسے پیار اور محبت کے تین مہینے دونوں نے ساتھ گزارے تھے! سچ مچ دن عید تھے اور راتیں شب برات۔ جو دیکھتا یہی کہتا کیسا اچھا جوڑا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر فدا۔ دونوں حسین، دونوں پڑھے لکھے مہذب اور دونوں دولت مند۔ نصیر احمد آباد کے سب سے بڑے تاجر کا اکلوتا بیٹا اور نسرین سیٹھ عبدالکریم کروڑپتی کی واحد چشم و چراغ۔ مگر بے عیب ذات خدا کی۔ نصیر میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ اور وہ بھی اس انوکھے طور پر کہ یا تو مہینوں ایک قطرہ نہیں۔ یا جب پینے پر آیا تو پانچ سات دن سوائے شراب کے اور کچھ نہیں۔ وہی کھانا وہی پینا، وہی اوڑھنا وہی بچھونا، وہی زمین، وہی آسمان، وہی عزیز وہی دوست، وہی معشوق، وہی بیوی! پلنگ اور اس کے اردگرد کا حصہ ہر طرح کی آلائش سے پُر، ڈاکٹر کھڑے ہیں، نرسیں نگرانی کر رہی ہیں مگر اس دوران میں کوئی چیز سوائے شراب کے حلق سے اترتی ہی نہیں۔ اسے لوگ کہتے تھے "برسٹ" ہونا یعنی شراب نوشی کے خلاف سارے بندھن ٹوٹ جاتے تھے اور مستی و بے خودی کے اس سیلاب میں نصیر کی غیرت، حمیت، شرافت، انسانیت، محبت تک بہہ جاتی تھی اور

وہ ایسی ایسی حرکتیں کر بیٹھتا تھا جن کا اس جیسے آدمی کے بارے میں وہم وگمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

نہ نسرین اس کمزوری سے واقف تھی اور نہ نصیر کے سسر سیٹھ کریم کو اس کی خبر تھی۔ نصیر کے ہواخواہوں نے انھیں اس کی ہوا تک نہ لگنے دی تھی۔ سیٹھ پابند مذہب و حاجی ہی نہ تھے بلکہ نئے ڈھنگ کے "بزنس مین" ہونے پر بھی حد درجہ پرانے ڈھنگ کے آدمی۔ وہ بھلا ایسے شرابی کو اپنا داماد کیسے بناتے؟ خود نسرین کو شراب سے "الرجی" تھی۔ اسے اس کی بو سے قے آتی تھی۔ دور سے دیکھ لینا ہی اس کے دردِ سر کے لئے کافی بہانہ ہوتا تھا۔ کسی مے خانے یا بار کے سامنے سے گزر جانا ہی اس کو مضمحل بنا دیتا تھا۔

ایسی نازک مزاج بیوی پر نصیر نے اچانک 'برسٹ' کی آفت ڈھائی۔ وہ ایک شب میں ایک دوست کے ہاں دعوت میں اکیلا ہی گیا۔ نسرین کی ادھر پندرہ بیس دن سے کچھ طبیعت ماندی تھی۔ لیمو چاٹنے، کھٹی چیزیں کھانے کا شوق بڑھ گیا تھا۔ اس رات میں گرانیٔ سر کی وجہ سے شوہر کے ساتھ نہ جا سکی تھی۔ نو ہی بجے سے بستر پر لیٹی نیند بلاتی رہی تھی۔ وہ بڑے ناز نخرے سے آئی۔ سر تین مہینے سے کسی کے بازو اور سینے کو تکیہ بنانے کا عادی ہو گیا تھا، وہ شادی کے بعد اس شب پہلی دفعہ پہلو میں نہ تھا۔ غرض بڑی دقتوں سے گیارہ بجے کے قریب نیند کی دلھن بڑی منتوں، سماجتوں کے بعد خراماں خراماں آئی۔ اور اب وقت، تھا بارہ کا کہ دفعتہً نسرین کو محسوس ہوا کہ پورا انسٹڈ اس کسی نے منہ پر انڈیل دیا۔ وہ تڑپ کر جاگی۔ دیکھا تو نصیر شراب میں نہایا دو بوتلیں ہاتھ میں لئے اس پر پیار کرنے کو جھکا ہے، محسوس ہوا شوہر نہیں گندگی سے بھرا کوئی بنڈیلا ہے۔ وہ جھڑک کر نصیر کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی گرفت سے نکلی اور تھو تھو کرتی باتھ روم میں بھاگی۔ نصیر نے لڑکھڑاتے ہوئے پیچھا کیا۔ نسرین بیسن میں منہ کی کلیاں اُگل رہی تھی کہ نصیر نے پیچھے سے آکر اُسے دبوچنا چاہا۔

" اب کہاں تڑپے گی، میری فری!" نصیر نے نشے میں چڑھ آواز سے کہا۔

نسرین باز کے چنگل میں پھنسی ہوئی کبوتری کی طرح پھڑکی۔ اور اس نے میاں کو پوری قوت سے ڈھکیل دیا۔

نصیر لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور زمین پر گر پڑا۔

وہ بولا۔ " اشا! ام سے لڑتا شا ہلتی ہے، تو فر یسے! یہ لے!" اور اس نے نسرین کی ٹانگ اس زور سے کھینچی کہ منہ کے بھل حمام کے مرمریں فرش پر گرتے ہی اس نے چوٹ لگنے پر ہائے کی تھی کہ "یہ لے" کی ہر کے ساتھ منہ پر طمانچے پر طمانچے پڑے۔ پہلے تو وہ تڑپ رہی تھی لیکن طمانچے نے اُسے بُت کی طرح ساکت اور بے حرکت بنا دیا۔

نصیر شراب کے نشے میں سمجھا دشمن کو زیر کر لیا۔ وہ ناچا اور چھاڑ کر گالی دے کر بولا " ام سے لڑتی ہے ..... ! نکل جا اس گھر سے! نکل، ابھی نکل!"

نسرین خاموشی سے اُٹھی اور اس نے بڈ روم میں جا کر باہر نکلنے والے کپڑے پہن لئے۔ وہ اپنا پرس اُٹھا کر جا ہی رہی تھی کہ نصیر منہ سے بوتل لگائے باتھ روم سے جھومتا نکلا۔ نسرین کی تیاری دیکھ کر دھاڑا۔

" اشا جاتی ہے، تو جا! ہمیشہ کے لئے جا! میں نے تجھے طلاق دی!"

اور جب وہ اس پر حسرت بھری نظر ڈال کر چلی گئی تو نصیر آدھی بوتل ایک سانس میں خالی کر کے بولا۔ " شلی گئی، شالی شلی گئی!" اور ہنستے ہنستے رونے لگا اور بوتل پر بوتل خالی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بے ہوش ہو گیا۔

نسرین نے پالم کے ایئرڈروم پر جب نصیر کو ٹیکسی سے اترتے دیکھا تو وہ اسے مشکل سے پہچان سکی تھی۔ بیس برس کا جوان رعنا اب چوالیس برس کے ایک سوکھے سے بوڑھے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ گورا رنگ جھلس گیا تھا، کنپٹیوں کے پاس کے بال سفید ہو گئے تھے اور وہ جس کا ہر قدم مضبوط پڑتا تھا اب ہلکا سا لنگڑانے لگا تھا۔ چہرے پر گہرے نشانات تھے، اور اس کی بڑی بڑی مست آنکھیں پھیکی اور بے آب تھیں۔

چوبیس برس کا زمانہ ایک عمر ہوتا ہے۔ کم سے کم

نسرین کو تو وہ ایک جگ محسوس ہوا۔ وہ سترھویں میں تھی کہ اس کی شادی ہوئی تھی۔ صرف تین مہینے اس نے خوشی، عیش اور محبت کے دیکھے، پھر چوبیس برس کا بے آب و گیاہ صحرا شروع ہوگیا اور دل کی پیاس بجھانے والی ایک بوند بھی نہ ملی۔ یہ پیاس کیسے بجھتی اس لئے کہ نسرین ان بیویوں میں سے تھی جو زندگی بھر ایک ہی جام سے پی سکتی ہیں اور وہ پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا، ٹوٹ گیا تھا۔ اسے اب بھی نصیر سے بے پناہ محبت تھی۔

وہ اسی رات احمد آباد سے بمبئی چلی گئی تھی۔ اور اس نے سیٹھ عبدالکریم کی کوٹھی میں پہنچتے ہی غصہ اور غم کے زیر اثر باپ سے ساری روداد سنادی تھی۔ انھوں نے دوسرے ہی دن ایک وکیل کے ذریعہ نصیر کو نسرین کے مہر کا نوٹس بھیج دیا تھا۔ نصیر نے بے عذر ڈیڑھ لاکھ کا دین مہر کا چیک بھیج دیا تھا اور ڈاکٹروں کی اجازت ملتے ہی وہ یورپ چلا گیا تھا اور جہاں تک نسرین کو علم تھا آج وہ پہلی بار وطن کی پاک زمین پر دکھائی دے رہا تھا۔

نسرین کے دل میں جو غم و غصہ کا طوفان اس رات کے واقعہ سے اُٹھا تھا وہ کب کا ختم ہو چکا تھا، بس ایک آندھی تھی جس نے تھوڑی دیر رنجشوں کی گرد اڑائی، پھر آنسوؤں کا چھینٹا پڑتے ہی غبار چھٹ گیا۔ دل کا مطلع صاف ہوگیا تھا۔ اس صفائی کا باعث مہر کی بے عذر ادائیگی ہی نہ تھی بلکہ اس میں سب سے بڑا ہاتھ دونوں کی محبت کے پھل منیر کی پیدائش کا تھا۔

نصیر کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اپنی نشانی نسرین کے ہاں چھوڑ گیا تھا اور نہ سوائے چند لوگوں کے سیٹھ نے اس کی کسی کو کانوں کان خبر ہونے دی۔ طلاق کے چھٹے مہینہ جب منیر پیدا ہوا تو نانا نے گویا اولادِ نرینہ پالی تھی۔ اسے آنکھوں کا تارا سمجھا۔ وہی اس کے باپ اور اس کی ماں بلکہ سارے خونی رشتوں کا ذخیرہ بن بیٹھے۔ کسی کو منیر کی پرورش و پرداخت کے سلسلہ میں ایک پیسہ خرچ کرنے کی اجازت نہ دی۔ نسرین تک کو وہ اس معاملے میں رقیبانہ نظر سے دیکھتے تھے وہ اس کے روادار نہ تھے کہ نسرین اپنے پیسے سے منیر کے لئے کوئی قمیص، کوئی نیکر، دودھ کا ڈبہ، کوئی کھلونا یا کسی طرح کی کوئی چیز خرید سکے۔ ایسے میں بھلا وہ اس کی کیسے اجازت دیتے کہ پاجی نصیر کو اس کی اطلاع مل جائے کہ سیٹھ جی کی کوٹھی میں اب بھی کوئی ایسی شے ہے جس پر اس شرابی کا بھی کوئی حق ہے جسے وہ شرعاً اور قانوناً اپنا سکتا ہے اور سیٹھ جی سے چھین لے جا سکتا ہے۔ انھوں نے نواسے کی جگہ اسے اپنا ہی بیٹا کہہ کر لوگوں سے اس کا تعارف کرایا اور نسرین کو بھی "ممی" اور "امی" کی جگہ منیر سے "آپا" ہی کہلوایا۔

خود منیر کو بھی چودھویں سال تک اپنے حقیقی باپ کا نام نہیں معلوم تھا۔ اتفاقاً اسے اس سال جونیر کیمبرج کے امتحان کا فارم بھرنا تھا۔ سیٹھ جی کو مجبوراً منیر کو اس کے باپ کا نام بتانا پڑا۔ مگر نصیر کا نام جس تمہید کے ساتھ انھوں نے منیر پر ظاہر کیا اس نے منیر کے دل میں نصیر کی طرف سے ہمیشہ کے لئے نہ دور ہونے والی نفرت بھر دی۔ سیٹھ جی نے بیٹی اور نواسے کو بڑے اہتمام سے کُرسیوں پر بٹھایا۔ پھر منیر کو ایک گمنام شرابی کی کہانی سنائی جو اپنی بیوی پر طرح طرح کے ظلم کرتا تھا، اور جس نے آخر ایک رات کو بارہ بجے شراب کے نشے میں اسے خوب پیٹا اور طلاق دے کر گھر سے نکال دیا اور ایسی حالت میں اُسے گھر سے نکالا جب بیچاری کے بطن میں اس پاجی کا تین مہینے کا بچہ بھی تھا۔ پوری کہانی اس ڈرامائی انداز میں کہی گئی اور شوہر کے کردار کی اتنی تاریک تصویر پیش کی گئی کہ چودہ سالہ منیر غصے سے بوٹیاں نوچنے لگا۔

جب اس کی یہ حالت دیکھی تو سیٹھ نے عجیب طرح مسکرا کر کہا۔۔ "یہ ہیں تمھارے باپ کے کرتوت! اس کا نام ہے نصیر!"

منیر چیخ پڑا "نہیں! نہیں! وہ میرا باپ نہیں! میں ایسے سُور آدمی کو اپنا باپ نہیں مان سکتا!" اور وہ نانا کی گود میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

نسرین کے دل پر دو طرح کی چوٹیں لگیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے مُنہ پر اس کے چہیتے میاں کی ذلت کی گئی۔ نصیر اتنا تو بُرا ہرگز نہ تھا جتنا بھیانک بنا کر سیٹھ جی نے اسے پیش کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ منیر بجائے اس کے کہ ماں کی گود میں سر ڈال کر

بس سکتا۔ نانا کے زانو سے لپٹا رو رہا تھا۔ اس کا بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ وہ منیر کو سیٹھ کی گود سے کھینچ کر دو طمانچے مارے کہ تیرا باپ اتنا گرا ہوا نہیں ہے کہ تو اسے "سور" کہے اور پھر بیٹے کو چھاتی سے لگا کر اس کے اور اپنے آنسوؤں سے ساری دنیا کو جل تھل بنا دے۔ مگر اس نے چودہ سال میں وہ ہمت کھو دی تھی جس سے وہ منیر کو اپنے باپ سے چھینتی یا شوہر کے متعلق اسے جھٹلاتی۔ عورت ہمیشہ مرد کی پشت پناہی کی طالب ہوتی ہے یہ اس کی فطرت ہے۔ نسرین کی زندگی کے دو مردوں میں سے ایک نصیر تھا اور دوسرا سیٹھ۔ نصیر جس کی محبت دل سے نکالے نہ نکلتی تھی، اس کی زندگی سے اس طرح غائب ہوا تھا جیسے جلتے توے سے ٹھنڈے پانی کی بوند۔ اب جو کچھ سہارا تھا وہ سیٹھ کا تھا۔ اس لئے وہ اس رسی کو مضبوط پکڑے تھی۔ اگر یہ بھی ہاتھ سے چھوٹی تو نہ جانے وہ کس کھڈ میں جا کر گر پڑے — اس لئے وہ نصیر کی برائی خاموشی سے سنتی رہی اور بیٹے کے دل میں باپ کی طرف سے حقارت و نفرت کے بیج کو سرسبز ہوتے، پودے سے درخت بنتے اور اس میں شاخیں اور پھول نکلتے دیکھتی رہی۔ بے بس عورت! شوہر سزا دے چکا تھا۔ اب اپنا ہی باپ، اپنا ہی بیٹا، اس کے "چست" وکیل بن کر اسے سزا دے رہے تھے۔

سیٹھ کے انتقال کے بعد جب اکیسویں سال منیر نے نانا کے کارخانے اور ان کی دولت پر مالکانہ تصرف شروع کیا تو نسرین کو زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ وہ دل میں اسی پر کڑھتی رہی کہ منیر اس سے بھی زیادہ جائداد اور دولت کا صحیح طور پر حقدار ہونے کے باوجود اس کا دعویدار بننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ اپنے وجود میں باپ کی شرکت نہ چاہتا تھا۔ گویا وہ بن باپ ہی کے پیدا ہو گیا تھا۔ نسرین نے دو ایک بار بیٹے کے دل سے باپ کی نفرت نکالنے کی کوشش کی، لیکن اس پر تو نصیر کے تذکرے ہی سے جیسے بھوت سا سوار ہو جاتا تھا۔ اب کے البتہ جب وہ بیمار ہوئی اور اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا تو اس نے بیٹے کا دل باپ کی طرف سے نرم کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کی تھی۔ اسے بے کم و کاست سچے سچے واقعات سنا دئے تھے۔ اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ اسی شرابی کی یاد تھی جس نے سیٹھ کے اصرار کے باوجود اسے دوسرے نکاح پر آمادہ نہ ہونے دیا۔ ماں کی زبان سے چند مہینوں کی خوشی و غم سے بھرپور زندگی کا حال سن کر منیر کے ہاں تھوڑی دیر کے لئے ایک غیر شعوری نرمی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اب چودہ برس کے لڑکے کی جگہ تیئس برس کا تعلیم یافتہ جوان تھا، وہ انسانی کمزوریوں سے واقف ہو گیا تھا اور اس میں ایک طرح کی رواداری سی آ گئی تھی۔ پھر بھی باپ سے نفرت نانا نے اس کے خمیر میں ڈال دی تھی۔ اسے اس نفرت سے محبت تھی۔ پہلی ہی کوشش میں اس نفرت کا دل سے نکل جانا آسان نہ تھا اس لئے گو ماں کی خاطر باہری سطح ٹھنڈی پڑ گئی تھی مگر ہانڈی کے اندر وہی 'کھولن' باقی رہی جو سیٹھ جی کے زمانے میں تھی۔

نسرین بمبئی سے صحت یاب ہو کر اپنے مخصوص 'ماہر قلبی علاج' کو دکھانے دلی آئی تھی۔ آج وہ اس کے سینی ٹوریم سے بالکل ہی تندرست ہو کر نکلی تھی اور ہوائی جہاز سے بمبئی واپس جا رہی تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ایسے موقع پر اگر نصیر آ جاتا تو باپ بیٹے میں بہ آسانی وہ صلح کرا دیتی۔ اور شاید اس کی اجاڑ زندگی پھر سے آباد ہو جاتی۔ اس نے نئی تعلیم یافتہ ہونے پر بھی سیٹھ جی کی خاطر سے برقعہ نہ چھوڑا تھا۔ اس لئے گو اس نے نصیر کو پہچان لیا، لیکن وہ اسے پہچان نہ سکا۔ نقاب نے اس چہرے پر پردہ ڈال رکھا تھا جس کی تصویر دل کے پردوں پر کھنچی ہوئی تھی۔ نصیر نے اسباب تو قلی کے حوالے کیا اور خود اپنی نشست کے لئے جگہ ڈھونڈنے لگا۔ سبھی صوفے اور کرسیاں بھری تھیں۔ صرف برقعہ پوش نسرین کی بغل میں ایک کرسی خالی دکھائی دی۔ وہ اس پر ایک تھکے ہوئے مسافر جیسی لمبی سانس لے کر بیٹھ گیا۔

وہ آج ہی صبح کلکتہ سے دلی آیا تھا۔ دن بھر اس نے نئے بھارت کی نئی راجدھانی کے دیکھنے میں اپنا وقت صرف کیا تھا۔ چوبیس برس پہلے کی دلی پہچانی نہ جاتی تھی۔ وطن کے یوسف 'جواہر لال نہرو' نے اس زلیخا کو پھر سے جوانی بخش دی تھی۔ بڑھاپے کے جو آثار کہیں کہیں باقی رہ گئے تھے وہ اس کے نکھار کو بڑھاتے تھے۔ انھیں میں وہ قطب مینار بھی تھا جسے اس نے آخری بار

نسرین کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس سیر سے ایک خاص یاد وابستہ تھی جو نسرین کی کمزوری کی صورت میں ظاہر ہو کر اس کے لئے بہت ہی شیریں بن گئی تھی۔ وہ نصیر کے ساتھ ہنستی بولتی قطب کے سب سے اونچے حصے تک چڑھ گئی تھی۔ لیکن جیسے ہی اس نے وہاں سے جھانک کر نیچے دیکھا تھا وہ کانپنے لگی تھی۔ خوف نے اس میں اس بلا کی کمزوری پیدا کر دی تھی کہ وہ تقریباً سات بار مختلف جگہوں پر رُکتی ہوئی نصیر کے سہارے سے نیچے اُتری تھی۔ نصیر نے اس وقت بار بار یہی سوچا تھا کہ قطب مینار کو باقاعدہ تفریح و سیرگاہ بنانے کے لئے اس میں اسی طرح کی لفٹ کیوں نہ لگا دی جائے اور اسی طرح رسٹوران کیوں نہ کھول دیا جائے جیسا کہ پیرس کی آئیفل مینار میں ہے۔ اگر سرکار اس خرچ کے لئے تیار نہ ہو تو ایک پرائیویٹ کمپنی کے ذریعہ یہ ضروری کام کیوں نہ انجام دے دیا جائے۔ لیکن پونا پہنچتے ہی اس کے "ٹرسٹ" ہونے نے زندگی ہی تہ و بالا کر دی تھی۔

وہ انھیں خیالات میں ڈوبا برقعہ پوش نسرین کی بغل میں آ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اسے اس مخصوص سنٹ کی خوشبو محسوس ہوئی جو نسرین کا دل پسند تھا۔ اس نے گھبرا کر نسرین کی طرف دیکھا۔ برقعہ میں لپٹی ایک سکڑی سکڑائی خاتون نظر آئی۔ وہ اپنے خیالات و جذبات سے پریشان ہو کر کرسی سے اُٹھ کر لوبخ کو میدان سے جدا کرنے والی ریلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور مختلف طرح کی یادوں میں کھو گیا۔

نسرین کے دل میں تیکھے لگے تھے۔ جب نصیر بغل میں آ کر بیٹھا تھا تو وہ کانپنے لگی تھی۔ اب جب کہ نصیر اُٹھ کر ریلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر نصیر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور اس سے گفتگو کا بہانہ ڈھونڈنے لگی۔ نصیر جو ستاروں سے آنکھیں لڑائے ان کی متحرک چمک میں نسرین کی آنکھوں کے ڈبڈبائے آنسو دیکھ رہا تھا، پھر اسی محبوب خوشبو سے چونکا۔ اس نے پلٹ کر برقعہ پوش کو دیکھا۔ نسرین نے کانپتے ہاتھوں سے نقاب الٹ دی۔ وہی پیارا چہرہ، مگر چوبیس سال کا غم زدہ، وہی غزالی آنکھیں مگر مستی کی جگہ درد بھرے دو کٹورے، وہی برگِ گل ہونٹ مگر اب خزاں دیدہ مُرجھائی ہوئی پنکھڑیاں۔

نصیر کے جسم میں زلزلہ سا آ گیا۔ بوٹی بوٹی کانپی۔ مشکل سے منہ سے آواز نکلی "نسرین!"

اس نے گھٹی آواز میں جواب دیا "ہاں، وہی تمھاری لونڈی!"

نصیر بہ مشکل اپنے کو قابو میں رکھ سکا۔ اس نے ریلنگ دونوں ہاتھوں سے زور سے پکڑ لی، اور میدان کی طرف رُخ کر کے کہا "بس یہی ایک آرزو تھی کہ تم سے ایک بار معافی مانگنے کا موقع مل جائے۔ اسی امید میں آج بمبئی جا رہا تھا اسی کا اقرار کرنے چوبیس برس بعد وطن آیا ہوں کہ میں نے تمھیں دھوکا دیا، اپنی شراب نوشی چھپائی اور نشے کی حالت میں تم پر بڑے بڑے ظلم کئے۔ میں نے اپنے جرموں کی پاداش میں اپنے کو خود کافی سزا دی ہے۔ ہندوستان سے جاتے ہی چھ مہینے آسٹریا کے ایک کلنک میں پڑا رہا۔ شراب کی لت پر فتح پا کر ہی وہاں سے نکلا۔ اس رات کے بعد سے آج تک ایک بوند حلق سے نہیں اتاری۔ کتنا دکھ ہوتا ہے ان نشوں کے چھوڑنے میں اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ لیکن میں نے ان تکلیفوں کو اپنے جرم کی سزا سمجھ کر مردانہ وار برداشت کیا۔ پھر بھی زندگی بے کار سی معلوم ہوئی۔ میں فوج میں بھرتی ہو گیا۔ نہ جانے کتنی بار گولیوں کی بوچھار سے گزرا۔ سوائے ٹانگ ٹوٹنے کے حسب خواہش سزا نہ ملی۔ سچ ہے موت کا وقت معین ہے!..."

نسرین نے اس کے ہاتھ کو اپنے نازک ہاتھ سے تھپک تھپک کر کہا "شراب ترک کرنے کے بعد کاش تم نے مجھے اطلاع دے دی ہوتی! پھر ہماری زندگیاں اس طرح اُجاڑ نہ گزرتیں!"

نصیر نے تعجب سے پوچھا "کیا تمھیں مجھ سے نفرت نہیں؟"

اس نے نظریں نیچی کرکے کہا "محبت میں نفرت کی گنجائش نہیں!"

نصیر نے اسے اور بھی گھبرا کر دیکھا "ارے کیا سیٹھ جی نے تمھاری دوسری شادی نہیں کر دی؟"

نسرین نے غرور سے سر اونچا کرکے کہا۔ "انھوں نے شروع میں تو زور دیا، مگر جب ہمارا منیر پیدا ہو گیا تو پھر ہم دونوں اسی کی خدمت و پرورش میں لگ گئے۔"

اس نے کانپتے ہونٹوں سے پوچھا "یہ منیر کون ہے؟"

وہ آہستہ سے بولی "تمھارا بیٹا! وہ تین مہینے کا پیٹ میں تھا جب میں گھر سے نکالی گئی۔"

نصیر نے "اُف اُف!" کہہ کر اپنے ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ "ارے میرا بیٹا تمھاری امانت میں اور مجھے کچھ خبر نہیں۔ مجھ سے یہ بات چھپا کر سیٹھ جی نے مجھ کو سب سے بڑی سزا دی!"

نسرین نے کہا "انھیں یقین تھا تم اسے ان سے چھین لے جاؤ گے اور اپنا ہی جیسا بنا دو گے۔"

وہ بولا۔ "غلط نہ تھا ان کا یہ اندیشہ! مگر یہی بچہ شاید میری زندگی یوں برباد ہونے سے بچا لیتا۔ وارث کے نہ ہونے سے ہر مرد حد درجہ بے پروا ہو جاتا ہے۔ نہ کسی پر اس کی ذمہ داری اور نہ اس پر کسی کی ذمہ داری۔ مجھے ہر وقت محسوس ہوتا رہا کہ میں ایک بے سود سی زندگی بسر کر رہا ہوں.... مگر اپنا بیٹا، اپنا وارث! ......" اور وہ بڑی بے چینی سے پوچھنے لگا۔ "اب تو وہ جوان ہو گیا ہوگا؟ شکل صورت کیسی ہے؟"

وہ مسکرا کر بولی "ہو بہو باپ کی جوانی کی تصویر!"

وہ آب دیدہ ہو کر بولا "خدا نہ کرے کہ باپ جیسی سیرت بھی ہو!"

وہ فخر سے سر اٹھا کر بولی "کون کہہ سکتا ہے اس کے باپ کی سیرت کو برا؟"

اتنے میں ہوائی جہاز کے چھوٹنے کا اعلان ہوا۔ اندر جانے کے لئے پھاٹک کھول دیا گیا۔ دونوں جہاز میں پاس پاس کی سیٹوں پر بیٹھے۔ گلے شکوے بھی ہوئے اور میٹھی میٹھی پیار کی باتیں بھی۔ کئی گھنٹے کا راستہ آنکھ جھپکاتے میں کٹ گیا۔ آپس میں طے ہو گیا کہ وہ ہفتہ عشرہ بمبئی میں ضرور ٹھہرے گا اور بیٹے کو اپنے سے مانوس کرنے کی آہستہ آہستہ کوشش کرے گا۔ پھر نسرین کسی مناسب موقع پر باپ بیٹے میں میل کرا دے گی۔

سینٹا کروز میں وہ اترے تو منیر ماں کو لینے نہ آیا تھا۔ گاڑی لئے غفور ڈرائیور موجود تھا۔ وہ سیٹھ جی کا پرانا ملازم تھا اور نصیر کو بھی پہچانتا تھا۔ اس نے جو "دولھا میاں" کو "بٹیا" کے ساتھ دیکھا تو باغ باغ ہو گیا۔ نسرین نے اس سے پوچھا "منیر کیوں نہیں آیا؟"

وہ کچھ سٹ پٹا کر بولا "کسی دعوت میں گئے ہیں۔ مجھے حکم دیا کہ میں جا کر آپ کو لے آؤں۔" اس نے نسرین کا اسباب ڈکی میں رکھوایا پھر نسرین کے خاموش اشارے پر نصیر کا اسباب بھی وہیں رکھوا دیا۔ نصیر نے ہوٹل میں قیام کا نام لیا اور موٹر میں سوار ہونے سے عذر کرنا چاہا تو نسرین بولی "کوٹھی میرے ہی نام ہے۔ اب وہ میرا گھر ہے یا تمھارے بیٹے کا۔ ہمارے گھر میں ٹھہرنے میں عذر کا کون سا پہلو ہے؟" اسے خاموش ہو کر نسرین کے ساتھ بیٹھ جانا ہی پڑا۔ اس کا دل خود بھی تو یہی چاہتا تھا!

موٹر اسی جانی پہچانی سہ منزلہ عمارت کے سامنے پورٹیکو میں رکی جہاں آتے جاتے، سیٹھ جی کی موجودگی میں بھی، اسے ہمیشہ مسرت ہوتی تھی۔ نئی نئی قلعی اور مرمت ہوئی تھی اور اس کے پرانے پن میں ایک خاص طرح کا حسن تھا۔ نسرین اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ دروازے کے بالکل مقابل ہی سیٹھ جی کی قدِ آدم تصویر لگی تھی۔ نصیر کو محسوس ہوا جیسے سیٹھ جی کھڑے اسے بڑی نفرت اور حقارت سے دیکھ رہے ہیں۔ جیسے تصویر کے بے جان لب ہل رہے ہیں اور ان سے آواز آ رہی ہے "بے شرم، بے غیرت شرابی! تو پھر اس گھر میں اسے برباد

کرنے آیا!" ۔ اور نصیر دروازے ہی پر ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

نسرین اپنے غیرت دار شوہر کی رگ رگ سے واقف تھی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچتی ہوئی بولی — "اندر آؤ! اب ڈیڈی ہمارے درمیان نہیں آ سکتے!"

نصیر پشت کی جانب جو کھڑکی تھی وہاں جا کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر ایک چھوٹا سا چمن تھا اس میں چھٹکی چاندنی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس چمن کی بہاریں اس نے کئی بار نسرین کے ساتھ لوٹی تھیں اور ان کی آپس کی چھیڑ چھاڑ پر وہاں کے اکثر پھول مسکرائے اور ہنسے تھے۔ شیریں یادوں کا یہ سلسلہ غفور کے دروازہ کھولنے اور اندر جھانکنے نے توڑا۔ اس نے پوچھا "بٹیا" دولہا میاں کا سوٹ کیس کس کمرے میں رکھ دوں؟"

نسرین نے کچھ شرما کر، کچھ سٹپٹا کر کہا — "مہمان والے کمرے میں!"

جب غفور دروازہ بھیڑ کر چلا گیا تو وہ نصیر سے اپنی صفائی میں بولی "میں چاہتی ہوں کہ منیر تم سے آہستہ آہستہ ہل مل جائے تو اسے تمہارا نام بتاؤں......

نصیر نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "ہاں نہ جانے کتنا بس سیٹھ جی نے اس کے دل میں میری طرف سے بھر دیا ہوگا۔ ...... مگر اپنے لئے کوئی نیا نام بھی سوچ لینا پڑے گا!....."

وہ بڑی تلخی سے مسکرایا۔

اتنے میں ایک موٹر زور زور سے ہارن دیتی پورٹیکو کی طرف بڑھتی سنائی دی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے دو موٹروں میں ہلکی سی ٹکر ہوئی اور شیشوں کے ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی اور غفور کی ہلکی سی چیخ۔

نسرین "ارے کیا ہوا؟" کہتی کمرے کے باہر لپکی۔ نصیر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ منیر ٹکر مارنے والی موٹر سے دھاڑتا ہوا نکلا — "یو ڈیم فول! ام ہارن پر ہارن بجاتا ہے۔ تم ہمارا راستہ کیوں نہیں دیتا!"

غفور جو دونوں موٹروں کے درمیان کچھ دبا سا کھڑا تھا۔ بولا "بھیا میں ڈکی سے بٹیا اور دولہا میاں کے اسباب اُتار رہا تھا، میں موٹر کیسے ہٹاتا؟"

منیر بولا "بٹیا، بٹیا، بٹیا، او، ام سمجھا، آپا!"

نسرین نے قریب آ کر پوچھا۔ "ارے کیا ہوا غفور؟"

منیر اس کی طرف لڑکھڑاتا ہوا بڑھا "تم آ گیا آپا! امارا پیارا آپا!"

لیکن جیسے ہی وہ نسرین کے قریب آیا، وہ غصہ سے بھڑک کر بولی "ارے تو نے شراب پی ہے! تھُو! بے غیرت! بے شرم! تھو! تھو......"

وہ ہنس کر بولا۔ "بہت نہیں پی آپا! بس تمہاری صحت کے..... تین جام! ڈیر آپا! ڈارلنگ آپا!"

نسرین مُنہ پر رومال رکھ کر اُبکائی لیتی ہوئی بولی۔ "ارے باپ کی وراثت مل گئی تجھ کو! ہائے اللہ! باپ کا خون رنگ لا کر ہی رہا!"

اور وہ "او، او" تھو تھو کرتی قریب ترین باتھ روم کی طرف بھاگی۔

شراب کے نشے نے منیر کے سچے جذبات زبان سے کہلوا دئے۔ وہ ماں کے پیچھے لپکتا ہوا بولا "میرے شودر باپ کا نام تم نے کیوں لیا آپا؟ اُس کی وراثت! اس شودر کا خون نہیں —! ہرگز نہیں! آثر تو ہر مہذب ... نوجوان ... تھوڑی بہت پیتا ہے! یہ تہذیب کا ورثہ!"

اور دفعتہً اس نے باتھ روم کے قریب رکھے ہوئے گملوں میں سے ایک سے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بھل آ رہا۔

غفور اپنی چوٹ بھول کر اُسے اٹھانے دوڑا، مگر نسرین نے باتھ روم کا دروازہ دھڑاکے سے بند کر لیا۔ اور نصیر رومال سے چہرہ پونچھتا ہوا سب کی نظریں بچا کر تیزی سے کوٹھی کے باہر نکل گیا۔

(نام اور مقام فرضی ہیں)

ٹوپیاں اور ڈاکٹر

گوئل صاحب لکھنؤ میں بھارت ٹائمز (دہلی کلکتہ) کے مقامی نامہ نگار تھے۔ حلقۂ احباب میں وہ خاصے شوقین مزاج مشہور تھے — دوستوں نے انھیں اسکول میں صافہ باندھنے اور کالج میں ننگے سر پر گھنگھریالے بالوں کی لٹوں کو بار بار جھٹکاتے، چھیلا بنے گھومتے بھی دیکھا تھا اور تحریکِ آزادی میں دودھیا کھادی کے لباس پر ٹیڑھی گاندھی ٹوپی سجائے بھی۔ بعد میں وہ سیاہ شیروانی اور ٹوپی میں بھی ملبوس نظر آئے تھے اور سوٹ ہیٹ سے مزین بھی۔ چند سال قبل اخبار نویسوں کے ایک وفد میں وہ روس گئے تو وہاں سے ایک خوب صورت مخملی ہیٹ لے آئے۔ دو سال تک ڈیڑھ سو روبل کے اس قیمتی ہیٹ کا رعب وہ دوستوں پر غالب کرتے پھرے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ کابل گئے تو وہاں سے قراقلی خرید لائے اور دو تین سال وہی احباب سے خراجِ تحسین حاصل کرتی رہی۔ اس کا جادو اترا تو گوئل صاحب کشمیر سے چار پانچ کشتی نما ٹوپیاں لے آئے ...... ان نت نئی ٹوپیوں اور انھیں کے مطابق لباس کی تبدیلیوں کے باعث وہ خاصے خوش پوشش اور شوقین مزاج کہلاتے تھے۔ یہ کوئی نہ جانتا تھا کہ ان کی اس خوش پوشی کی تہہ میں کیسی مجبوری پنہاں ہے۔

بات دراصل یہ تھی کہ ان کا سر بے حد حساس تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ کبھی ٹوپی نہ پہنتے۔ ان کے بال اتنے خوب صورت، سیاہ اور گھنگھریالے تھے کہ ان پر کوئی ٹوپی پہننا انھیں خاصا ناگوار ہوتا تھا۔ مگر سر کی اس کمزوری کے ہاتھوں وہ بری طرح مجبور تھے۔ ذرا سی بھی سردی ہوتی اور سر ننگا رہ جاتا تو انھیں زکام ہو جاتا تھا ...... اپنی اس کمزوری کو انھوں نے شوق کے پردے میں چھپا دیا تھا۔ کالج کے بعد کے ایک دو سال انھوں نے ننگے سر گزارے ہوں تو دوسری بات ہے۔ لیکن بعد میں تو انھوں نے ہمیشہ ٹوپی کو اپنا سرپرست بنا لیا تھا۔ روس سے وہ جو ہیٹ لائے تھے وہ انھیں اتنا پسند تھا کہ اگر ان کا بس چلتا تو اسے تا زندگی پہنتے۔ لیکن ہیٹ کے ساتھ یہ مصیبت تھی کہ مجلسوں یا دعوتوں میں اسے سر پر نہیں پہنا جا سکتا تھا اور ننگے سر بیٹھنے کا مطلب تھا ہفتوں زکام سے پریشان رہنا۔ قراقلی میں یہ دقت تھی کہ سردی میں تو خوب کام دیتی لیکن گلابی جاڑوں میں اسے پہننا مشکل ہو جاتا۔ بے حد گرم تھی۔ سردی کے باوجود سر پسینے سے تر ہو جاتا۔ ٹوپی اتارتے تو چھینکیں آنے لگتیں۔ کشمیر کے سفر نے ان کی یہ مشکل آسان کر دی تھی۔ وہاں کشتی نما ٹوپیاں پانچ سے پچاس روپے تک کی تھیں۔ گلابی جاڑوں کی بات تو دور رہی، وہاں تو ایسی ٹوپیاں بھی تھیں جو گرمیوں میں بھی پہنی جا سکتی تھیں۔ چناں چہ وہ ہر قسم کی کم گرم، درمیانی، خوب گرم .... سفید، سیاہ، بھوری، چتکبری مختلف النوع ٹوپیاں خرید لائے تھے۔ جس سوٹ کے ساتھ جو میچ کرتی وہی پہن لیتے۔ احباب ان کے سوٹ یا ٹوپی کی تعریف کرتے تو گوئل صاحب مسکرا کر شکریے کا اظہار کرتے۔ لیکن کبھی کبھی اندر ہی اندر ان کا دل بے حد

اداس ہو جاتا۔ یہ احساس کہ ٹوپی کے بغیر ان کا کام ہی نہیں چل سکتا۔ ان کی زندہ دلی کو افسردگی سے بدل دیتا۔ وہ شام کو حضرت گنج کی سیر کو جاتے اور دیکھتے کہ سخت سردی میں بھی لوگ نہ صرف ننگے سر پیدل گھومتے ہیں بلکہ سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں پر اڑتے پھرتے ہیں تو ان کا جی چاہتا کہ ٹوپی کو اتار کر سڑک پر پھینک دیں اور کسی کو اٹھانے نہ دیں اور آتے موٹروں، سائیکلوں اور تانگوں کے نیچے کچلتے اور تار تار ہوتے دیکھ کر خوش ہوں۔ لیکن ادھر جب سے انھوں نے عمر کے اکتالیسویں سال میں قدم رکھا تھا، انھیں ٹوپی کے نیچے مفلر تک لپیٹنے کی ضرورت پڑنے لگی تھی۔ موٹر سائیکل چلاتے وقت کانوں کو سرد ہوا لگتی تو ناک سے پانی بہنے لگتا۔ وہ موٹر سائیکل روک کر گلے کا مفلر سر کے اوپر سے کانوں پر لپیٹ کر گلے میں باندھ لیتے۔ پھر ٹوپی سر پر جماتے اور جب آگے بڑھتے

ادھر ان کی افسردگی میں اضافہ کرنے کا ایک اور سبب پیدا ہو گیا تھا۔ پچھلے سال سے لکھنؤ کی نمائش میں کشمیر سے آنے والے دوکاندار ڈھیروں کشتی نما ٹوپیاں لانے لگے تھے۔ اور گوئل صاحب کی تقلید میں ان کے تقریباً تمام دوستوں نے اتنی گراں نہ ہی سستی ہی، مگر ویسی ہی کشتی نما ٹوپیاں پہننی شروع کر دی تھیں اور ان کی اپنی امتیازی شان ختم ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اب کوئی ان کی ٹوپی کی تعریف ہی نہ کرتا تھا۔

انھیں دنوں بسنت آ گیا۔ گوئل صاحب پنجابی تھے اور اگرچہ ان کے گھر کے لوگوں نے پگڑی کا استعمال ترک کر دیا تھا لیکن ان کے والد محترم اب بھی پگڑی ہی باندھتے تھے اور ستر سال عمر ہونے کے باوجود بسنت کے روز اُسے بسنتی رنگ میں رنگا لیتے تھے۔ اس بار جب گوئل صاحب نے اپنے والد کو پگڑی رنگواتے دیکھا تو خدا جانے ان کے دل میں کیا آئی کہ انھوں نے عمدہ ململ کی پگڑی منگائی، اسے بسنتی رنگایا۔ سر پر نہایت نفاست سے سجایا اور بسنت کے روز سارا دن موٹر سائیکل پر پگڑی کا شملہ ہوا میں لہراتے گھومتے رہے۔ جب احباب نے ان کی پگڑی کی خوب تعریف کی اور کہا کہ تمام ٹوپیوں کے مقابلے میں پگڑی ان پر زیادہ کھلتی ہے اور جاننا چاہا کہ پہلے انھوں نے پگڑی کیوں نہیں باندھی تو گوئل صاحب کے دماغ کی تمام تر افسردگی یک لخت کافور ہو گئی اور انھوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ہمیشہ پگڑی ہی باندھا کریں گے۔ چوک میں وہ ایک دوست سے ملنے گئے تو لگے ہاتھوں ایک رنگریز سے بھی بات کر آئے کہ وہ اسے تین چار پگڑیاں لا دیں گے اور وہ انھیں ایک ہی دن میں رنگ کر دے دے۔ اپنے جوش میں انھوں نے رنگ بھی طے کر لئے۔ فاختئی، گہرا خاکستری، موتیا اور ہلکا جوگیا۔

لیکن چار بجے کے قریب ان کے سر میں سخت درد ہونے لگا۔ مدتوں سے انھوں نے پگڑی نہیں باندھی تھی۔ لمبے لمبے بال صفائی سے پگڑی باندھنے کے بعد بری طرح بھنچ گئے تھے۔ وہ کافی ہاؤس میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے جب انھیں محسوس ہوا کہ وہ کوئی دوا نہیں لیں گے تو ان کے لئے وہاں بیٹھنا مشکل ہو جائے گا اور انھوں نے ارگا پائرین کی ایک گولی منگا کر کافی کے ساتھ نگل لی۔ لیکن بجائے کم ہونے کے درد میں اضافہ ہو گیا ساتھ ہی جی بھی متلانے لگا۔ آخر احباب سے اجازت لے کر وہ گھر آ گئے۔

باہر ہی سے انھیں معلوم ہو گیا کہ ان کی بیوی پڑوسنوں کے ساتھ گومتی پر بسنت منانے گئی ہوئی ہے۔ وہ دندناتے ہوئے اپنے کمرے میں گئے۔ پگڑی اتار کر انھوں نے پلنگ پر زور سے پٹک دی۔ آئینے میں شکل دیکھی تو انھیں پگڑی کے پیچوں میں کسی ہوئی بالوں کی گنجلک۔ جوڑے کی سی سر پہ بنی نظر آئی۔ آنکھیں بھنچی، ماتھے کی نسیں تنی ہوئی اور چہرے پر غیر معمولی اضمحلال! وہ باتھ روم گئے۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، گیلے ہاتھ بالوں پر پھیر کر انھیں سنوارا۔ پھر باہر آ کر انھوں نے الماری سے ایک رومال نکالا۔ اُسے تہہ کر کے اس کی پٹی ماتھے پر باندھی۔ پلنگ پوش کو پگڑی سمیت برابر کے پلنگ پر الٹ دیا اور [illegible] بغیر لحاف میں دبک گئے۔

اگرچہ انھوں نے رومال کی گانٹھ عین کنپٹی پر دی تھی مگر سر کے

درد کو ذرا بھی آرام نہ ہوا تھا۔ ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک — کوئی کنپٹی پہ مسلسل ہتھوڑے سے مار رہا تھا۔ ان کا جی بُری طرح گھٹا جا رہا تھا انھوں نے اُٹھ کر پانی کا ایک گلاس پیا اور پھر بستر پہ دراز ہو گئے۔

کچھ دیر بعد انھیں بڑی گرمی محسوس ہونے لگی چنانچہ وہیں بستر میں لیٹے لیٹے پتلون اُتار دی اور اُسے بھی ساتھ کے پلنگ پر بسنتی پگڑی اور پلنگ پوش کے اوپر پھینک دیا۔ جی میں آئی کہ نائٹ سوٹ پہن لیں لیکن انڈرویر پہنے ہوئے ہی لیٹے رہے۔

لیکن انھیں اب بھی آرام نہ ملا۔ سامنے دروازے پر لگے ہوئے پردے کے ایک سرے سے غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں آنکھوں پہ پڑ رہی تھیں۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہی کرنیں کنپٹیوں پہ ہتھوڑے چلا رہی ہیں۔ مگر ان میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ اٹھ کر پردہ ٹھیک کر سکیں۔ انھوں نے کروٹ بدل لی اور دیوار کی طرف منھ کر کے آہستہ آہستہ کراہنے لگے۔

"ارے کیا بات ہے؟"

ان کی بیوی کمرے کی چوکھٹ ہی سے شوہر کو یوں لیٹے اور کراہتے دیکھ کر چلا اٹھیں۔

گوئل صاحب نے کروٹ نہیں بدلی۔ ویسے ہی لیٹے کراہتے رہے۔

مسز گوئل نے عمدہ سلک کی بسنتی ساڑی اور اسی رنگ کا ریشمی بلاؤز پہن رکھا تھا۔ کندھوں پر اورنگ آبادی پیلی شال ڈال رکھی تھی جس پر ریشم کا بہت خوب صورت کام تھا۔ جوڑے پر گیندے کے زرد پھولوں کا گجرا تھا۔ مسلسل بیماری کے باعث زرد نظر آنے والا ان کا چہرہ بسنتی ساڑی کے باوجود (جس کا عکس زرد چہرے کو اور بھی زرد بنا دیتا ہے) تیوہار کی خوشی سے یا باہر دھوپ میں چلنے کے باعث تمتمایا ہوا تھا۔ انھوں نے شال ایک طرف پھینک دی اور گوئل صاحب کے سرہانے بیٹھ گئیں۔ شوہر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انھوں نے پھر پوچھا۔ "بات کیا ہے؟"

گوئل صاحب نے کروٹ بدلی۔ "سر میں شدید درد ہے۔ کنپٹیاں پھٹی جا رہی ہیں۔"

"بلاڈونا تیس[۳] کی چار گولیاں کھا لیجیے۔"

گوئل صاحب کا جی چاہا زور سے قہقہہ مار کر ہنس دیں لیکن دردِ سر کے باعث محض مسکرا کر رہ گئے۔ بولے۔ "تمھارے بلاڈونا سے کیا ہوگا۔ تین ارگا پائرین کھا چکا ہوں۔"

"اب میں آپ کو کیسے بتاؤں۔" داہنے ہاتھ سے اُن کا ماتھا دباتے ہوئے مسز گوئل بولیں۔ "میں نے خود ڈاکٹر اوستھی کو سخت سے سخت درد کا علاج انھیں گولیوں سے کرتے دیکھا ہے۔"

"ارے تمھارے اس اوستھی کو کچھ آتا بھی ہے۔" گوئل صاحب بیوی کا ہاتھ ہٹا کر انگوٹھے اور درمیانی اُنگلی کی مدد سے دونوں کنپٹیاں ایک ساتھ دبا کر بولے۔ "وہ مریض کی جنم پتری دیکھ کر علاج کرنے والا کلرک ......"

"لیکن مجھے تو آرام ہے۔"

"تمھیں ہر نیا ڈاکٹر بدلنے کے بعد آرام آنے لگتا ہے۔"

"آپ کو تو ہر بات کا مذاق اڑانے کی عادت ہے۔ سارے شہر میں ڈاکٹر اوستھی کی دھوم ہے۔ کیا سب کے سب لوگ بے وقوف ہیں؟"

گوئل صاحب خاموش ہو گئے۔ بیوی سے بحث کرنا انھوں نے فضول سمجھا۔ ان کی بیوی کو آنتوں کی پرانی شکایت تھی۔ شہر کے تقریباً تمام ڈاکٹروں کو وہ آزما چکی تھیں اور سبھی پر ایمان لا چکی تھیں اور ان دنوں ڈاکٹر اوستھی کی قصیدہ خوانی کیا کرتی تھیں۔

ڈاکٹر اوستھی کوئی سند یافتہ ڈاکٹر نہیں تھے۔ سیکرٹریٹ کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں وہ سینیر کلرک تھے۔ مگر کلرکی کے ..... ساتھ ساتھ ہومیو پیتھی کی پریکٹس بھی کرنے لگے تھے اور آہستہ آہستہ ڈاکٹر زیادہ اور کلرک کم رہ گئے تھے۔ خوش رو، خوش طبع، ادب و آرٹ کے دلدادہ۔ ان کی بڑی شہرت تھی۔ ان کا کام دفتر کے کلرک نمٹا دیتے اور اوستھی جی دفتر میں بیٹھے ہومیو پیتھی کی موٹی

ہومیو پیتھک کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے یا بڑے بڑے افسروں کی خدمت میں پہنچ کر ان کی شکایتیں سنتے اور پڑیاں تقسیم کرتے۔ منسٹروں سے لے کر چپڑاسی تک ان کے مریض تھے۔ یوں ان کی پریکٹس اتنی چل گئی تھی کہ انھیں ملازمت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ لیکن تھے تو کلرک ہی۔ چار یا پانچ سال میں ریٹائر ہونے والے تھے۔ پنشن کا لالچ انھیں دفتر سے باندھے ہوئے تھا۔ سیکریٹیریٹ میں یہ قصہ عام تھا کہ ایک سخت مزاج سپرنٹنڈنٹ نے انھیں ایک بار ڈانٹ دیا تھا کہ اگر وہ دفتر میں دیر سے آئیں گے یا کوئی دوسرا کام کریں گے تو انھیں برخاست کر دیا جائے گا۔ لیکن ایک ماہ بعد ہی خود سپرنٹنڈنٹ کا لڑکا سخت بیمار ہو گیا۔ جب شہر کے تمام ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو وہ اوستھی جی کی خدمت میں پہنچا اور ان کے قدموں پر گر پڑا کہ جس طرح بھی ہو سکے میرے لڑکے کو بچائیے۔ اوستھی جی نے چار پڑیوں میں ہی اسے بھلا چنگا کر دیا۔

مسز گوئل بڑے جوش سے اس قصہ کا بکھان کیا کرتیں۔

"وہ دن سو آج کا دن" قصہ سنا کر وہ کہتیں۔ "سپرنٹنڈنٹ تو دور رہا سیکرٹری یا منسٹر تک کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ انھیں دو لفظ کہے۔"

ان دنوں مسز گوئل اپنے واقف کاروں کو ہر بیماری میں ڈاکٹر اوستھی سے مشورہ لینے کی رائے دیتیں اور ایلوپیتھی کے مقابلے میں ہومیوپیتھی کے گن گاتیں۔ "ہومیوپیتھی تو بہن جی (یا بھراجی) تیر کی طرح نشانے پر لگتی ہے۔" وہ کہتیں "جن بیماریوں کو بڑے بڑے سرجن بھی ٹھیک نہیں کر پاتے انھیں ہومیوپیتھی کی یہ سرسوں برابر گولیاں دنوں میں ہی ٹھیک کر دیتی ہیں۔" اور وہ بتاتیں کہ کس طرح ڈاکٹر اوستھی نے ان کی ایک سہیلی کے رحم کی رسولی ایک ہی بار کی دوا سے ٹھیک کر دی تھی۔ بچے کی پیدائش کے بعد اس کی ناف کے نیچے بھاری پن رہنے لگا تھا۔ جب رکشا کے دھچکے سے بھی درد ہونے لگا تو اس کا شوہر اسے اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "رسولی ہے۔ اپریشن کرنا پڑے گا۔ سردیوں میں آ جائیے۔" اپریشن کے نام ہی سے ان کی سہیلی کی جان نکل گئی۔ اسی دوران میں کسی نے اوستھی جی کا پتہ بتا دیا۔ انھوں نے دوا کی چار خوراکیں دیں۔ مسز گوئل کی سہیلی چونکہ پیلس رہتی اور اوستھی جی پارک روڈ پر۔ وہ دوا تو اس نے کھا لی لیکن پھر نہیں گئی۔ اس کے شوہر کچھ شکی تھے۔ دسمبر شروع ہوتے ہی وہ اسے اسپتال لے گئے کہ اگر آپریشن کرانا ہو تو مقررہ وقت سے بک کرا لیا جائے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور وہ حیران ہو کر بولی۔ "اٹ از ناٹ دیر۔ اٹ ہیز کمپلیٹلی وینشڈ۔"

اور مسز گوئل اپنی مہین آواز اور کانونٹ زدہ لہجے میں اسی جملے کو دوبارہ الٹ کر کہتیں۔ "سچ! ڈاکٹر نے کہا۔ اٹ ہیز کمپلیٹلی وینشڈ۔ اٹ از ناٹ دیر (رسولی بالکل غائب ہو گئی ہے۔ اس کا کہیں پتہ نہیں ہے)"

وہیں لیٹے لیٹے گوئل صاحب کے دماغ میں اپنی بیوی کی ساری باتیں گھوم گئیں۔ درد سر کے باوجود ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کچھ لمحوں کے بعد انھوں نے کہا۔ "تم مجھے ایسپرو کی دو ٹکیہ دے دو۔"

"ایسپرو تو گھر میں نہیں ہے۔" مسز گوئل نے کہا۔ "میں ڈاکٹر اوستھی کو فون کر کے پوچھتی ہوں کہ وہ کیا کہتے ہیں؟"

اور اس سے قبل کہ وہ انھیں روکیں، مسز گوئل دفتر میں گئیں انھوں نے ڈاکٹر اوستھی کو فون کیا اور آ کر بولیں۔ "میں نے کہا تھا نا کہ بلاڈونا ۳۰ کی چار گولیاں کھا لیجیے۔ اوستھی جی نے بھی یہی کہا ہے۔"

"تم ذرا ڈاکٹر چیٹرجی کو فون کر لیتیں۔" گوئل صاحب نے اپنے محبوب ایلوپیتھ کا نام لیا، جسے ان کی بیوی کب کا چھوڑ چکی تھیں۔

"فون پر بھی انھوں نے دوا بتائی ہے۔" مسز گوئل کھسیانی ہو کر بولیں۔ "جو اب بتائیں گے۔ آپ چاہتے ہیں تو میں فون کر دیتی ہوں۔ آ کر دیکھ جائیں گے۔ لیکن اب فون کروں گی تو ساڑھے نو بجے تشریف لائیں گے۔ نو بجے تو وہ سیوا آشرم ہی سے اٹھتے ہیں۔ آپ میری بات مانیے۔ چار گولیاں میں آپ کو بلاڈونا کی دیتی ہوں۔

نہ آرام آیا تو جس ڈاکٹر کا نام لیجئے گا، بلادوں گی۔"

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، ان کی بیوی انگیٹھی پر پڑی ہوئی ایک چھوٹی سی شیشی اٹھا لائیں۔ اخبار سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر انھوں نے چار گولیاں اس میں گرائیں اور گوئل صاحب سے کہا "منہ کھولئے۔"

گوئل صاحب نے بادل ناخواستہ منہ کھول دیا۔ مٹھاس کے ساتھ ایک ہلکا سا تیکھا پن انھیں زبان پر محسوس ہوا۔ گولیاں شاید دوا سے گیلی تھیں کیونکہ کاغذ پر ایک دو جگہ نشان پڑ گئے تھے۔
آدھ گھنٹے کے بعد گوئل صاحب کے سر کا درد دور ہو گیا۔

دوسرے دن گوئل صاحب وہی پرانی کشتی نما ٹوپی پہنے اپنی بیوی کے لئے دوا لینے ڈاکٹر اوستھی کے ہاں پہنچے تو دوا بناتے ہوئے ڈاکٹر اوستھی نے ان کا حال چال بھی پوچھا کہ اب ان کے سر کا درد کیسا ہے۔ گوئل صاحب نے کہا کہ بلاڈونا لیا تھا جس سے آرام آگیا ہے اور یہ سُن کر ڈاکٹر اوستھی بلاڈونا کے فوائد گنانے لگے۔

وہ ہومیوپیتھی کے معجزے بیان کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ انھوں نے کس کس کا کیسی کیسی خطرناک بیماری میں علاج کیا ہے کہ گوئل صاحب نے اپنے دردِ سر کا سبب بتایا اور بولے "ساری دنیا ننگے سر گھومتی ہے۔ ایک میں ہوں کہ سردیوں کا کیا ذکر گرمیوں تک میں ٹوپی پہننے پر مجبور ہوں۔ آپ میرا علاج کریں تو جانوں۔
وہ کہاوت ہے نا کہ رسّی کی مستقل رگڑ سے پتھر پر بھی نشان پڑ جاتا ہے۔ آخر کار بیوی کی باتوں کا گوئل صاحب پر بھی اثر ہو ہی گیا تھا۔

"ہوں۔" پڑیا بناتے بناتے ڈاکٹر اوستھی نے کہا اور پھر ایک بڑی سی کتاب سامنے رکھ کر اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد بولے۔ "یہ لیجئے مل گئی۔"

اور انھوں نے بلند آواز سے پڑھا۔ "اے پرسن ہو ویرز اے ہیڈ ڈریس ایون ان سمر" اور کتاب بند کر کے ایک شیشی سے گولیاں نکالیں، دوسری شیشی کو ملا کر اس میں سے ایک دو قطرے ان پر ٹپکائے اور بولے۔ "منہ کھولیئے۔"

گوئل صاحب نے منہ کھول دیا۔ ڈاکٹر اوستھی نے پڑیا ان کے منہ میں انڈیل دی اور بولے۔ "لیجئے، بھگوان نے چاہا تو تین دن میں آپ کی ٹوپی اُتر جائے گی۔"

تین دن میں گوئل صاحب کی ٹوپی اتر گئی۔ لیکن انھیں دل میں ایسی گھبراہٹ محسوس ہوئی کہ وہ پھر ڈاکٹر اوستھی کے پاس پہنچے۔ انھوں نے پھر پڑیا بنائی اور ان کا منہ کھلوا کر انڈیل دی۔
جب تین دن تک کچھ آرام نہ آیا، گھبراہٹ بڑھتی گئی، پیشاب پیلا پیلا آنے لگا تو گوئل صاحب نے ڈاکٹر چیٹرجی کے سیوا آشرم کا رُخ کیا۔

وہاں بہت بھیڑ تھی۔ باہر کے بڑے ہال کے عین درمیان جو گول میز اور اس کے گرد گول بنچ متوسط طبقہ کے مہذب اور تعلیم یافتہ مریضوں کے لئے تھی وہ کھچا کھچ بھری تھی۔ دروازہ کے دونوں طرف نچلے طبقے کے مریضوں کے لئے جو بنچیں پڑی تھیں ان پر تل رکھنے کی جگہ نہ تھی بلکہ کچھ عورتیں نیچے فرش پر بیٹھی تھیں۔ گوئل صاحب موٹر سائیکل دروازے کے پاس کھڑی کر کے اندر گئے۔ گول میز پر سے انھوں نے 'ویکلی' کا ایک پرانا پرچہ اُٹھایا اور دائیں طرف کاؤنٹر کے ساتھ کہنی ٹکا کر کھڑے ہو گئے۔ لیکن 'ویکلی' کھول کر بھی وہ اسے پڑھ نہ پائے۔

گوئل صاحب کو ڈاکٹر چیٹرجی کے کلینک کی صفائی، قرینہ اور حسنِ انتظام بہت پسند تھا۔ اگر ناپسند تھی تو یہ بھیڑ۔ پہلے آؤ یا بعد میں، اپنی باری کے لئے ڈیڑھ دو گھنٹہ وہاں ضرور بیٹھنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر چیٹرجی صبح آٹھ بجے سے بارہ بجے تک اور شام کو چھ بجے سے نو بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ باری سے پہلے وہ کسی کو نہ دیکھتے تھے، خواہ کوئی کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو۔ مطب کے وقت وہ کبھی وزٹ پر نہ جاتے۔ اگر کوئی پہلی باری لینے کے لئے وقت سے پہلے وہاں پہنچتا تو اسے ڈاکٹر صاحب کے آنے کے انتظار میں، اور اگر بعد میں پہنچتا تو دوسرے مریضوں کے نمٹ جانے

جانے کے انتظار میں اتنا وقت ضرور بیٹھنا پڑتا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد گوئل صاحب کی باری آئی۔ ڈاکٹر چیٹرجی اپنے چھوٹے سے کمرے میں چھوٹی سی میز کے پیچھے چاق و چوبند بیٹھتے تھے۔ ان کی چھوٹی سی میز پر کتابیں قرینے سے چنی ہوئی تھیں اور چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر وہ بڑی تیزی سے نسخے لکھتے تھے (جنہیں صرف ان کا کمپاؤنڈر ہی پڑھ سکتا تھا) میز کے شیشے کے نیچے مریضوں کی جانب کو انھوں نے تین ہدایتیں ٹائپ کرا کے چسپاں کر رکھی تھیں۔

• کہنیاں میز پر نہ ٹکائیے
• میز پر پڑی کسی چیز کو نہ چھیڑیئے۔
• تھیلے کو میز سے پرے رکھئے

ان کے پیچھے ایک پارٹیشن تھا جس کے دونوں طرف دو دروازے تھے جو دو چھوٹے چھوٹے کمروں کو جاتے تھے ان میں سے ایک متوسط طبقے کے مریضوں کے لئے تھا دوسرا نچلے طبقے والوں کے لئے۔ مریضوں کے نمٹانے میں چیٹرجی کی تیزی دیکھ کر گوئل صاحب محو حیرت ہو جاتے تھے۔ وہ ایک مریض کو دیکھ کر معائنے کے کمرے کے باہر آتے تو نسخہ لکھنے سے پہلے گھنٹی پر ہاتھ مارتے اور اگلے مریض کو دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کر دیتے۔ نسخہ لکھ کر مریض کو دیتے اور دوسرے مریض کو دیکھنے چلے جاتے۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی کمپاؤنڈر دوا اور مریض بھیج دیتا۔ گوئل صاحب کبھی کبھی ڈاکٹر چیٹرجی کی اس تیزی پر حیران ہو کر سوچا کرتے کہ ڈاکٹر دل اپنی میز سے معائنہ کے کمروں میں آنے جانے میں کتنے میل روز چل لیتے ہوں گے۔

کمرے کے اندر جاتے ہی انھوں نے ڈاکٹر چیٹرجی کو نمسکار کیا جو انھوں نے بدستور نسخہ لکھتے ہوئے قبول فرمایا۔

ڈاکٹر کے پیچھے پارٹیشن پر ایک نقلی تلچٹا پن کے سہارے ٹکا تھا، جس کے نیچے دم کو خم کئے ایک چھپکلی لگی تھی۔ پہلی بار جب گوئل صاحب ڈاکٹر چیٹرجی کے کلینک میں آئے تھے تو انھیں دونوں چیزیں بالکل اصلی معلوم ہوئی تھیں اور وہ دیر تک اس بات کا انتظار کرتے رہے تھے کہ کب چھپکلی جھپٹ کر تلچٹے کو اپنے جبڑے میں دبوچ لیتی ہے۔ اگرچہ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ نقلی ہیں، تاہم گوئل صاحب جب وہاں جاتے تھے تو ان کی نظریں ان پر جم جاتی تھیں۔

تلچٹے اور چھپکلی کو دیکھتے دیکھتے گوئل صاحب بے خیالی میں کہنیاں میز پر ٹکانے ہی جا رہے تھے کہ شیشے کے نیچے موٹو پر ان کی نظر پڑ گئی اور وہ فوراً سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ عین اسی وقت ڈاکٹر نے ان سے پوچھا: "کہیئے۔"

گوئل صاحب نے اپنی تکلیف بیان کی کہ ان کا جی بھاری بھاری رہتا ہے، بھوک یکسر غائب ہو گئی ہے اور قارورے کا رنگ گہرا زرد ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے انھیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جا کر لیٹ گئے تو کچھ لمحوں کے بعد ڈاکٹر صاحب بھی اندر آ پہنچے۔ انھوں نے ان کی نبض دیکھی، زبان دیکھی، ذرا سا پیٹ کو ٹٹولا اور پھر بولے۔ "آپ دن رات کام کرتا ہے۔ پھٹپھٹیا پر گھومتا ہے۔ آپ کو تھوڑا پیدل چلنے کو مانگتا ہے۔"

اور وہ باہر نکل آئے۔ جب گوئل صاحب باہر آئے تو ڈاکٹر چیٹرجی نے نسخہ ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: "تین دن کا دوا ہم دیا ہے، کیلشیم اور وٹامن بی کامپلیکس کا انجکشن لینا ہوگا۔ دوا پیؤ، انجکشن لو، تھوڑا گھومو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے، جہاں کوئی نچی ذات کا مریض کھری میز پر بچھے بھورے موم جامے پر لیٹا تھا اندر جا کر ڈاکٹر صاحب نے پردہ کھینچ دیا۔

گوئل صاحب نے باہر آ کر نسخہ دیا۔ آدھ گھنٹے میں نسخہ بنا۔ جس کی قیمت پانچ روپے ساٹھ پیسے کمپاؤنڈر نے لے لئے سیوا آشرم کی سیڑھیاں اترتے وقت گوئل صاحب نے ایک نظر ان بنچوں پر بیٹھے مہتروں مزدوروں پر ڈالی جن سے ڈاکٹر چیٹرجی کسی قسم کی رعایت نہ کرتے تھے اور انھیں ڈاکٹر چیٹرجی کے

مطب کے تمام سیوا آشرم پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

انھیں دنوں اچانک کشمیر، شملہ، نینی تال اور مسوری میں زوروں کی برف باری ہوئی اور لکھنؤ میں بھی سخت سردی کی لہر دوڑ گئی۔ یا تو ان کو گرمی لگنے لگی تھی اور دھوپ کی تمازت برداشت نہ ہوتی تھی یا اتنی سخت سردی پڑی کہ اوور کوٹ تک نکالنے کی نوبت آ گئی۔ گوئل صاحب سردی میں یوں بھی باہر کم نکلتے تھے لیکن ان دنوں ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق روزانہ سیر کو جاتے تھے۔ انھیں اندر اتنی حدت محسوس ہوتی کہ وہ اوور کوٹ، مفلر اور ٹوپی لئے بغیر کبھی گوتم پلی تک اور کبھی شیواجی مارگ تک پیدل گھومتے۔ مگر اتنی سیر کرنے کے باوجود انھیں ذرا بھی فائدہ نہ ہوا۔ ان کا جی بدستور بھاری رہا۔ اور بھوک ویسی ہی غائب رہی۔

انھوں نے تین انجکشن لئے تھے کہ ایک دن ان کی بیوی نے کہا کہ "آپ کی آنکھیں تو پیلی پیلی نظر آتی ہیں۔

گوئل صاحب شام کو ڈاکٹر چیٹرجی کے پاس پہنچے اور کہا کہ "مجھے یرقان ہو گیا ہے۔" ڈاکٹر نے ان کی دونوں آنکھوں کے پپوٹے ذرا نیچے کر کے دیکھے۔ بجلی کی روشنی میں وہ ہلکا پیلا پن بھلا کہاں نظر آتا۔ بولے "تم لوگ بوت وہم کرتا ہے۔ یرقان پھرقان کچھ نہیں۔ صبح آنا۔ دیکھے گا۔"

دوسرے روز گوئل صاحب پھر گئے تو ڈاکٹر چیٹرجی نے آنکھیں دیکھ کر بے پروائی سے کہا۔ "ہاں، کچھ جانڈس معلوم ہوتا ہے۔ یہ دوا نہیں چلے گا دوسرا انجکشن لینا ہوگا۔"

گوئل صاحب کہنے جا رہے تھے کہ انھوں نے تو پہلے ہی کئی بار کہا تھا کہ انھیں پیشاب پیلا آ رہا ہے.......... لیکن ڈاکٹر چیٹرجی نے ان کی بات نہیں سنی۔ نسخہ لکھ کر دیا اور یہ ہدایت دے کر کہ دودھ، گھی، روٹی کچھ دن کے لئے ترک کر دینا ہے اور پھل اور ابلی سبزیاں کھانا ہے۔ وہ اندر معائنے کے کمرے میں لیٹے ہوئے مریض کو دیکھنے چل دئے۔

گوئل صاحب پر اس عرصے میں بیس پچیس کی چپت پڑ چکی تھی۔ انھیں ڈاکٹر پر بے حد غصہ آیا۔ میں کہتا تھا کہ میرے قارورے کا رنگ پیلا ہو گیا ہے، میرا جی گھبراتا ہے۔ بدن میں بہت گرمی ہے.... اور وٹامن بی کے انجکشن لگا دیئے ـــ

اور پہلی بار انھیں ڈاکٹر کی وہ تیزی کھلی جس سے وہ ایک بار میں تین مریض نمٹاتے تھے اور جس کی گوئل صاحب دل ہی دل میں بہت تعریف کرتے تھے۔

گھر آ کر انھوں نے بیس گالیاں ڈاکٹر کو دیں۔ دوائیاں اٹھا کر پٹک دیں اور بیوی سے کہا کہ آج سے وہ صرف گنے کا رس پیئیں گے اور پھلوں اور ابلی ہوئی سبزیوں کا استعمال کریں گے۔ ان کے چھوٹے بھائی کو ایک بار یرقان ہو گیا تھا اور صرف گنے کا رس پینے سے اُسے آرام آ گیا تھا۔ وہی علاج وہ بھی کریں گے اور کسی ڈاکٹر کے چکر میں نہیں پڑیں گے۔

مسز گوئل نے ایک بار دبی زبان سے کہا کہ شاید ڈاکٹر اوستھی نے کوئی ہائی پوٹینسی کی دوا دے دی ہے۔ ذرا اُن سے کہیئے کہ وہ کوئی اینٹی ڈوٹ دے دیں!

لیکن اس بات پر جس قہر آلود نظروں سے گوئل صاحب نے انھیں دیکھا اس سے انھیں آگے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی اور انھوں نے چپ چاپ ملازم کو موسمبی سنترے اور کچھ سبزیاں لانے کے لئے بھیج دیا۔

گوئل صاحب کی طبیعت خاصی خراب ہو گئی۔ آنکھوں کے ساتھ ہی ان کا تمام جسم زرد پڑ گیا۔ مگر انھوں نے کسی ڈاکٹر سے رجوع نہ کیا۔ ان کی بیوی ان کے قریب کرسی پر بیٹھی کچھ کاڑھتی بنتی رہتیں۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرتیں۔ مگر بھول کر بھی انھوں نے ڈاکٹر اوستھی یا ہومیو پیتھی کا نام نہیں لیا۔ رفتہ رفتہ گوئل صاحب کی طبیعت کچھ سنبھلنے لگی۔ انھیں بھوک لگنے لگی اور آنکھوں کی زردی بھی کم ہونے لگی۔ تبھی ایک دن ان کی بیوی نے حکیم چشتی کا ذکر کیا۔

مسز گوئل اپنے بھانجے کے لئے اونی ٹوپی بن رہی تھیں۔ (ہر سال وہ لوگ پہاڑ پر جاتے تھے۔ اور وہ وقت سے اپنے

بھانجے کو سوٹ بنا کر بھیج دینا چاہتی تھیں) اچانک۔ وہ کہنے لگیں۔
"پانڈے کی بیوی حکیم چشتی کی بے حد تعریف کر رہی تھیں۔ ان کی بہن کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ پھر جانے کیا گرمی اس کے سر کو چڑھ گئی کہ وہ پاگل ہو گئی۔ تمام ڈاکٹر جتن کر کے ہار گئے۔ ڈاکٹر ڈاوستی بھی کچھ دن علاج کرتے رہے۔ (یہ بات انھوں نے گوئل صاحب کو خوش کرنے کے لئے کہی) لیکن کوئی کچھ نہ کر سکا۔ آخر انھوں نے رائے دی کہ اسے آگرہ، بریلی یا کانکے بھیج دیا جائے۔ کانکے کی سب نے تعریف کی۔ جوان جہاں بہن ــــ وہ بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی رچانے کی سوچ رہے تھے۔ انھیں گرمیوں میں لگن تھا۔ بریلی یا کانکے بھیجنے کو پانڈے جی تیار نہ ہوئے اور گھر میں اس کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ تبھی کسی نے حکیم چشتی کا پتہ بتلایا۔ ستر سال کی ان کی عمر ہے اور وہ بہت مشہور حکیم ہیں۔ یہاں سے کلکتہ اور امرت سر تک جاتے ہیں۔ انھوں نے چھ مہینے میں اسے ٹھیک کر دیا۔ آپ کہئے تو میں بلواؤں انھیں۔"

گوئل صاحب نے ان کی بات نہیں سنی۔ وہ اس سُرخ ٹوپی کو دیکھ رہے تھے جو ان کی بیوی کے ہاتھوں میں تقریباً مکمل ہو گئی تھی۔ یکایک انھوں نے کہا۔ "تم میرے لئے دو ایک ایسی گول ٹوپیاں نہیں بن سکتیں؟"

"ٹوپیاں!" ان کی بیوی نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"یہ رنگ تو بہت شوخ ہے۔ تم ڈارک بلو یا ڈارک گرے رنگ کی میرے سوٹوں سے میچ کرتی ہوئی دو ٹوپیاں بن دو تو بہت اچھا ہو۔"

"میں آج ہی اون لاکر شروع کر دوں گی۔" اور انھوں نے پھر حکیم چشتی کا ذکر چھیڑا۔ "تم کمزور ہو گئے ہو۔ حکیم چشتی کو بلواتی ہوں۔ ایسی دوائیں دیں گے کہ گرمی بھی نہ ہو اور جسم میں طاقت بھی آجائے۔"

"میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔" گوئل صاحب نے قدرے ہنس کر کہا۔ "کیونکہ میرے سر کو پھر ٹھنڈ لگنے لگی ہے۔ تم نے غور نہیں کیا۔ آج میں دو تین بار چھینکا ہوں۔ تم بس میرے سوٹوں کے رنگ کا اون لے کر دو ایک ٹوپیاں بن دو۔"

ایک ہفتہ بعد جب گوئل صاحب مکمل طور پر صحت یاب ہو کر نیلا سوٹ پہنے ہوئے باہر نکلے تو ان کے سر پر بائیں طرف کو جھکی سوٹ کے ساتھ میچ کرتی ہوئی گول ٹوپی تھی۔ دوستوں نے جب ان کے کچھ کمزور ہو جانے پر اظہار ہمدردی کرتے ہوئے ان کے چہرے پر کھلنے والی اس ٹوپی کی تعریف کی تو گوئل صاحب ڈاکٹروں کی تمام زیادتیاں بھول گئے۔

بلونت سنگھ

گلیاں

جب وہ کلبلا کر مکان کے کونے والے کمرے میں سے باہر نکلی تو اس نے انتہائی پریشانی کے عالم میں نگاہیں چاروں طرف دوڑائیں —— سہ پہر کے وقت گلی سنسان تھی اور اتفاق سے کسی نے بھی اُسے نہیں دیکھا۔ اس نے جھپٹ کر بھاگتے ہوئے اپنے گریبان کو سنبھالا اور خوف کے مارے کانپتی ہوئی اُنگلیوں سے بٹن بند کرنے لگی۔

اس کے پیچھے ہی بیلا سنگھ اور چھیلا سنگھ بھی لپک کر باہر آئے۔ یوں تو وہ آپس میں چچیرے بھائی تھے لیکن ایسے موقعوں پر وہ حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ اتفاق کا مظاہرہ کرتے...... وہ تینوں تیجوں کی ماں کو دبوچ لینا چاہتے تھے لیکن وہ ان کے چنگل سے بگٹٹ بھاگی جا رہی تھی۔

ان مردوں کے چہرے ایسے تھے جیسے گلال ملا گیلا آٹا چار دن تک جوں کا توں پڑا رہنے سے خمیرہ ہو کر پھول آئے۔ ناک کے نتھنوں کے بال ٹڈی کی مونچھوں کی طرح باہر کو جھانک رہے تھے۔ کنپٹیوں اور گالوں پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئی تھیں۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ رانیں پھڑک رہی تھیں —— سانس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے انھوں نے آنکھیں سکیڑ کر فرار ہوتی ہوئی عورت پر آخری نگاہ ڈالی..... اور پھر مایوس ہو کر بڑے گھیرے کی شلواریں پھڑپھڑاتے، بھالوؤں کی طرح پاؤں زمین پر پٹختے وہ دونوں واپس مکان میں جا گھسے۔

فرار شدہ عورت یوں بھاگی چلی جا رہی تھی جیسے وہ اسی طرح بھاگتی ہوئی اس دنیا کی حدوں کو پار کر جائے گی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سانولا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں جن پر وہ بار بار زبان پھیر رہی تھی۔ لیکن اس وقت زبان بھی تو سوکھ گئی تھی۔ میل کے کارن گردن کا پسینہ بھی گدلا ہو گیا تھا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی۔ زور زور سے دھڑکتا ہوا دل پسلیوں کی دیوار سے سر پٹخ رہا تھا —— اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج وہ جان دے دے گی۔

پچھلے ایک برس میں کئی بار اس کے دل میں مرنے کا خیال آیا کیونکہ موت کے سوا اس کے مسائل کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا... اور آج اس نے آخری فیصلہ کر لیا تھا اور اسے عملی جامہ پہنانے کا مصمم ارادہ بھی کر لیا تھا۔ آبادی کے باہر ادھ ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر ایک گہرا کنواں تھا، بس اسی کنوئیں میں چھلانگ لگا دینے سے اس کے سارے مسائل یک قلم حل ہو سکتے تھے۔

اس کا جنم اسی گاؤں میں ہوا تھا، لیکن اب اسے گاؤں کہنا سراسر زیادتی تھی۔ نئی نئی اسکیمیں چلیں۔ ایک میل پرے نئے کارخانے کھل جانے سے گاؤں کی آبادی بڑھی۔ کارخانوں میں کام کرنے والے بہت سے لوگ اسی گاؤں میں رہنے لگے۔ کنوؤں کی جگہ ہینڈ پمپ لگ گئے۔ بعض مکانوں میں کچّی اینٹوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ پکّی اینٹوں کی دیواریں بھی کھڑی ہو گئیں۔ اکثر مکانوں کے آگے بہنے والی نالیاں بھی پختہ ہو گئیں۔ پہلے گنتی کی تین گلیاں

تھیں۔ اب گلیوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔ سادہ لوح دیہاتیوں کو یہاں گلیاں ہی گلیاں دکھائی دیتی تھیں — اور پھر جس عورت کو خودکشی کرنے کی جلدی ہو اُسے یہ گلیاں بھول بھلیاں دکھائی نہ دیں تو اور کیا ہو —؟

اس کے دادا نے کافی لمبی عمر پائی۔ وہ ہر صبح نہار منھ آدھ پاؤ سرسوں کا خالص تیل پی جایا کرتے تھے اور اسے ہی اپنی صحت اور طویل العمری کا سبب بتاتے تھے۔ دیگر لوگ ان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے تیل پیتے تو یہ ان کے پیٹ میں رکنے نہ پاتا، جوں کا توں خارج ہو جاتا۔ اسے ہضم کر لینا بھی ان کے سینہ کا راز تھا۔ گو اس راز سے وہ خود بھی واقف نہیں تھے۔ اگر ہوتے تو دوسروں کو بتانے سے گریز نہ کرتے۔ وہ پرانی قسم کے شاعر بھی تھے:

الف آکھیا پوران بھگت نے ......

یا ب بنا رضا (رضا) رب دی توں بتا دی نہ گھر کرا اے

آج کے لوگ انھیں جو چاہے سمجھیں لیکن اپنے زمانے میں وہ صوفی سمجھے جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان کے خیالات گلیوں کے مانند ہیں ایسی گلیاں جن میں چلتا ہوا انسان نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے۔ جب کسی کے دماغ میں ایک خیال آیا تو سمجھو کہ اس کے سامنے ایک گلی کھل گئی، کیوں انسان ایک خیال یا گلی پہ دوسرے خیال یا گلی کو ترجیح دیتا ہے؟ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا۔ دادا اس مسئلے پر گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ ان کے ہم عصر ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سنا کرتے، لیکن ان کی ننھی پوتی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا ...... وہ ذرا پرے ہٹ کر کھڑی ہوتی اپنی روکھی سوکھی چوٹی کو گرہیں دیتی رہتی — وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے دادا کیسی کیسی گرہیں اور کون کون سی گتھیاں کھول اور سلجھا رہے ہیں۔ اسے تو محض ان کا چہرہ بھلا لگتا تھا، حالاں کہ چھدری داڑھی کے پاس ان کے گال پر ایک بڑا سا مسہ تھا جس پر سے کانٹوں کی طرح تین چار بال سیدھے کھڑے عجیب سے لگتے۔

ایک مکان کی نکڑ سے دوسرے مکان کی نکڑ تک، اگاڑے کی بنی ہوئی سپاٹ دیواریں یا پکی اینٹوں کی دیواریں، جن کی دراڑوں میں پلستر کے جال۔ ایک نالی کے بعد دوسری نالی کو پھاندتی ہوئی، دوڑتی سے تیسری، تیسری سے چوتھی ... مکان، دیواریں، نالیاں ... گزرتی جا رہی تھیں۔

گرد آلود آسمان میں سورج اپنی شدت کی گرمی کے مارے خود تلملا رہا تھا۔

اس خوف سے کہ کہیں پاؤں کشادہ پائنچوں میں اُلجھ جانے سے وہ گر نہ پڑے اور چوٹ کھا جائے اس نے شلوار سمیٹ کر نیفے میں اڑس لی تھی۔ اسے اس پر ہنسی نہیں آ رہی تھی کہ جب موت کو لبیک کہنے کی ٹھان ہی لی تو پھر چوٹ کھانے سے ڈرنا کیا ..... اس کے ٹخنے اب بھی چکنے تھے۔

یہیں پر اس کا بچپن بیتا تھا۔ اسے اپنی سگی ماں کی صورت تک یاد نہیں تھی۔ سوتیلی ماں نے بُرا سلوک نہیں کیا اس سے، لیکن اس عورت کو پیار کرنا نہیں آتا تھا، نہ بچوں سے نہ شوہر سے۔ عجیب ٹھس عورت تھی۔ کلائی میں لوہے کا موٹا سا کڑا چڑھائے رکھتی۔ اس ٹائپ کی عورت تھی اس کی ماں۔ ہاں دادا جب تک جیتے رہے اسے بہت ہی لاڈ پیار کرتے رہے۔ دادا کی باتیں اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئیں۔ مگر وہ ان کی خاموش محبت کو سمجھتی تھی جس طرح اس سمے گاؤں کی گلیوں کی تعداد محض تین تھی اسی طرح ان دنوں اس کے دماغ میں خیالات کے گلیوں کی تعداد بھی ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی ...... دن، مہینے، سال گزرتے گئے۔ نگر کی گلیوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اس کے دماغ کی گلیاں بھی شاخ در شاخ پھیلتی گئیں ..... اُلجھتی گئیں .... جب دادا مر گئے تو اس کے دماغ کی بہت سی گلیاں قبرستانوں میں تبدیل ہو گئیں۔

پھر وہ زمانہ بھی آیا جب اس کے بدن پر پھول کِھل اُٹھے۔

پِپلاں دیاں چھاواں وے
مُڑ مُڑ کے نہ تکیاں کر
متریٔ ماں دی دھی آں دے
مُڑ مُڑ کے نہ ....

اس کی ایک منھ لگی سہیلی نے یہ بول سنائے اور کہا کہ تجھے ایک

جوان ایک نظر دیکھنے کے لئے تیری گلی کے چکر لگایا کرتا ہے۔ دُھت کہہ کر وہ بھاگی۔ اس کے گھر میں ایک چھوٹا سا ٹوٹا ہوا آئینہ تھا جس میں پورا چہرہ دیکھنا ناممکن تھا۔ چناں چہ وہ ایک سہیلی کے گھر پہونچی۔ کسی حیلے سے ان کے بڑے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہاں اس نے اپنے آپ کو سر سے لے کر ناف تک دیکھا۔ مطمئن ہو کر واپس لوٹی۔ پہلے اس دل پھینک آوارہ کو اچھی طرح دیکھا بھالا، کچھ جانا بُوجھا اور پھر جب اسے دوا ہی سے دیکھ پاتی تو صحن کا دروازہ دھڑاک سے بند کر دیتی۔ یہ امر یقینی ہے کہ اگر جلد ہی اس کی شادی نہ ہو جاتی تو وہ صحن کے دروازے کو اسی طرح ایک دن توڑ ڈالتی۔

وہ نہیں جانتی کہ وہ جوان کس طرح اس سے اپنا رشتہ جوڑنے میں کامیاب ہوا۔ کس گلی سے سہرا باندھ کر آیا اور روتی ہوئی سہیلیوں کے جھرمٹ میں سے اسے دلہن بنا کر چلتا بنا.... اور پھر اسے تین بچے دے کر نہ جانے کس گلی میں گھس گیا جہاں سے وہ لوٹ کر نہیں آیا۔

جب اس کا شوہر زندہ تھا تو وہ محلہ بھی آباد تھا جہاں وہ رہتی تھی۔ صبح کے وقت چڑیوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ بیتی کے بھجنوں اور ڈھولک کی آوازیں دُور کے گوردوارے سے سنائی دیتیں۔ اونگھتی ہوئی فضا میں گوربانی کے شبد سنہرے پروں والے پرندوں کی طرح اڑ نکلتے، چک پھیریاں لیتے، ان جانی، ناسمجھی، ان بوجھی روپہلی گلیوں میں سے تیرتے ہوئے نکل جاتے اور اپنے پیچھے سنہری اور روپہلی چنگاریوں کے بل کھاتے اور رقص کرتے غبار کے راستے بناتے چلے جاتے۔ اس کے من کی گہرائیوں میں نیلے پانی کی جھیل تھی جس کے کناروں پر جگنوؤں کے بادل فرّاٹے بھرا کرتے تھے۔ پانی کی سطح پر کنول تھے جو اس دھندلی روشنی میں اسے صاف دکھائی نہیں دیتے تھے۔ جب یکے بعد دیگرے اس نے تین بچوں کو جنم دیا تو ان بچوں میں غیروں کو تو کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی لیکن ان کی ماں انھیں پہچان گئی۔ جب بچے گلی کی دھول میں کھیلا کرتے تو ماں کا سینہ خوشی کے مارے پھول جاتا......

وہ بچے کیسے اندھیرے میں سے کیسے اُجالے میں آ گئے تھے.....
"کیسے اُجالے میں؟ — بچوں کا باپ مر گیا تو اس نے بار بار اس سوال کو اپنے من میں دہرایا۔

دوڑتی ہوئی جب وہ پیپل کے ایک چھوٹے سے پیڑ کے قریب سے گزری تو اس کو پتہ نہیں چلا کہ اس پر پتیوں ہرے بھرے طوطے بھی بیٹھے تھے۔ اسے تب پتہ چلا جب طوطے جھپاک سے گزرتی ہوئی، سہمی ہوئی اور مرنے پر تلی ہوئی عورت سے ڈر کر پیڑ سے یوں پھٹ کر اڑے جیسے انار میں سے چنگاریاں چھوٹتی ہیں... حالاں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ طوطے باتیں بنانے میں بڑے استاد ہوتے ہیں۔

اگر اس کے مرد کی موت سے پہلے کوئی اس سے کہتا کہ بنا راستے کے، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ایک تاریک گلی سے دوسری تاریک گلی میں چلتے ہوئے ایک سال گزارا جا سکتا ہے تو وہ کبھی اس بات پر یقین نہ کرتی۔ لیکن اب اس نے خود یہ کارنامہ سرانجام دے دیا تھا۔ عجیب بات ہے۔ جس کام کو کبھی سوچا نہ تھا، جس کے تصوّر سے دل کانپ جاتا، وہی کام کیا — کرنا پڑا۔

واہگورو اکال پرکھ کی کرپا ہے کسی نے اسے بسیلا سنگھ اور پھلیلا سنگھ کے مکان میں سے ایسی بُری حالت میں نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بدنامی سے بچ گئی۔ اگر اسے اس بات کا علم ہوتا کہ اس مکان میں بلانے کے بعد اس سے اس بات کی توقع رکھی جائے گی تو وہ بھول کر بھی ادھر کا رُخ نہ کرتی۔

کچھ روز پہلے جب کہ سورج تاریک تالاب میں چھلانگ لگانے سے پہلے اُفق پر کشمکش کی حالت میں کھڑا تھا۔ مویشی گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ گھنٹیوں کی موٹی پتلی آوازوں سے نگر کے آس پاس کے کھیت گونج اٹھے تھے۔ وہ اپنے صحن والے تندور کو بھُس ملے گارے سے لیپ رہی تھی تو اسے باہر والے دروازے کی دہلیز پر موٹے موٹے بھاری جوتے دکھائی دیئے جو گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ ہر جوتے کی اکلوتی مونچھ اوپر کو اُٹھ کر بچھو کے ڈنک کی طرح گھومی ہوئی تھی...... اس کا دل زور سے دھک

دھک کرنے لگا۔ مرد کے جوتے تھے وہ!

دھیرے دھیرے اس کی پلکیں اوپر کو اٹھنے لگیں اور ان کے ساتھ ساتھ نگاہ بھی۔ جگمگاتے ہرے رنگ کا تہبند، سلک کا کرتا۔ نیچے کو لٹکتا ہوا پگڑی کا شملہ۔ ٹھوڑی پر کالی داڑھی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی ...... اس کے اوپر وہ سمجھ گئی کہ مسکراتے ہوئے ہونٹ اور ناچتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں گی۔ ایک بار جی چاہا کہ وہ یہیں سے اپنی نگاہ واپس لے آئے۔ لیکن جی چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے معاً اوپر دیکھا تو ہونٹ مسکراہٹ سے مبرا اور چہرہ سنجیدہ تھا۔

بیلا سنگھ سر پر سجی سجائی پگڑی اٹھائے کھڑا جلیبیاں کھا رہا تھا ..... ان جلیبیوں کو وہ جلیب کہتے تھے ——

"جلیب لے کر ادھر سے گزرا تو دروازہ کھلا دیکھ کر رک گیا۔"

کیوں رک گئے؟ — اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن وہ دل میں اتنا تو سمجھتا تھا کہ عورت کے من میں یہ سوال سر اٹھا سکتا ہے۔

"بچے کہاں ہیں؟"

عورت کے چپ رہنے پر اس نے سوال کیا۔

شام یکایک کتنی خاموش ہو گئی تھی۔ شاید سارے مویشی اپنے اپنے گھر میں پہونچ چکے تھے عورت کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے گھر کے باہر ہانک دیا ہو۔

معاً جلیبی کھاتے کھاتے بیلا سنگھ کا ہاتھ رک گیا اور منھ کھلے کا کھلا رہ گیا ... پل بھر کو یوں لگا جیسے وہ اب اپنے کشادہ منھ میں جلیبی کی بجائے عورت کو رکھ لے گا .... لیکن نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جن بچوں کی بیلا سنگھ کو تلاش تھی وہ مکان میں سے ہی نکل آئے۔ فوراً آگے بڑھ کر اس نے جلیبیوں کا بڑا سا دونا ان کے حوالے کر دیا۔ "لو جلیب کھاؤ .... لو ... لو ... کھاؤ۔"

وہ تندور لیتی رہی۔ بیلا سنگھ بچوں سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے صحن کے دروازے سے پیسے سر باہر نکال کر اچھیا طاؤ دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ اس نے موقع کا فائدہ اٹھایا۔ فوراً پاؤں گلی میں رکھا .... اور گلیوں کے دھندلکے میں کھو گیا۔

بیلا سنگھ کی یاد تازہ ہو جانے سے اس کے پاؤں کو پر لگ گئے۔ اس کی وحشت اور دہشت اور بڑھی ..... وہ اور تیزی سے بھاگی ..... آسمان کورا تھا، البتہ اس وسیع اور شفاف نیلی جھیل کے کنارے پر چند نیلی، پیلی، لال، سرمئی بدلیاں جل پریوں کی طرح سہمی سی ٹھٹکی کھڑی تھیں ...... کچھ عورتوں، مردوں، بچوں، گایوں، بھینسوں اور کوؤں نے اس فرار ہوتی ہوئی عورت کو سرسری نظر سے دیکھا اور پھر اپنے کاموں، خیالوں، گلیوں میں کھو گئے۔

کچھ روز مسلسل کسی دھندلی گلی میں سے بیلا سنگھ دھوئیں کے مرغولے کی طرح بل کھاتا ہوا آتا رہا۔ بظاہر بچوں سے پیار کرتا، انھیں مٹھائی کھلاتا، بڑی سنجیدگی سے۔ بچوں کی ماں کو سر سے پاؤں تک دیکھتا .... کبھی یوں لگتا جیسے وہ ٹھنڈی آہ بھر کر کہہ رہا ہو "دیکھو رنگ کرتار دے۔" یعنی بھگوان کی لیلا نیاری ہے۔

اب وہ مکان اس کی ملکیت نہیں رہا تھا ..... رہن اور سود در سود کے چکر میں وہ اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بیلا سنگھ نے کہہ دیا — یہ بڑا ظلم ہے — چناں چہ وہ وہیں رہتی رہی۔ ساہوکار نے چپ سادھ لی۔

کتنی بار اسی قسم کے واقعات پیش آ چکے تھے۔ ان سب کا ایک ہی نتیجہ نکلتا تھا ..... فرار — بھاگ بھاگ کر وہ تنگ آ چکی تھی۔ بیلا سنگھ اور دوسرے لوگوں میں ایک بہت بڑا فرق تو یہ تھا کہ یہ شخص سنجیدگی کا پتلا تھا۔ دوسروں کی ناچتی ہوئی پتلیوں کے پیچھے ہوس جبڑے پھیلائے دکھائی دیتی تھی۔

اب چھیلا سنگھ بھی آنے لگا تھا۔ وہ بچوں کے لئے ایک اسکول کھولنے والے تھے۔ پڑھی لکھی نہ ہونے پر بھی وہ گورمکھی جانتی تھی۔ بیلا سنگھ اور چھیلا سنگھ بھی محض اتنا ہی چاہتے تھے۔ کہ وہ بچوں کو اوڑا، ایڑا، ایڑی پڑھا دیا کرے۔

دراصل وہ اس کی مدد کا کوئی وسیلہ نکالنا چاہتے تھے۔ وہ تین بچوں کی ماں تھی۔ اس سنسار میں اس کا کوئی نہیں تھا۔

بھاگتے بھاگتے اس نے خوش قسمت عورتوں کو دیکھا جو اس وقت اپنے گھروں کی ٹھنڈی ڈیوڑھیوں میں بیٹھی چرخے کات رہی تھیں۔ اٹیرنے پر سوت لپیٹ رہی تھیں۔ بعض لاڈلے بچوں کے جھرمٹ میں بیٹھی موج مار رہی تھیں۔

آخر آج وہ ان کے مکان کے نکڑ والے کمرے میں پہونچ گئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے ٹھٹک ٹھٹک کر قدم اٹھاتی ہوئی لوہے کی ایک کرسی کی طرف بڑھی۔ شلوار سنبھال کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے اس سینہ کو جس پر تین بچے پل چکے تھے، دوپٹے سے اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ اس کے بالوں کی مانگ بالکل سیدھی تھی جیسے کالی گھٹا میں اڑتے ہوئے سفید بگلوں کی قطار۔ اس نے سر پر بھی دوپٹہ اس انداز سے اوڑھ رکھا تھا کہ بال اچھی طرح ڈھک گئے تھے۔ اس کے دونوں ہونٹ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے خوابیدہ سے دکھائی دیتے تھے — وہ بڑی اچھی، بڑی پیاری، بڑی سلجھی ہوئی اور بڑی سگھڑ ماں دکھائی دے رہی تھی۔

بیلا سنگھ پہلے سے بیٹھا تھا۔ بھیلا سنگھ بعد میں آیا۔ ان کی آنکھوں میں لال لال ڈورے تھے، چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ وہ کھانا کھا کر آئے تھے، یا پی کھا کر آئے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں ببول کا ایک ایک کانٹا تھا جس سے وہ دانتوں کو کرید رہے تھے — وہ دونوں اب بھی بڑے سنجیدہ تھے جیسے کوئی بڑا مسئلہ درپیش ہو۔

وہ نئے اسکول کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی تھی۔ ابھی تک تنخواہ کا فیصلہ بھی نہیں ہوا تھا، اور پھر اس کے ننھے تین ننھے بچے بھی تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ گلیوں کی خاک چھانتے پھریں اور بڑے ہو کر آوارہ ہو جائیں۔ اپنے سوالات اور مسائل اس نے ان کے سامنے رکھے۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے ضرورت محسوس نہیں کی یا شاید اسے کوئی جھجک ہو .... اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں نہیں کیں۔

اسی طرح سر جھکائے وہ ان کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ پل گزرتے گئے۔ خاموشی گہری ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ اس نے محسوس کیا کہ وہ دونوں اُٹھ کر کمرے کے باہر چلے گئے ہیں۔ شاید اپنی کالی گھوڑیوں پہ سوار ہو کر کھیتوں کو نکل گئے ہوں ...... انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، آخر اس نے سر اوپر اُٹھایا تو دیکھا کہ وہ کمرے میں جوں کے توں اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ بھاری بھرکم۔ لحیم شحیم۔ بھوت نما — اب انھوں نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ ان کی مونچھیں پھڑپھڑائیں — باچھیں چر گئیں، اور وہ ہنسنے لگے۔ آج پہلی بار وہ اس کے سامنے بے جھجک ہو کر بڑی بے تکلفی سے ہنسے۔

اسی رفتار سے اب وہ نگر کے کنارے تک پہونچ چکی تھی۔ وہ گوردوارے کے احاطے کے پاس سے گزر رہی تھی .... گلی کی جانب گوردوارے کی چار فٹ اونچی دیوار تھی اس کی اینٹیں ننگی تھیں۔ دیوار اور بڑے پھاٹک کی مرمت ہو رہی تھی۔ صحن میں جو کافی طویل و عریض تھا پرانے زمانے کا ایک چبوترا تھا اور چبوترے کے پاس چھوٹا سا تالاب تھا۔ اس تالاب کو مذہبی اہمیت حاصل نہیں تھی لیکن اس میں برگد اور شریمنہ کے پیڑ تھے جن کی گھنی چھاؤں تلے کافی ٹھنڈک ہوتی تھی۔ اس سمے گوردوارے کے گرنتھی جی رینٹھے اُبلے پانی میں سر دھو کر چھاؤں تلے بیٹھے کیس سکھا رہے تھے۔ تالاب کے کنارے کنارے پانی میں ادھ ڈوبے مینڈک انھیں اپنی اُبلی اُبلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ برگد کے پتے شاخوں سے ناتہ توڑ کر ہوا میں اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے پانی کے سینہ سے سینہ جا ملاتے اور ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں ڈولتے بہتے پانی کی سطح پر اٹھلاتے۔

گلی کے قریب، ایک جالی دار چھوٹے سے سنگ مرمر کے حجرے میں سنت اوتار سنگھ ایک تان پورہ اپنے بازو کے حلقہ میں لئے بیٹھے تھے۔ انھوں نے بنا نکڑ کے گول ڈھنگ سے صافہ سر پر لپیٹ رکھا تھا۔ گہرے گندمی رنگ کے ماتھے پر سوچ وچار اور وجدان کے دو گہرے بل خوابیدہ تھے۔ چوڑی دار پائجامے پر

کھدر کا کرتا۔ گلے میں گیندے کے پیلے پھولوں کا ہار۔ لب نیم وا۔ تمام کے کیرتن میں گائے جانے والے ایک شبد کی مشق کر رہے تھے۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں تان پورے کے تاروں پر رقصاں تھیں۔ دوسرے ہاتھ سے کچھ کچھ وقفہ کے بعد پہلو میں ٹکی ہوئی نوایجی کرپان کے دستے کو سنبھالتے کیونکہ وجد میں آکر جب وہ جھومتے تو کرپان کا دستہ ان کے کولہے میں چبھنے لگتا۔ ان کی آواز میں درد رقصاں تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی جیسے نیم روشن سرنگ میں گہرے پانی کی ندی بہتی چلی جائے۔

کبوتر، لالیاں، ٹٹیریوں پر کالے داغ لئے چڑے اور کئی پرندے گوردوارے کی پھلواڑی میں چہچہا رہے تھے۔ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے وہ کسی جیتے جاگتے کیڑے پر چونچ کا وار کرتے۔ کیڑا کلبلا کر تڑپتا، بل کھاتا، سرکتا، اچکتا — آخر جان دے دیتا۔ اور اپنا مردہ جسم ان کا پیٹ بھرنے کے لئے تیاگ دیتا۔

گوردوارے کی حدود سے نکل کر وہ کھیتوں میں داخل ہو چکی تھی۔ اب منزل اور اس کے درمیان کھیت تھے اور چند پگڈنڈیاں۔ ایک جانب ایک رہٹ کے آگے اونٹ بے ڈول چال سے دائرے میں چکر لگا رہا تھا۔ دائرہ تھا اور اونٹ کے چکر — اور دوسری طرف ایک اونچے لمبے پھیلے بے برگ و گل بیر کی جھاڑیوں کی آڑ میں سے اس کنوئیں کی بوسیدہ منڈیر دکھائی دے رہی تھی جس میں چھلانگ لگا کر وہ ڈوب مرنا چاہتی تھی۔

جس تیزی سے اس کے قدم اُٹھ رہے تھے اس سے بھی زیادہ تیزی سے اس کی نظریں تیرتی، تھرکتی پھسلتی کھیتوں میں لہلہاتے ہوئے پودوں کی کونپلوں کو چومتی افق تک جا پہنچیں۔ کہیں کہیں کھیتوں میں مدفون بیج انگڑائیاں لے رہے تھے۔ روزِ روشن کے نور اور ان کے درمیان ظلمت اور مٹی کی تہ اور ان جانی دیکھی گلیوں کا جال حائل تھا۔

عورت اور دھرتی کا ایک سا حال تھا۔ دھرتی کے سینے پر سے بھی بھرے ہوئے بادل کارواں در کارواں گرجتے ہوئے موتی برساتے گزر جاتے تھے۔ کن شاہراہوں سے آتے تھے اور کن منزلوں کی طرف گزر جاتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ دھرتی نہیں جانتی تھی۔ وہ اپنی کوکھ سے جنم دینا جانتی تھی۔ کتنی تسکین تھی اس میں۔ بیجوں میں سے پھوٹتی ہوئی وہ کونپلیں جو گرم ہوا کے ایک جھونکے سے مرجھا سکتی تھیں مٹی کے ذروں سے قوت بھرتی تھیں

آج کل دہلی (افسانہ نمبر)

توڑتے پھوڑتے ایک روز آفتاب عالمتاب سے نگاہیں لڑا لیتیں۔

کائنات اور زندگی کے بے معنی پن پر کڑھنا، الجھنا، رونا پیٹنا آسان ہے لیکن کس میں اس بے معنی پن کے حسن کے جلوے کو دیکھنے کی تاب ہے۔ یہ شہزادی ایک کہکشاں سے دوسری کہکشاں تک، ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک جھولا جھولتی ہے۔ بے معنی مسکراہٹیں بکھیرتی ہے لیکن یہ بھی تو یاد رکھنے کی بات ہے کہ اگر ہماری خوشی کسی کا دن پر ملتی ہے تو ہم کب تک خوش رہ سکتے ہیں؟

کچھ دیر بعد وسیع آسمان کے گوشوں سے تاریکی جلوس در جلوس نکلے گی اور ان کا نور اس تاریکی میں گم ہو جائے گا۔ اس کے بچے تاریک تر گلیوں کو سنسان پا کر بلک بلک کر رہ جائیں گے۔

کنوئیں میں ڈوب مرنے کا پروگرام بھی ہو تو گلیوں میں سے ہو کر بھاگنا پڑتا ہے۔ اگر منزل تک پہنچنے کے لئے ایک گلی بھی پار نہ کرنی پڑے وہ منزل کیسی؟ یا شاید منزل اسی مقام پر ہوتی ہے جہاں سے انسان منزل تک پہونچنے کے لئے بھاگ نکلتا ہے۔

معاً وہ رک گئی۔ اس کے پاؤں سے اڑنے والے دھول کے بادل اس کی پنڈلیوں کے آس پاس منڈلانے لگے۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کے زیر و بم کو متوازن کرنا چاہا۔ اسے کنوئیں اور اس کی گہرائی میں پوشیدہ موت سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ پھر بھی دھیرے دھیرے گھوم کر اس نے پیٹھ کنوئیں کی طرف پھیر دی — وہ بہادر نہیں بن گئی تھی۔ اسے اپنا مستقبل روشن نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے اصول اور اپنی عفت کی قربانی نہیں دینے جا رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاہم اس نے بڑے سگھڑپن سے اپنے سینہ پر دوپٹے کی تہ جمائی اور اس کا پلو سر کے اگلے حصہ تک کھینچ لیا، یہاں تک کہ اس کی تابناک پیشانی اور دوپٹے کے لب ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے اور آنسوؤں سے دھلی دھلائی صاف و شفاف جگمگاتی آنکھوں سے نگر پر ایک فاتحانہ نگاہ ڈالی۔

کب اور کس گلی سے دھرتی ماتا آئی، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی، کب اور کس گلی میں وہ گھل مل کر کھو گئی۔

جیلانی بانو

کلیجے کی پھانس

کہتے ہیں جھوٹ اور تیل کبھی تہہ میں نہیں بیٹھتے۔

لیکن مجال تھی کہ شاہد کی صورت دیکھ کر کوئی پہچان لیتا!

اور پھر ایسے وقت تو جناب بڑے سے بڑے گھاگ کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ شاہد بے چارا کس شمار و قطار میں تھا۔

ویسے جھوٹ بولنے کا ارادہ ہو تو انسان پہلے سے منصوبے بناتا ہے۔ ایکٹنگ کی ریہرسل ہوتی ہے۔ لہجے کے اتار چڑھاؤ کی مشق کر لیتے ہیں۔ یوں نہیں کہ میر صاحب جیسے فرشتہ صفت بزرگ نے ابا کی موجودگی میں اچانک اس سے پوچھ لیا۔

"ذرا سننا شاہد میاں، وہ جو کہتے ہیں کہ ہم کل جب اجمیر شریف سے آئے تو — وہ جو کہتے ہیں — میرا مطلب ہے کہ اسٹیشن پہ — وہ یعنی کہ عورتوں کے ڈبے کے پاس تم ہی تھے نا — وہ جو کہتے ہیں کہ کسی لڑکی سے باتیں کر رہے تھے"——

"میں — ؟" شاہد اچھل پڑا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ ابا اور میر صاحب کے سامنے کہے تو کیا کہے! "جی نہیں دادا جان — میں کیوں کسی لڑکی سے باتیں کرتا —!" وہ گھبرانے کے باوجود بڑی دلیری سے بولا اور اپنے ابا کی طرف یوں دیکھا جیسے اس احمق بڈھے کے بہتان سے بے حد خفا ہو۔

واہ بھئی — یہ میر صاحب بھی چھپے رستم نکلے۔ کہاں تو پارسائی کا یہ ڈھونگ کہ محلے کی بڑی بوڑھیاں اپنی لڑکیوں کو قرآن اور حدیث پڑھوانے کے لیے ان کے پاس بھیج دیتی ہیں۔ اور جناب وہ خود اجمیر شریف سے تشریف لائے تو سیدھی نگاہ پہنچی عورتوں کے ڈبے پہ۔

— "تم نہیں تھے — ؟" وحشت کے مارے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ہاتھ پیر لرزنے لگے اور وہ بڑے بے چین سے نظر آنے لگے۔

— "تم نہیں تھے — ؟" انھوں نے پھر شاہد کو ناقابل یقین نظروں سے دیکھا۔

"جی نہیں — میں کیوں ہوتا" —! شاہد نے ڈرتے ڈرتے ابا کی طرف فریادی نظروں سے دیکھا تو وہ بھی میر صاحب کو ناگوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ماجد صاحب کو شاید زندگی میں پہلی بار میر صاحب جھوٹے نظر آ رہے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ انھیں شاہد کی پاکبازی پر بڑا اعتماد ہو۔ لیکن میر صاحب کے اس وقت کہنے کا انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے وہ شاہد پہ بہت بڑے الزام کا آغاز کرنا چاہتے ہوں۔ ورنہ کسی لڑکے کا عورتوں کے ڈبے کے پاس کھڑا ہونا ایسی کون سی انوکھی بات ہے کہ وہ خود شاہد سے اس بات کا اقرار کروانا چاہتے تھے! ماجد صاحب کے آفس کا وقت ہو چکا تھا۔ لیکن آج میر صاحب کو اپنے ہاں دیکھ کر وہ اتنے مسرور تھے کہ انھیں گلی کے موڑ تک رخصت کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ تاکہ محلے والوں پر بھی ذرا رعب پڑے کہ میر صاحب صرف ان ہی کے ہاں آیا کرتے ہیں۔

"اچھا تو میں چلتا ہوں —" وہ دونوں جہاں ہارے ہوئے جواری کی طرح اُٹھے۔

"معاف کرنا میاں —— وہ جو کہتے ہیں کہ میں سمجھا وہ تم

ہی تھے —— بالکل تمھاری صورت۔ ایسے ہی لمبے بال —— خیر جانے دو ——

وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھے تو ماجد صاحب گلی چھوڑ دروازے تک بھی انھیں رخصت کرنے نہ آئے۔ جانے کیوں آج انھیں میر صاحب کی اس بات پر بڑا غصہ آرہا تھا حالانکہ وہ بھی سب کی طرح ان کی عظمت سے سخت متاثر تھے۔

اور صرف ماجد صاحب ہی کیا میر صاحب کی دیانت داری اور شرافت پر تو سارا محلہ جان دیتا تھا۔ پتہ نہیں کیسے محلے کے ہر بوڑھے اور بچّے نے اپنے اعتماد کا ووٹ انھیں دے دیا تھا —— ہر لڑائی جھگڑے کا تصفیہ وہی کرتے۔ اتنی جائداد کے مالک ہونے کے باوجود اپنے اوپر کچھ خرچ نہ کرتے تھے۔ ان کی سچائی اور شرافت کے قصّے محلے کی عورتوں کو زبانی یاد تھے۔ ایک بار وہ اجمیر کے ٹکٹ چیکر سے ایک آنہ زیادہ لے آئے تھے۔ وہ آنہ لوٹانے خود اجمیر گئے —— ایک بار انھوں نے اپنی ماما کو بے قصور ڈانٹ دیا تھا تو اس کے گھر جا کر معافی مانگی —— جوانی میں بھی کبھی کسی عورت کو نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا —— اور ایک بار میرے تو —— اور مجھے —— میرے ساتھ —— سب اپنی اپنی کہنا چاہتے تھے۔ زیادہ عقل مند اور ترقی پسند قسم کے لوگ میر صاحب کی ان عادتوں کو وہم اور مراق کہہ کر مسکراتے تھے۔

اسی لئے ماجد اور شاہد کو سویرے ہی سویرے ان کے آنے پر تعجب ہوا تھا۔ کیونکہ میر صاحب کبھی کسی کے ہاں نہ جاتے تھے۔ ستر بہتر کے پیٹے میں آچکے تھے۔ اس پر کمزور بدن اور کمزور آنکھیں —— پھر دنیا دیکھنے کی ہوس کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ دن رات اپنے سجدوں اور تسبیحوں میں مصروف رہتے۔ گھر سے مسجد اور مسجد سے اخبار کی دوکان —— بس اسی لکیر پر چلتے تھے۔ البتہ شام کو محلے کا ہر مرد ان کی بیٹھک میں جمع ہوتا اور دنیا بھر کے مسائل پر باتیں ہوا کرتیں۔ اب تو لوگ اس بات کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ محلے میں کسی کا کوئی عزیز رشتے دار مر جاتا تو وہ بھی خود ہی میر صاحب کے پاس آتا تھا تسلی کے الفاظ سننے کے لئے۔

تیسرے دن شاہد اپنے دوستوں میں بیٹھا رمی کھیل رہا تھا کہ میر صاحب کا نواسہ اُسے بلانے آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ میر صاحب اپنی غلط فہمی پر اس سے معافی مانگیں گے۔ وہ بڑے سیدھے اور راست گو مشہور تھے۔ بعض لڑکے تو یوں ہی تفریحاً انھیں ستانے کے لئے ان پر کوئی نہ کوئی الزام لگا دیتے تھے اور وہ بے چارے ایک ایک سے اپنے قصور معاف کرواتے پھرتے تھے۔

شاہد ان کے ہاں پہنچا تو میر صاحب حیران پریشان آنگن میں ٹہل رہے تھے۔ چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کئی راتوں سے سوئے نہیں ہیں۔ شاہد کو دیکھتے ہی لپکے اور بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر اندر لے گئے۔ دالان سے کمرے میں اور کمرے سے ایک تہہ خانے نما کوٹھری میں۔ پھر اس کا بھی دروازہ بند کر کے بولے:

"بھئی اس دن مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی تھی کہ وہ جو کہتے ہیں کہ تمھارے ابا کے سامنے ہی وہ بات پوچھ بیٹھا —— ہاں تو وہ جو کہتے ہیں کہ بیٹے تم ہی تھے نا اسٹیشن پر ——؟"

"جی نہیں۔ میں کیوں ہوتا ——؟" شاہد جھنجھلا گیا۔ آخر اس بڈھے کو ایسی باتوں سے دلچسپی کیوں ہے۔ وہ کیوں اقرار کروانا چاہتا ہے! وہ فوراً دروازے کی طرف جانے لگا۔

"لیکن پوری بات تو سنتے جاؤ میاں ——" وہ بھی شاہد کے پیچھے لپکے۔ ان کا ایک ہاتھ دل کو سہلا رہا تھا اور دوسرا کانپ رہا تھا۔

"کیا بتاؤں بیٹے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ پرسوں سے میں بڑی الجھن میں ہوں۔ مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ جو کہتے ہیں کہ تم کہیں میری بزرگی کا لحاظ کر کے تو نہیں چھپا رہے ہو!"

پھر انھوں نے شاہد کے چہرے پر برہمی کے آثار دیکھ کر کہا۔

"اگر میری بوڑھی آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے تو پھر —— تم —— سچ بتاؤ بیٹے تم تو بالکل سچ کہہ رہے ہو نا ——؟"

انھوں نے بڑے منت بھرے انداز میں پوچھا تو جانے کیوں شاہد کو ہنسی آگئی —— عجیب سنکی بڈھا ہے ——

کئی دن گزر گئے اس بات کو —— یہاں تک کہ شاہد نے اپنے جن دوستوں کو یہ لطیفہ سنایا تھا وہ دوسروں کو سنا سنا کے بور ہو گئے

اس دوران میں شاہد نے کئی بار اپنے ابا سے سنا کہ میر صاحب بیمار ہیں تو اسے ذرا سکون سا ملا - اچھا ہی ہوا کہ وہ اپنی بیماری میں لگ کر وہ بات بھول گئے ۔ ورنہ پھر کسی دن یقیناً آدھمکتے - اس سے اقرار کرواتے ۔

لیکن میر صاحب تو نہ آئے البتہ ایک دن ان کا بھتیجہ احسن آگیا جو شاہد کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا - آتے ہی اس نے بڑے اداس لہجے میں سنایا کہ ہمارے تاؤ میاں بہت بیمار ہیں اور آج انھوں نے مجھے بلایا تھا کہ

اتنا سنتے ہی شاہد نے اس کی بات کاٹ دی ۔

" تم سے پوچھا ہوگا کہ فلاں دن اسٹیشن پر ایک لڑکی سے تم ہی باتیں کر رہے تھے ؟ "

" مجھ سے —— ! احسن نے تعجب سے کہا —" نہیں تو —— مگر انھوں نے مجھ سے یہ ضرور کہا ہے کہ میں تم سے یہ بات کسی طرح معلوم کروں —— "

" افوہ —" شاہد اچانک غصہ میں آگیا ۔

" آخر تمھارے تاؤ میاں میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں ۔ کیا انھیں یہ شبہ ہے کہ میں ان کے خاندان کی کسی لڑکی کو بھگائے لئے جا رہا تھا —— ورنہ اس لڑکی سے انھیں اتنی دل چسپی کیوں ہو گئی ہے ۔ بھئی تم سب بھائی بھی تو ہو —— کبھی تم لوگوں کی مصروفیتوں کا حال کیوں نہیں پوچھتے ! شاہد غصہ میں بکتا رہا ۔ احسن چپکا بیٹھا سنتا رہا —— بات تو معقول تھی ۔ اگر تاؤ میاں اس کے پیچھے یوں ہاتھ دھو کر پڑ جائیں تو اسے کس کس بات کے اقرار کرنا پڑیں گے !

پھر احسن نے سگریٹ سلگا کے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا :

" میرا خیال ہے تاؤ میاں کو تمھارے رومان کی کھوج نہیں ہے نہ اُن بیچارے کو اس لڑکی سے دل چسپی ہو سکتی ہے ۔ شاید وہ اس بات پہ پشیمان ہوں کہ انھوں نے ایک جھوٹی بات . . . . "

" خیر — خیر " — شاہد نے ہاتھ اُٹھا کر اسے خاموش کر دیا ۔

" ہوا کریں پشیمان —— میں سچ کہہ رہا ہوں یار —— کہ آئندہ اگر انھوں نے مجھ سے یہ سوال کیا تو —— تو میں —— "

وہ سٹپٹا گیا - (میر صاحب کی عزت کرنا اس کے خاندان کی روایتوں میں شامل تھا) اس دن کے بعد سے میر صاحب بھی جیسے ہار گئے ۔

حالانکہ کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ وہ حکیم صاحب کے ہاں سے دوا لے کر آتے وقت شاہد کو چوراہے پر ملے ۔ اس نے بڑی سعادت مندی سے انھیں سلام کیا اور وہ حسب عادت گردن ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے ۔

پھر جس دن شاہد اپنی امی کی دوائی لینے گیا تو میر صاحب حکیم صاحب کے سامنے بیٹھے اپنا حال سنا رہے تھے ۔

" بس یہاں تکلیف ہے —— انھوں نے اپنے سینے پر داہنی طرف ایک حلقہ سا کھینچا —" ایسا لگتا ہے حکیم صاحب جیسے میرے کلیجے میں کوئی پھانس چبھ گئی ہے ۔ سارے بدن میں شدید کرب ہے ۔ اب تو مجھے کوئی ایسی دوا دیجئے کہ میرے سوچنے سمجھنے کی قوت ہی ختم ہو جائے ۔ "

دوا لے کر جب وہ چھڑی کے سہارے اُٹھے تو شاہد نے بڑھ کر انھیں تھام لیا ۔ اس کے دماغ سے میر صاحب کی وہ بات بالکل نکل چکی تھی ۔ خود میر صاحب بھی شاید بھول بھال گئے ہوں ۔ کیونکہ وہ راستے بھر شاہد کی امی کا مزاج پوچھتے رہے ۔ ان کی بیماری کے لئے اپنے آزمودہ نسخے بتائے ۔ پھر سیاسی حالات پر تبصرہ ہوتا رہا ۔ میر صاحب نے اس زمانے میں علی گڑھ سے بی ۔ اے کیا تھا ، جب بی ۔ اے پاس کرنے والوں کو لوگ چل چل کر دیکھنے آتے تھے ۔

جب گھر قریب آگیا تو میر صاحب نے سلام کے جواب میں پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا :

" بیٹا ۔ اب تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو —— ؟ "

ان کے اتنے نرم لہجے کو دیکھ کر شاہد کو بڑی شرم آئی ۔

" جی نہیں دادا جان ، میں آپ سے کیوں خفا ہوتا — "

" مگر بیٹا ، وہ جو کہتے ہیں کہ میرے دل میں تو ایک پھانس چبھ کر رہ گئی ہے ۔ تم شاید مجھ سے شرما رہے ہو یا خفا ہو ۔ ارے بھائی جوانی میں لوگ کیا کچھ نہیں کرتے — ! تو مجھے کیا کرنا ہے تمھاری ان دل چسپیوں سے ۔ میں تو — وہ جو کہتے ہیں

کہ —— "

اتنا سنتے ہی شاہد پھر انگاروں میں نہا گیا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس خبطی بڈھے سے کہے تو کیا کہے!

"آپ مجھے جھوٹا کیوں سمجھتے ہیں۔ اور میرا اعتبار نہیں تو اس لڑکی کی خبر لیجیے، ناجسے آپ نے میرے ساتھ دیکھا تھا۔ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں —— " اس نے انتہائی غصہ میں سنبھل سنبھل کر کہا۔

"نہیں بیٹا غصہ میں مت آؤ۔" وہ ڈر کے مارے کانپنے لگے۔ "وہ جو کہتے ہیں کہ میرا مطلب یہ نہیں تھا —— خیر، تم جاؤ اللہ حافظ —— "

تھوڑی دیر جانے کے بعد شاہد نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ میر صاحب وہیں سڑک کے کنارے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے تھے۔

اب تو میر صاحب کا نام ہی شاہد کی چڑ بن گیا تھا۔ دوست احباب اسے چڑاتے تو وہ سچ مچ دیوانوں کی طرح مارنے دوڑتا۔

کوئی کہتا —— "بیچارے کو رقیب بھی ملا تو کیسا بڈھا کھوسٹ لیکن اس لڑکی پر کوئی تمھاری اجارہ داری تو نہیں ہے۔ ذرا میر صاحب کو بھی اپنے کلیجے کی پھانس نکال لینے دو۔"

"یار خدا کے لئے اب اس پاگل کا نام میرے سامنے مت لو۔" وہ سچ مچ غصہ میں آجاتا تھا —— "ان سے کہہ دو کہ وہ لڑکی عنقریب حور کے ڈریس میں انھیں جنّت کے دروازے پر ملے گی۔" اور پھر سب خوب ہنستے۔

ایک ہفتے بعد شاہد نے سُنا —— میر صاحب کا داماد چوک میں کھڑا کسی سے کہہ رہا تھا —— "اب ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ اللہ جانے کس چیز میں دم اٹکا ہے کہ سانس کا ڈورا چل رہا ہے —— " شاہد آگے بڑھ گیا۔ جانے کس کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ لیکن اسے کچھ گمان سا ہوا کہ یہ ذکرِ خیر میر صاحب کا تھا۔

ایک رات شاہد سیکنڈ شو سے واپس آیا تو ابا کے ڈر سے دروازہ کھلوانے کی ہمت نہ پڑی۔ چناں چہ حسبِ عادت دیوار سے صحن میں کودا تو کسی نے اسے دبوچ لیا۔ "جلدی چلو میر صاحب کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ تمھیں دیکھنا چاہتے ہیں —— " یہ ابا تھے جو میر صاحب کی بیماری سے گھبرا کر اسے گالیاں دینا بھی بھول گئے۔

"اونہہ —— میں نہیں جاؤں گا۔" وہ چھوٹے بچوں کی طرح ٹھنکنے لگا —— "وہ پھر وہی اسٹیشن والی بات سب کے سامنے دہرائیں گے۔"

"کیا بکتا ہے —— ؟" ابا اسے قہر آلود نظروں سے گھورنے لگے —— "آج ان باتوں کا وقت ہے —— ؟ محلے کے سارے لوگوں کے سامنے انھوں نے کہا کہ میں شاہد کو دیکھنا چاہتا ہوں —— سب جل گئے، ہماری اتنی قدر افزائی سے —— " ماجد صاحب کی خوشی کے مارے باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ اب وہ میر صاحب کا یہ واقعہ زندگی بھر لوگوں کو سنا کے مرعوب کیا کریں گے۔

پھر وہ اڑیل ٹٹو کی طرح گھسٹتا ہوا وہاں گیا —— سارے شہر کی خلقت ان کے ہاں جمع تھی۔ عورتیں دوپٹوں سے منہ چھپائے سسکیاں لے رہی تھیں۔ مرد سُرخ آنکھوں کو پونچھ کر آہیں بھر رہے تھے اور حکیم صاحب میر صاحب کی نبض تھامے بیٹھے تھے۔ اتنے لوگوں کو دیکھ کر شاہد گھبرا گیا مگر سب یوں خوش ہو گئے جیسے میر صاحب کا مسیحا آن پہنچا ہو۔ حکیم صاحب نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر میر صاحب کو بیدار کیا ——

یہ دیکھ کر شاہد کے دل کو دھکا سا لگا۔ میر صاحب واقعی لبِ دم تھے۔ اتنے دنوں میں وہ پلنگ کو لگ کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے اپنی پتھرائی ہوئی آنکھیں شاہد پر گاڑ دیں اور ہاتھ اُٹھانا چاہا تو اُٹھ ہی نہ سکا۔

"شاہد بیٹا —— " شاہد کو ان کی بات سننے کے لئے ان کے لبوں پر جھک جانا پڑا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"وہ اس دن —— اسٹیشن پر —— تم —— تم —— "

شاہد کے دل پر جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ میر صاحب کے پیروں سے لپٹ جائے اور چلّا چلّا کے کہے کہ ہاں وہ میں تھا —— مگر شدید دکھ کے مارے اس کی آواز گھٹ گئی۔ اتنا سننے کے بعد ماجد صاحب آگے بڑھے۔ شاہد کو پیچھے ہٹا کر بولے ——

" میر صاحب، یہ کون سا موقعہ تھا اس وقت مجھے ذلیل کرنے کا میرا لڑکا کیسا ہی سہی۔ کسی کو کیا — : وہ بے حد غصہ میں تھے اس لئے انھوں نے شاہد کو زبردستی دروازے کے باہر ڈھکیل دیا۔ شاہد سپکا کر پیچھے گر پڑا۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ پھر وہ اُٹھ کر زور سے چلایا — ہاں وہ میں تھا — وہ میں تھا — لیکن میر صاحب کی منتظر نگاہیں اب اسے اقرار کرتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

پھر وہ اُٹھ کر بھاگا — اس کے پیچھے پیچھے میر صاحب کے گھر سے بلند ہوتے والی چیخیں دور تک آتی رہیں — لیکن وہ گلیوں میں چلاتا پھر رہا تھا — وہ میں تھا — وہ میں تھا —

شاہد کے کلیجے میں کسی نے ایک تلوار مار کے چھوڑ دی تھی۔

ہماری کتابیں

	قیمت
آج کل کی کہانیاں	تین روپے پچاس پیسے
بھارت کی لوک کتھائیں	ایک روپیہ
دیس بدیس کی لوک کتھائیں	۷۵ پیسے
اچھا شہری	ایک روپیہ
کیلنڈر کی اصلاح	۵۰ پیسے
ہندوستان کا دستور	ایک روپیہ
پنڈت نہرو سے بات چیت	دو روپے
ناپ تول کا میٹری نظام	۳۵ پیسے

نیشنل بک ٹرسٹ کی مطبوعات

ملکی یا تہذیب کا مستقبل	۷۵ پیسے
ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
سائنس کے چند پہلو	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
جوالا مکھی (ناول)	دو روپیہ ۲۵ پیسے
ہندوستانی ڈراما	تین روپے ۷۵ پیسے
دو شہروں کی کہانی (ناول)	۵ روپے

ڈاک خرچ کے لئے قیمت کا ۱۲½ فی صدی اور رجسٹری کے لئے ۵۵ پیسے مزید بھیجئے۔ ۲۵ روپے یا زائد کی کتابیں منگوانے سے ڈاک خرچ نہیں لیا جاتا۔

کتابیں مندرجہ ذیل پتے سے طلب کی جا سکتی ہیں

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱۔ اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اس شمارے کے لکھنے والے



کرشن چندر



علی عباس حسینی



اپندر ناتھ اشک



اختر اورینوی



کنہیا لال کپور



بلونت سنگھ







واجدہ تبسم



نریندر لوتھر



قیصر تمکین

اختر اورینوی

محشر

بلاوجہ طبیعت اداس نہیں تھی ۔ زندگی کی کون سی کل سیدھی تھی ۔ اور احساس تو سب سے بڑی اذیت ہے ۔ فن کار اپنی ذکاوتِ احساس سے نالاں تھا ۔ لوگ کہتے تھے وہ جذباتی ہے ۔ ہاں گداز دل بھی بُری بلا ہے ۔ اچھائی سے محبت مصیبت ہے ۔ بُرائی سے نفرت زحمت ہے ۔ جذباتی آدمی محبت و نفرت کے تورونار میں تپتا رہتا ہے ۔

وہ دن بھر کتابیں پڑھتا رہا اور سوچتا رہا تھا ۔ کوئی ایک کتاب ڈھنگ سے نہیں پڑھ رہا تھا ۔ بس کتابوں کو الٹ پلٹ رہا تھا ۔ چند صفحے اس کے پڑھے ، چند اس کے ۔ کبھی ٹالسٹائے کے ناول ، کبھی ہنری جیمز اور ماڈم کے ، کبھی پریم چند پیسٹر نک کے ۔ ابھی "آگ کا دریا" سامنے موجیں مار رہا ہے اور ابھی "گلستاں" لہلہا رہا ہے ۔ دن بھر وہ "بال جبریل" کے سہارے پرواز کرتا ، "الفز نو" جلتا ، فلک قمر کی سیر کرتا دوری سے گزر کر حضوری تک پہنچا ۔ مگر اسے اطمینان اور چین نصیب نہ ہوا ۔ وہ زمین پہ اُتر آیا اور شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھنے لگا ۔ اس کے المئے ۔ دل اور کڑھا کتابیں بند کر دیں اور پڑ کر سونے کی کوشش کرنے لگا ۔ نیند نہ آئی ۔ آج تو اسے بھوک پیاس بھی نہیں لگ رہی تھی ۔ اس کا ذہن بڑے کرب میں مبتلا تھا اور اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا ۔

فن کار کو دنیا کے حسن سے محبت تھی ۔ اپنے وطن اور اپنے ہمسایوں سے محبت تھی ۔ اُسے کبھی کبھی خدا سے بھی محبت سی ہونے لگتی تھی ۔ لیکن دنیا تو صد چہرہ تھی ۔ خوبصورت چہرے ۔ بدصورت چہرے اور وطن کا پیار ؟ کبھی گل و لالہ ، کبھی آہ و نالہ ! ہمسائے ؟ کبھی نسیم گلشن ، کبھی برق نشیمن ! اور نہ جانے خدا نے انسان کو آزاد کیوں پیدا کیا ۔ اور کیا آدمی بالکل آزاد ہے ؟ کاش جبر مستقل ہوتا یا اختیار کامل ۔ اور ابنِ آدم خیر و شر کے بھنور میں گرفتار نہ ہوتا ۔ خیر ہی خیر ہوتا ۔ حُسن ہی حُسن ہوتا !

فن کار اُٹھ بیٹھا ۔ سگریٹ جلائی اور بستر پہ بیٹھا بیٹھا دھوئیں کے مرغولے بناتا رہا ۔ یک شیلف سے فانی کی "باقیات" نکالی اور پڑھنے لگا ۔ . . . . خواب ہے دیوانے کا —— ! بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے ! رکّے نے تو نوحے لکھے تھے ۔ ہم سبھوں کو صرف نوحے لکھنے چاہئیں ۔ مرثیے ! صرف مرثیے ! آسماں راحق بود گر خوں بہ بارد بر زمیں ! . . . . فن کار اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا ۔

جب غم ناقابلِ برداشت ہو گیا تو وہ رونے لگا ۔ رونا غم کا تیکھا پن نہیں ، ہلکا پن ہے ۔ اس نے سوچا کیا وہ اتھاہ دُکھ کا اظہار بھی کر سکتا ہے ؟ کیا دکھ کی شدت کا اظہار ہو بھی سکتا ہے ؟ خموشی گفتگو ہے ، بے زبانی ہے زباں میری !

فن کار نے میز کی دراز میں رکھے ہوئے کاجو نکالے اور انھیں بڑے چاؤ سے کھانے لگا ۔ جیسے زندگی کا سارا حسن ، سارا رس ، سارا لطف صرف کاجو کھانے میں ہے ۔ ساری نیکی صرف

کا جو کھانے میں ہے۔ وہ کھاتا رہا۔ پھر اُسے پیاس لگی۔ وہ غسل خانے میں چلا گیا اور وہاں ڈکڈکا کے اوک سے خوب پانی پیا اور اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ اس نے دریچے کھول دئے۔ پتہ چلا شام ہو چکی ہے۔ مگر وہ باہر نہ نکلا۔ بجلی کی روشنی گُل کر دی۔ اب وہ پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ شام کے دھندلکے میں بیٹھا سوچتا رہا۔ بے ربط، جالوں سے اُلجھے ہوئے جالے۔ وہ اچانک ایک شعر گنگناتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا ——

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل
یہی ہے فصلِ بہاری یہی ہے بادِ مراد

فن کار نے روشنی جلائی اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ کرشن چندر؟ ہم وحشی ہیں! نہیں ہم تو نہایت مہذب ہیں۔ نہا... یت مہذّب! نہیں، ...... "اپنے دُکھ مجھے دے دو!" 'موذیل' کی ہتک نہ کرو۔ زندگی کو 'موتری' نہ بناؤ۔ "کالی شلوار" "ٹیڑھی لکیر!" اتنے سارے کردار، اتنے واقعات! خالق و مخلوق، فن کار اور اس کا فن! فن کار نے ساری کتابیں بند کر دیں اور اپنے افسانوں کے مجموعے پہلی بار پڑھنے کے لئے کھولے۔ اُسے اپنی تخلیقات سے اچانک بڑی کشش محسوس ہوئی۔ وہ نہ جانے کب تک انھیں پڑھتا رہا۔ اور اسی عالم میں شاید سو گیا، شاید جاگ گیا —— ! اور اس نے پایا کہ وہ صاحب عرش و کُرسی ہے۔ اس نے 'کُن' کہا اور 'فیکون' کی جلوہ گری ہوئی۔ اس کا کمرہ عالم کون و فساد بن گیا۔ اس کی کہانیوں کے مجموعے دُخانی ہیولوں کی طرح رقص کرنے لگے۔ ان سے بہتیرے کُرے بن گئے اور فضائے بسیط میں ناچنے لگے۔ اُن کُروں پر جن و انس کی آبادیاں پیدا ہوئیں۔ انواع و اصناف نمودار ہوئیں۔ طرح طرح کی مخلوقات نے جنم لیا۔ حیات اور معاشرہ کے سوتے پھوٹ پڑے۔ ایک ایک کُرہ اس کے سامنے رقص کناں آیا۔ اس کی مخلوقات کی حاضری ہوئی۔ ایک ایک فرد کی پیشی ہوئی۔ اس نے خالق ہونے کا فخر محسوس کیا۔ اس کے ذہن کی ساری کہانیاں جی اٹھی تھیں۔ ساری شخصیتیں بیدار ہو گئی تھیں۔ "منظر و پس منظر" جاگ چلے تھے۔ اس کی تخلیق کی بوقلمونی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ زندگی کے سارے رُخ حقیقت کا رُخ دھار چکے تھے۔ اس کی "کلیاں اور کانٹے"، اس کی تعمیر و شکست" "سیمنٹ اور ڈائنامیٹ"، "حیات کی روشن راہیں" اور "پہیلیاں"، اس کی "انار کلی" اور "بھول بھلیاں" سب ظاہر ہو گئی تھیں۔ افراد و اقوام کی "حسرتِ تعمیر" کا قصہ ذی حیات بن گیا۔ مخلوقات کے عروج و زوال کی داستان جاندار ہو گئی۔ اس کی "پھلیاں اور بالِ جبریل" مرتعش تھے۔ "سپنوں کے دیس" جیتی جاگتی تاریخ بن گئے۔ عدم معدوم تھا اور وجود حشر ساماں۔

اس کی تخلیق کے کُرے رقص کرتے رہے اور فن کار پندارِ خالقیت میں محو ہو گیا۔ اس کے دل میں اپنی مخلوقات کی محبّت کا ایک بے پایاں جوش اُٹھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ ان سب کو اپنے قریب جمع کرے۔ اس نے اپنا داہنا ہاتھ پھیلایا اور ہر کُرے سے تمام مخلوقات کو سمیٹ کر اپنے بائیں کفِ دست پر اکٹھا کر لیا۔ ایک بے کراں محشرِ تخلیق سامنے تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ لطیف و خبیر اور سمیع و بصیر ہے۔ اس کی پیدا کی ہوئی ایک ایک ہستی مکمّل طور پر اس کے پیشِ نظر ہے، اس کی مخلوقات فن اس سے سرگرمِ تکلّم ہیں، اپنی انفرادیت اور ماحول کے ساتھ —— !

ٹائپسٹ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ہے۔ داڑھی منڈی ہوئی مگر حجامت کو ترسی ہوئی۔ سانولا رنگ، چوڑی ہڈی مگر ڈھیلا ڈھانچہ، چہرے پر شکنیں، ماتھے پر بل، ناک پر ایک پُرانی سی عینک جس کی ٹوٹی ہوئی کمانیوں کو دھاگے سے جوڑا گیا تھا —— اس کا مفلوک الحال رین بسیرا، بھوکی بیوی، فاقہ زدہ خاندان، بیمار دم توڑتا بچّہ، سود خوار قرض خواہ اور موت کا منڈلاتا ہوا سایہ۔

ٹائپسٹ نے کہا —— "ہائے میرے بچّے!" اور پھر فن کار کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ میرے خالق! 'ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے'!

فن کار خاموش تھا۔ ایک اور کردار اُبھرا ——

ماما دھیا۔ اس کا مستحکم عقیدہ تھا کہ دنیا کو اس کی بہت ضرورت ہے۔ وہ اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لئے قریباً گھر کی ہر بات میں دخل دینا چاہتی اور دخل دیتی۔ ایک آنکھ میں موتیا بند اور دوسری کمزور۔ اسّی سال سے اوپر کی ہے۔ اس نے گھر کے سارے ملازمین کے خلاف محاذ قائم کر رکھا ہے۔

'شبرتیا آج تک بھر پیٹ کھانا نا نکالس۔ اور سلمتا کوڑھی دن بھر ہمرے تنگ کرتا رہے ہے۔ گھر میں پلّو کے طرح آدمین اُپلائے چلین۔ مرئیو نہ جائیں سب!.....'

اور شبرتیا باورچی گرجا ——'بڑھیا کھردار! ہمرے سب کو الکو سامت کر!'

ماما دھیا کی بے تابانہ چیخ سُنی گئی۔

'ہائے ہائے! سب پھیک پھاک دہس۔ ہیجا ہو سلمتا کو ایلیگ میں مرے!...... اب کا بابو! پرتیا کے باوا ای سیسی دہس تھا!'

سلمتا فن کار کے کھٹ دست پر بالکل گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔ کاٹو تو لہو نہیں۔ اور بڑھیا کے سرمہ کی شیشی چکنا چور ہو چکی تھی۔

بڑھیا نے فن کار سے پوچھا —— 'تم میرے مرے ہوئے کھاوند کا بھید کا ہے لکھو لیو؟' ——

—— اور تبسم، ایک دل دوز نوکھا تبسم، پُر درد ہنسی، مایوس، متر حم۔ وہ ایک مزدور ہے۔ عمر رسیدہ...... اس کا سارا جسم عریاں ہے، صرف کمر میں ایک میلی سی پھٹی ہوئی لنگوٹی ہے...... بولا...... 'حجور، کوئی کام!......... سرکار جو کام کا حکم ہو۔ کام مل جاتا تو پیٹ پالنے کا سہارا ہو جاتا۔ بچّے سب بھوکھا ہے۔ کوئی کام نہیں ملتا.......' پھر بولا —— "حجور ہم کو بھوکھا کُتّا کا ہے بنا دیا؟"

—— تو بہار ہراتی ہوئی رحمو کے ساتھ آگے بڑھی۔ بولی: 'کوئی سفید پوش مجھے ملتا۔ رحمو قسمت میں کیوں ٹھوک دیا گیا۔' اور شکور بولا۔ 'آنکھ کا اندھا، اکل کا پورا، تیری جورو تو منشی کی رکھنی ہے۔ سب کے آگے تو آ چکی ہے۔ پتر یا سے بھی بدتر ہے۔' اور پھر رحمو نے فریاد کی: 'ہم کو بے بس کا ہے لا بنایا؟'

ایک پلّے کے بھونکنے کی آواز نے فن کار کی توجہ اپنی جانب منعطف کرائی۔ ایک بھکارن پلّے کے پاس پہنچی۔ اسے اپنے میلے آنچل کی پوٹری سے نکال نکال کر ہڈیاں اور سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے کھلاتی رہی۔ جب بھکارن پلّے کو کھلا چکی تو اس نے خود کچھ روٹی کے کنارے کھائے اور اس کے بعد پلّے کو کھونٹے سے کھول کر گود میں لے لیا۔ اور بجھی ہوئی پیال پر جا کر اسے پہلو میں لئے لیٹ گئی۔ بھکارن کچھ لوریاں سی گاتی جا رہی تھی.......

جینے کے سہارے! بھکارن اپنے خالق سے ہم کلام ہوئی۔ 'لوریاں نہیں، گھٹے ہوئے نالے ہیں، جنھیں تو ناحق نغمہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔'

اور پلّے نے شکوہ کیا۔ 'پلّہ ہی بنایا تھا مجھے تو ایک بھکارن کا پالتو نہ بنایا ہوتا۔'

—— بی، خرگوش اور ناصر شاکرہ کی جذباتی زندگی میں داخل ہو گئے۔ شاکرہ چاہتی، ناصر بھی شوخ چنچل ہوتا اور اچھی اچھی باتیں کرتا۔ مگر وہ تو ایک بے وقوف سا، مضمحل، کم گو لڑکا تھا۔ اور شاکرہ کو موٹی، گول مٹول، باتونی، نصیحت افزا، کچر کچر پان چبانے والی خالہ جی سے پالا پڑا تھا۔ اس نے فن کار سے کہا —— 'کاش ناصر کی آنکھوں میں کچھ زندگی کے آثار ہوتے!'

—— شکور دادا اپنی مخصوص بذلہ سنجانہ ترنگ میں گانے لگے "نیم شبے سر قو اتو چہ گفتی، چہ گفتی، چہ گفتی رے! نیم شبوے...... ! لیکن وہ بہت جلد تھک گئے۔ شکور دادا نے اپنی ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی ساری حسرتیں مجتمع کر کے نہایت پُرسوز گلوگیر لہجے میں کہا —— "بڑے فن کار بنتے ہو! رشید بیٹیا سے اتنا بھی نہ کہلوا سکیو کہ اس کو کتنا پر دیھی... ٹنٹ... فنڈ کا روپیہ ملا۔ ہائے کھیت خرید وا کے اُسے امیر بھی نہ بنوالیو!"

اُٹنگ پاجامہ، پھٹی بنیاین، کندھے جھکے ہوئے، سر نہوڑائے، آنکھیں زمین دوز، پر آنکھیں ہوں بھی۔ وہ تو گویا

اندھا ہے۔ شمشیر وا نے آزردہ ہو کر سوچا، کاش اس کی آنکھیں ہوتیں تو وہ بھی دنیا کے تماشے دیکھتا۔ "ہاں یار! بڑا مال ہے یہ میرے پھر بھیا" شمشیر وا نے شرما کے کہا۔ "سات پشت حرامجادہ! کچھ پیسے ہے کی پھر دو جان ہم پڑھا سکت ہیں۔ منہ تو دیکھو اپنا مرتی چوہا! مرنے کا بنا!" اور شمشیر وا نے فن کار سے بھی یہ شکوہ کیا —

کیا طاقتم کو مرے عشق کا چرچا کر کے
خود بھی رسوا ہوئے آخر مجھے رسوا کر کے

— اور وہ تعداد میں تو تھیں، گوری، سانولی، گوارا اور ناگوار۔ بعض ان میں دل کش کہی جا سکتی تھیں مگر خوب صورت کوئی نہیں۔ سبھوں نے ایک ساتھ بڑھ کے فریاد کی۔ فن کار بابو! آپ نے ہمیں بس ایک گڑیا کیوں بنایا؟ اور وہ بھی خوب صورت نہیں!"

— اور گوپال نے فریاد کی: "مجھے تو موت ہی آئی شباب کے بدلے!"

اور منگتی رام مارواڑی آگے بڑھا۔ بہت ہی موٹا تازہ تین من اس کا وزن تھا۔ یہ غریب ساڑھے تین سال سینا ٹوریم میں رہ کر بغیر شفایاب ہوئے واپس آگیا تھا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں بڑے بڑے غار تھے۔ بولا — "تم جھوٹے ہو فن کار، جھوٹے یا جانب دار، میرے لئے کسی نرس سے تم نے لب و رخسار ارزاں نہ کروائے۔ میری خاطر تو کسی دیوی نے رس گھول کر نہیں پیا، نہ محبت کے امرت میں ملا کر، نہ ہوس کی آگ میں بجھا کر۔ بے ایمان!"

اور کرن پاگلوں کی طرح آگے بڑھا، چیختا ہوا — "زندگی نہ خدا کے پاس ہے، نہ شیطان کے پاس، نہ کسی اور خالق کے پاس۔ ان سبھوں نے مل کر مخلوقات کے دل و جگر خون کئے ہیں اور بس! خون! خون! خون! خو.....ن!"

فن کار نے گھبرا کر اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی بند کر لی اور آہ و بکا کا ایک شور محشر اٹھا۔ سارے کردار چیخنے لگے۔ اس نے اپنی مٹھی کھول دی۔ اس کے کف دست پر دیر تک شور مچتا رہا۔ آخر سکون ہوا اور — ایک اور چہرہ فن کار کے مقابل میں آیا۔ "راشدہ کی زیست معلق سی تھی، بے بنیاد۔ کوئی وسیلہ ایسا نہیں تھا جو حیات کے مختلف حصوں میں ربط، تسلسل اور موزونیت پیدا کر دے......" راشدہ نے بل کر فن کار سے پوچھا — "مجھے رومانی بنایا۔ میرے رومانوں کو مٹی میں ملایا اور اس پر ستم یہ کہ میرے سارے راز بھی افشا کر ڈالے۔ واہ!" —

— "پیشانی بالکل آپ کی طرح ہو گی اور آنکھیں اور بھویں۔ پر خدا نہ کرے کان آپ جیسے ہوں، ورنہ بالکل خرگوش معلوم ہو گا۔" — پلٹ کر بیوی میاں دونوں نے فن کار سے کہا — "آپ نے تو ہمیں نام بھی نہیں عنایت فرمائے۔ تو پھر بے نام لوگوں کو آپ اولاد کیوں بخشتے! آپ کی تخلیق میں درد و گداز کیسے پیدا ہوتا بھلا! ہم تو آپ کے فن پر قربان ہوئے بشکریہ!"

اور ایک ہجوم فن کار کے کف دست پر مظاہرہ کرنے لگا۔ نعرے لگنے لگے۔ احتجاجی شور و غل پیدا ہوا اور حسرت تعمیر و ناتمامئ تخلیق کی لامتناہی شکایتیں پیش کرنے والا کرداروں کا ایک وفد فن کار کی تلہٹی کے ٹیلے پار کرتا ہوا اس کی کلائی تک بڑھ آیا۔

— بوس محبوب اس وفد کا لیڈر تھا، بولا — "بھائی جان! آپ فن کار نہیں، بدمعاش اور مجرم ہیں۔ مجھے پاگل ہی بنا دینا تھا تو میرے خوابوں کو حقیقت تو بن جانے دیتے۔ اگر میں برلا، ڈالمیا یا جمشید جی بن جاتا تو آپ کا فن زیادہ دل چسپ ہو جاتا۔ آپ مردم آزار بھی ہیں اور احمق بھی! قصہ کی روح رواں کو آپ نے پاگل بنا دیا۔ واہ! یہ خوب! ترا گاؤدی ہے رے! تہ ہوئی قسمت! کم از کم "فسانۂ آزاد" تو پڑھ دینا چاہئے تھا تجھے۔ میں آزاد سے بڑا ہیرو بن سکتا تھا اور رے کے تو نے مجھے کانکے پہنچا دیا۔ اب تو خود کانکے کے قابل ہے...."

— اور ایسا لگا کہ وفد کے سارے ارکان نے ایک ساتھ چیخ کر کہا — "ہم سب کو ٹیڑھا میڑھا کیوں بنایا؟ ڈھنگ کی ایک شخصیت بھی نہ بنائی۔ بنانا نہ آئے تو بگاڑو کیوں؟...."

پیارے پنڈت، سرور، سردار، اور سر محبوب، جمیل انور، بیگم شمشیر الدولہ، کپتان ڈیوڈ امام، عذرا شانتی، میر گھوسی،

دیوان سنگھ وغیرہ وغیرہ کے چہرے ایک دوسرے سے گڈمڈ ہوتے ہے تھے۔ پس منظر میں سلمی سوگیتی کے پہلو میں منظر کا ڈول ابھرا، اس کے تھرتھراتے ہوئے لب اور شرمیلی آنکھیں۔ آہ سرد کھینچ کر بولا — "مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی!" —

اچانک فن کار کے کفِ دست پر تاریک رات چھا گئی اور یوس محبوب کے سامنے ایک سیاہ گداز جسم اپنی فطری صحرائی صحت مندی کی لہک لئے ہوئے چمکا.........'

آدی باسی لڑکی بولی — "مالک یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے!" اور ایک شور قیامت برپا ہوا۔ چاروں طرف آدی باسی چہرے ابھرے۔ ٹنگا ایٹری اور ان گنت آدی باسی مزدور اور کسان۔ یہ سب کردار اپنے تیر کمان لئے فن کار کے سینہ کی طرف دوڑ پڑے اور جھاڑ کھنڈی بولیوں میں چیخ چیخ کر بولنے لگے — "فن کار! اپنی دنیائے تخلیق میں تم نے آدی باسیوں کو اہم جگہ کیوں نہ دی؟ ہم سب صرف بھرتی کے کردار بنائے گئے۔ دنیا تو تم نے یوس محبوب، بیگم شمشیۃ الدولہ اور سلمی سوگیتی کی بنا ڈالی! جھاڑ کھنڈ زندہ باد! فن کار مردہ باد!" — اس وحشی جلوس کے پیچھے بھٹکتا ہوا سکھ جھوڑ "انارکلی" اور "بھول بھلیاں" کی پتریا کے ساتھ چلا آرہا تھا۔ وہ سائیکل پکڑے ہوئے تھا اور اس کے پیچھے اور بہت سے کردار تھے۔ ایک اور شور مچا — "ہم کو شکایت کا موقعہ بھی نہ ملا! ہم شکوہ بھی نہ کر سکے! انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد!"

فن کار نے بڑے رعب داب کے ساتھ بہ آواز بلند کہا — "خاموش!" اور اس کے بائیں کف دست پر سناٹا چھا گیا —

فن کار نے بڑے وقار سے کہا — "اے کردارو! اپنے خالق کا احسان تخلیق بھول گئے۔ بڑے عجلت پسند اور ناشکرے ہو۔ میں تمہیں عدم سے وجود میں لایا۔ تم بے نام ونشان تھے۔ میں نے تمہیں شخصیت بخشی اور تمہاری شخصیت کو انفرادیت عطا کی اور پھر تمہیں قابلِ ذکر بنایا۔ میں نے تمہیں آزادی اور لچک داری سے نوازا۔ مگر تم عقل، تدبر اور فکر سے کام نہیں لیتے۔ تمہارے اندر یہ سب صلاحیتیں موجود ہیں۔ مگر تم صرف اعتراض کرتے ہو، شکوہ وشکایت پر اتر آتے ہو۔ کیسا انقلاب؟ ذہن وفکر ہے کہ خلقت خود خالق کا حساب لینے پر تلی گئی ہے۔ جمہور آمر وحاکم کا محاسبہ کر رہی ہے اور آمر بھی وہ جو تمہارا خالق اور تمہاری پرورش وتربیت کرنے والی ہستی ہے۔ سنو، غور کرو اور سمجھو۔ خالق کو یہ حق ہے کہ وہ جیسا چاہے بنائے۔ فن کار تخلیق کی جدت وبداعت میں آزاد ہے۔ طربیہ کردار ہو یا المیہ، برا ہو یا بھلا۔ فن میں نیرنگ و تنوع کے بغیر نہ حسن ہے، نہ تاثیر۔ آزاد فن کار نے تمہیں بھی آزاد وممتاز پیدا کیا۔ کاش تم احسان مانتے!"

"باز آئے ہم آزادی وامتیاز سے۔ اس کی قیمت بہت گراں ادا کرنی پڑی، ناتمامی، محرومی، دردمندی، دل ریشی، مظلومی......" مجمع فن کار کے کفِ دست پر جوش سے بولتا رہا اور فن کار اپنی مخلوق سے مایوس ہونے لگا۔ وہ یاس وغمگینی میں مبتلا ہو گیا۔ کیا وہ اپنے فن کی توانائی کی تخلیق پھر سے کرے؟ کیا وہ اپنی تجدید آپ کرے؟ — اس نے پھر ایک بار اپنی مخلوق کو سمجھانا چاہا — "یہی سچی بات ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔ یہی حق ہے کہ میں نے اپنے علم وبصیرت کے مطابق تمہارے وجودوں میں بڑے امکانات پیدا کئے۔ فن کار کی قوت اختراع اور اس کا بے ساختہ پن ایک لطیف وپرحکمت مقصد کے ساتھ ہم آہنگ ہوا اور تم پیدا کئے گئے۔ تمہارا وجود عبث نہیں۔ ابدیت تمہارا انعام ہے۔ اور فانی انسانوں کو حساس، ذکی اور دردمند اور ذہین بنانا تمہارا کام۔ ان کے اندر انقلاب فکر ونظر برپا کرنا تمہاری تخلیق کا مقصد۔ تم اپنے خالق کی نعمتوں کا کب تک انتظار کرو گے؟"

میدانِ حشر میں پھر ایک شور مچا — "یہ جبر تخلیق ہے!...... یہ خود بینی ہے!...... ڈبو دیا مجھ کو ہونے نے!

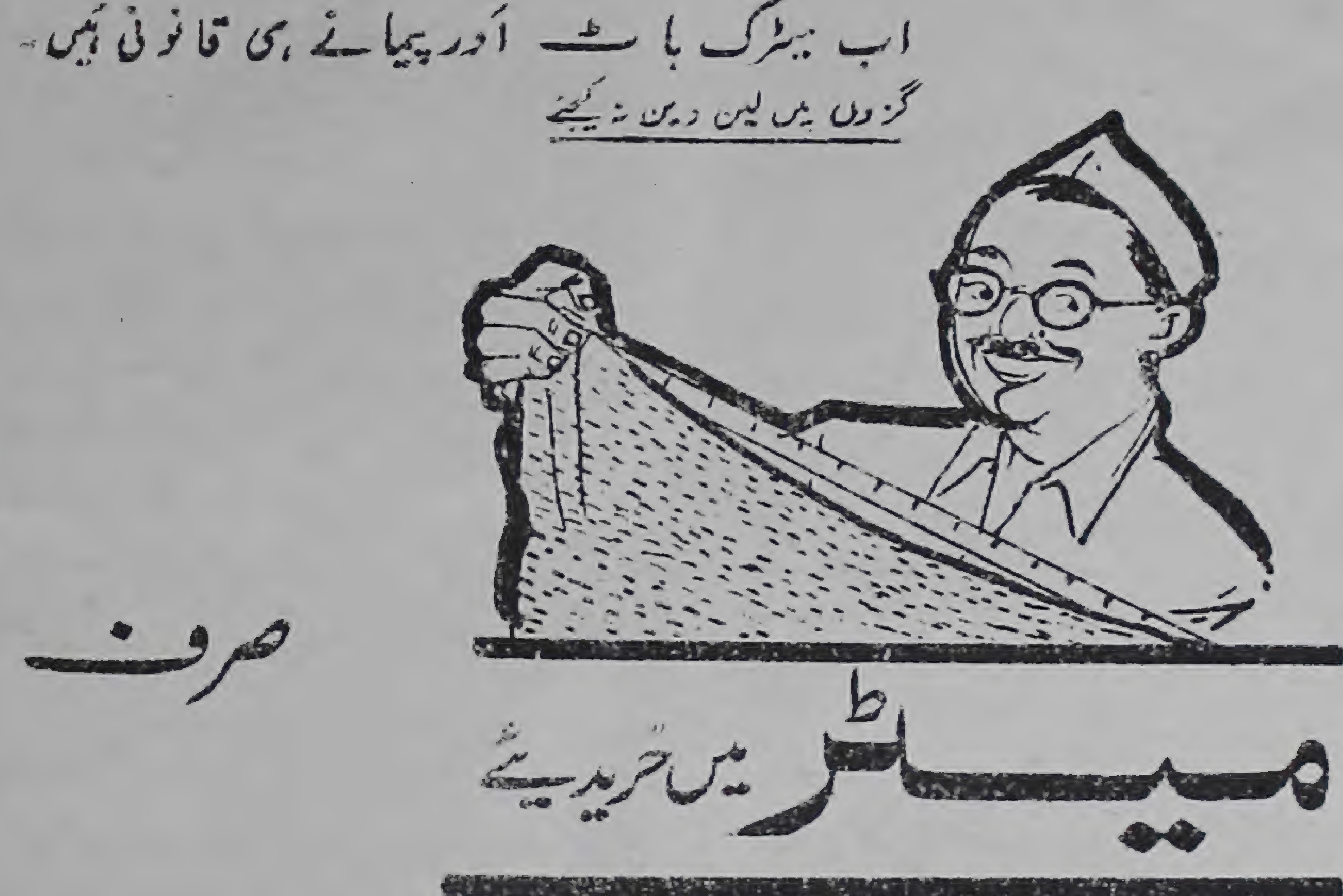
...... مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو؟ .... جہاں تیرا ہے یا میرا؟ ...... انسانوں کی کج روی سے ہمیں کیا؟ .... قصۂ آدم کو ہمارا لہو کیوں رنگین بنائے؟ ....."

فن کار سوچنے لگا — "تخلیق دردِ سر نہیں، اذیت روح، دردِ ذہن و کربِ دل ہے۔ اے میری مخلوق تیرا دردِ جگر میرے غم کے سامنے ہیچ ہے!"

اور فن کار کی بے قرار روح کے اندر ایک آواز گونجی — تم نے سپنوں کا دیس پیدا کیا اور خدا سازی پر تُل گئے۔ تم کائنات کا راز جاننا چاہتے تھے اور تمہیں حسرت کے سوا کچھ نہ ملا۔ بہکنے والے اوہام! تم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ امیبا ہو یا جیلی فش، مینڈک، ہو یا میمون، گوریلا ہو یا ڈارون۔ تم اپنی ذہنی روح کی محض ایک کیچلی ہو۔ تم بالِ جبریل بننے کی لاحاصل کوشش کر رہے ہو۔ تم مشیّت کی بگڑی ہوئی تصویر ہو! ملعون!"

فن کار کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس پر انتہائی یاس و حسرت طاری تھی۔ دل جیسے آخری سانس لے رہا ہو۔ وجود جیسے فنا ہو رہا ہو۔ دور کہیں فائر انجن خطرے کی گھنٹیاں بجاتا ہوا تیز جا رہا تھا۔ شہر میں آتشِ زندگی کی وبا آئی ہوئی تھی، زندگی جل رہی تھی۔ انسانیت کے ساز و برگ خاکستر ہو رہے تھے۔ اس کے لاشعور سے ایک مصرع اُبھرا

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک!



کنہیا لال کپور

شاطر صاحب

اگر کوئی شخص آپ کو اس مشاعرے کے اختتام پر ملے جس کے آپ سٹیج سیکرٹری تھے اور آپ کو داد دینے کی بجائے یہ شکوہ زبان پر لائے کہ آپ نے نہایت بے ہودہ شعراء کو پڑھوایا اور خواہ مخواہ سامعین کا وقت ضائع کیا تو یقیناً آپ حیران ہوں گے، خاص کر جب آپ کی اس شخص سے راہ و رسم تک نہ ہو۔ لیکن اسی صورتِ حال سے مجھے دوچار ہونا پڑا، جب اس اجنبی سے میری ملاقات ہوئی جو ایک کی بجائے تین تخلص کرتا تھا اور جناب بھڑک دہلوی کا شاگرد تھا۔ میں نے اس سے یہ کہہ کر جان چھڑانا چاہی کہ شعراء کو مدعو کرنے والے اور حضرت تھے خاکسار نے تو صرف سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دئے تھے۔ لیکن وہ مجھے معاف کرنے پر آمادہ نظر نہ آیا۔ کہنے لگا۔ "اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو آپ کو ان جہلا کی تعریف کرنے کا کیا حق تھا۔ غضب خدا کا، آپ انھیں شاعر کہتے ہیں میں تو تک بند بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔"

"آپ کی تعریف؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"مجھے شاطر جنڈیالوی کہتے ہیں۔ شاطر کے علاوہ آپ مجھے برباد یا عذاب جنڈیالوی بھی کہہ سکتے ہیں۔"

"تو گویا آپ کے تین تخلص ہیں۔"

"جی ہاں، اور یہ اس لیے کہ بندہ بیک وقت رومانی، مزاحیہ اور ترقی پسند شاعر ہے۔"

"آپ کا شغل؟"

"خاکسار ایک مقامی اسکول میں کلرک ہے۔"

"بہت مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔"

"اجی صاحب رسمی باتیں رہنے دیجئے۔ میں دراصل یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ آئندہ جب کبھی مشاعرے کا اہتمام کریں خاکسار کو فراموش نہ کریں، خاص کر جب وہ جناب بھڑک دہلوی کا شاگرد ہے۔"

چند دنوں کے بعد شاطر صاحب میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ ان کی گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ جناب بھڑک دہلوی اور اپنے علاوہ کسی کو شاعر نہیں مانتے اور بھڑک صاحب کو بھی اس لیے کہ وہ ان کے استاد تھے۔ اتفاق سے میری میز پر ایک مشہور اردو رسالے کا سالنامہ پڑا تھا۔ شاطر صاحب اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ ادھر ادھر سے دیکھنے کے بعد انھوں نے بڑی حقارت سے سالنامے کو زمین پر پٹکتے ہوئے کہا۔ "تف! یہ خرافات ہے یا شاعری۔ ایک بھی کام کی غزل نہیں۔ بخدا ان سے بہتر غزلیں تو بندہ اچکن کے بٹن بند کرتے وقت کہہ لیتا ہے۔ خدا جانے اس عہد میں شاعروں کو کیا ہوا۔"

میں نے سوال کیا۔ "آپ کون سے رسالے کو اپنا کلام بھجواتے ہیں؟"

منہ بنا کر کہنے لگے۔ "کسی رسالے کو بھجوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب سخن شناس ہی لد گئے تو بھینس کے آگے بین بجانے سے فائدہ؟ شروع شروع میں ایک رسالے کی سرپرستی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ غزل بھجوائی۔ ایڈیٹر صاحب نے اس معذرت کے ساتھ

واپس کردی کہ آپ کا کلام کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ سبحان اللہ! یہ ہے پڑھے لکھوں کی سخن فہمی کا عالم۔ یوں نہیں کہتے کہ بالکل گنوار ہیں اس لیے ہمیں معذور سمجھا جائے۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں۔ اچھا کوئی اپنا شعر سنائیے۔"

کیسا شعر سنیں گے آپ۔ رومانی، مزاحیہ یا ترقی پسند؟"

"مزاحیہ۔"

بہتر۔ تو سماعت فرمائیے۔ عرض کیا ہے:

شاطر تمھارے عشق نے سب بل دئے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

شعر سن کر مجھ پر سکتے کا عالم طاری ہوگیا۔ شاطر صاحب کو یہ ناگوار گزرا فرمانے لگے۔ "آپ نے داد نہیں دی۔"

میں نے عرض کیا۔ "معاف کیجیے شاطر صاحب، یہ شعر تو علامہ اقبال کا ہے۔"

شاطر صاحب نے بالکل نہ گھبراتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ پہلے شخص نہیں ہیں جنھوں نے یہ اعتراض کیا ہے۔ دراصل آپ کو اس شعر کا پس منظر معلوم نہیں۔ یہ شعر میں نے ایک مشاعرے میں پڑھا تھا۔ وہاں اتفاق سے علامہ اقبال بھی موجود تھے۔ انھیں اتنا پسند آیا کہ آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے۔ "کاش آپ میرا سارا دیوان لے لیں اور یہ شعر مجھے دے دیں۔ میں نے عرض کیا "آپ کا دیوان آپ کو مبارک۔ آپ بخوبی یہ شعر لے سکتے ہیں لیکن اس پر کاپی رائٹ میرا رہے گا۔"

"واقعی آپ نے بڑی فراخدلی دکھائی، شاطر صاحب۔"

"جی ہاں۔ اصل میں جو شخص فراخ دل نہیں وہ کبھی بڑا شاعر نہیں ہوسکتا۔ ہاں اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہوگیا۔ اسی مشاعرے میں علامہ آرزو بھی شرکت فرما رہے تھے۔ انھوں نے درخواست کی "چونکہ اس شعر کے دوسرے مصرع (مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی) میں میرا تخلص اتفاق سے آگیا ہے اس لیے یہ مصرع مجھے عنایت کریں لیکن میں نے ان سے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔ "جب میں سارا شعر اقبال کو دے چکا ہوں تو اس کا ایک مصرع آپ کو کیسے دے سکتا ہوں۔"

"بہت خوب۔ اچھا کوئی اور شعر سنائیے۔"

"ایک رومانی شعر سنیئے۔"

"ارشاد۔"

"عشق نے شاطر نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے"

"دوبارہ معاف کیجئے شاطر صاحب، لیکن یہ شعر تو...."

"آپ کا مطلب ہے غالب کا ہے۔"

"جی ہاں۔"

"آپ کو بھی مغالطہ ہوا۔ لیکن اس میں آپ کا قصور نہیں۔ اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ جس مشاعرے میں پڑھا گیا۔ وہاں صاحب صدر نے اس کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا "ایسا شعر تو غالب ہی کہہ سکتا ہے"۔ اتفاق سے سامعین میں ایک کاتب بھی موجود تھا کہ جو انھیں دنوں 'دیوانِ غالب' کی کتابت کر رہا تھا۔ اس نے ازراہِ عقیدت یہ شعر بھی غالب سے منسوب کردیا۔ ورنہ اہلِ دل جانتے ہیں کہ یہ شعر غالب کا نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ آپ بھی جانتے ہوں گے غالب نے آموں کے علاوہ کسی چیز سے عشق نہیں کیا اور کوئی شخص لذیذ آم کھا کر نکما نہیں ہوسکتا۔"

ایک دن یونہی بازار میں شاطر صاحب کے ساتھ تصادم ہو گیا۔ انھوں نے کہا۔ "میں آپ کی ہی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔"

"فرمائیے۔"

"لکھنؤ میں آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا ہے منتظمین نے دعوت نامہ بھجوایا ہے۔ آپ کے خیال میں مجھے وہاں جانا چاہیئے یا نہیں۔"

"ضرور جائیے۔ بھلا اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔"

"لیکن معاوضہ بہت قلیل ہے۔ صرف پانچ سو روپے اور فرسٹ کلاس کا کرایہ۔"

"یہ قلیل تو نہیں۔"

"کیا کہا۔ قلیل نہیں۔" شاطر صاحب نے گرج کر کہا —— "بھڑک دہلوی کے اکلوتے شاگرد کے لیے صرف پانچ سو روپے۔ یہ میری ہی نہیں بھڑک صاحب کی بھی توہین ہے۔"

" تو مت جائیے ۔"

" لیکن آج کل ہاتھ ذرا تنگ ہے ۔ سوچتا ہوں چلا ہی جاؤں ۔"

" تو چلے جائیے ۔"

آپ کا مطلب ہے اس توہین کے ساتھ سمجھوتہ کر لوں ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ بھڑک صاحب نے وصیت کی تھی کہ صاحبزادے ذلیل سے ذلیل حرکت کا ارتکاب کرنا لیکن قلیل معاوضہ قبول نہ کرنا ۔"

" پھر تو آپ کو ہرگز نہیں جانا چاہیئے ۔"

" ہاں یہ ٹھیک ہے ۔ میں انھیں آج ہی تار بھجوا دیتا ہوں کہ مجھے معذور سمجھا جائے ۔"

شاطر صاحب کا اس مشاعرے میں شرکت نہ کرنے کا بڑا شہرہ ہوا ۔ سارے شہر میں ان کی دھوم مچ گئی ۔ ہر شخص نے ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے محسوس کیا کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی نازک مزاج شاعر موجود ہیں ۔ ایک رئیس کو جب پتہ چلا تو اس نے شاطر صاحب کو چائے پر مدعو کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان کے لڑکے کا (جس کی شادی مستقبل قریب میں ہو رہی تھی) سہرا لکھیں ۔ کافی بحث و تکرار کے بعد شاطر صاحب نے ان کی فرمائش منظور کر لی ۔ ساڑھے سات سو روپیہ معاوضہ قرار پایا ۔

دلدادگانِ شعر و سخن بڑے اشتیاق سے شاطر صاحب کے سہرے کا انتظار کرنے لگے ۔ آخر وہ دن بھی آ پہنچا جب شاطر صاحب کو سہرا پڑھنا تھا ۔ وہ ایک نئی شیروانی میں ملبوس ہو کر سٹیج پر تشریف لائے ۔

سامعین کی طرف مسکرا کر دیکھا ۔ دو ایک بار کھانسے اور رئیس صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ۔ " حضور عرض کرتا ہوں ---

" سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا "

شاطر صاحب نے ابھی دو شعر ہی پڑھے تھے کہ سامعین میں سے کسی نوجوان نے پکار کر کہا " اجی صاحب ! یہ کیا مذاق ہے غالب کا سہرا آپ اپنے نام سے پڑھ رہے ہیں ۔"

شاطر صاحب نے چلا کر جواب دیا --- " کون کہتا ہے یہ سہرا غالب کا ہے ۔"

" میں کہتا ہوں " اس نوجوان نے چیلنج کرتے ہوئے کہا ۔

" ثبوت ؟ " شاطر صاحب نے مطالبہ کیا ۔

" یہ رہا ثبوت ؟ " نوجوان نے جیب میں سے 'دیوانِ غالب' کا پاکٹ ایڈیشن نکالتے ہوئے کہا ۔

جلسے میں ہلچل مچ گئی ۔ شاطر صاحب کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں ۔ رئیس نے غرا کر کہا --- " یہ کیا حرکت ہے ؟ " اور شاطر صاحب یہ کہتے ہوئے 'معاف کیجئے، مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا' جلسے سے نوک دم بھاگے ۔ دوسرے دن ہم نے سنا کہ شاطر صاحب نے شہر چھوڑ کر خنڈیا نے میں سکونت اختیار کر لی ہے ۔

ضروری گزارش

غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں (ادارہ)

واجدہ تبسم

راہ

دالان کی پچھلی طرف سے نرگس دوڑتی ہوئی اور ہانپتی ہوئی بولی

" اے بی بی جلدی کیجیے، جلدی چلیے صنوبر بچہ دے رہی ہے — "

بڑی بیگم نے ایک زوردار دھڑاک کے ساتھ پاندان کے ڈھکنے کو گرایا اور کچھ مسکراتی کچھ جھلاتی ہوئی بولیں —

" آج اس کی شادی کردو تو اگلے برس بچّہ جننے کو تیار ہو جائے اور دیکھو تو کم بختیا کو بات کرنے بھر کا سلیقہ نہیں — میں پوچھوں کیوں دی - بچّہ بھینس دیتی ہے یا عورت —؟

ماما نے ہنس کر بی بی کی بات سے بات ملائی — " بی بی یہ آپ کا لاڈ پیار ہی تو ہے کہ شادی کے قابل ہوتے ہوا تے بھی سب اپنے آپ کو بچّہ ہی جانتے ہیں اور بات کرنے کی گت بھی نہ آئے ہے — "

مگر ماما کی بات پوری ہونے سے قبل ہی بڑی بیگم لپک جھپک انگنی سے ہلکا چونا چاٹتی نوکر خانے تک پہونچ چکی تھیں — وہاں دیکھا تو سچ مچ صنوبر کا حال تباہ تھا — درد کی شدّت سے اس کا منہ پہلے سے ہرا نیلا پڑ چکا تھا — دائی اپنی سی کوشش کر کے ہار چکی تھی - صنوبر کا حال دیکھا نہ جاتا تھا — یہاں سے وہاں تک جتنی ماماییں، نوکرانیاں، ان کی ملنے جلنے والیاں تھیں سب بدحواس — سبھوں کی زبانیں آپ ہی دعا مانگے جا رہی تھیں۔

" مولا نور خاں کا باغ ہنستا رکھیو — ! "

" خدا یا بچپن ہے، ارمان بھری جان ہے، اپنا فضل کریو — "

خود نور خاں باہر کھڑا ہوا جو اپنے ہاتھ مل رہا تھا — کیسے کیسے ارمانوں سے چاؤ چونچلوں سے بیاہ کر لایا تھا — ابھی سال بھی تو نہ گزرا تھا - دھان پان سی لڑکی نو مہینے بچّہ کو سنبھالتے سنبھالتے پیلی پڑ چکی تھی اللہ نے اسے اتنی استطاعت دی ہی نہیں تھی کہ پھل پھلاری دودھ گھی کھلا کر حاملہ کو صحت کی طرف پھیر لیتا — اور غریبوں کے دن جس طرح گزرتے ہیں ایسے ہی نور خاں اور صنوبر کے بھی گزر رہے تھے — ہاسپٹل لے جانے کا حویلی میں نہ تو رواج تھا نہ اس کی ضرورت ہی سمجھی - اپنے اماں باوا نے ہی کون سے ہاسپٹلوں میں جنم لیا تھا کہ ہم انگریز میموں سے مشورے لیتے رہیں -

" ارے خدایا مر گئی — مولا میری مشکل آسان کر دے — "

صنوبر کی باریک اور تیز چیخ خدایا نے سن لی اور واقعی اس کی مشکل آسان کر دی — صنوبر کی چیخ کے ساتھ ہی ایک اور ننھی منّی سی چیخ اس دنیا میں گونجی — دائی نے اعلان کیا " بیٹی — "

لیکن دائی کی بات سننے کی کسی کو فرصت نہ تھی — سبھی اور خاص طور سے بڑی بیگم اس خون کی ندیا کو سہم کر دیکھے جا رہی تھیں جس میں کسی کی زندگی کی ناؤ ڈولتی ڈگمگاتی جا رہی تھی - ڈوبی جا رہی تھی —

" ہائے میّا — " دائی سہم کر بولی — دیکھنے دکھانے کو تو سوکھے پتے سا پیلی تھی اور یہ ندی —؟ "

بڑی بیگم حیران پریشان پتھر سی مورت بنی کھڑی تھیں - وہ بڑی ہی حوصلے والی عورت تھیں - پریشانیوں کو مسکرا کر ٹال جانے والی - بڑے سے بڑے اور کٹھن سے کٹھن لمحات بھی ان کی مسکراہٹ کو ملیا میٹ نہیں

کرسکتے تھے۔ ان کی سوچ کا انداز سب سے نرالا تھا اگر وہ یوں ہمت والی نہ ہوتیں تو اپنی اتنی زندگی بغیر مرد کے سہارے کے یوں نہ گزار سکتیں۔ ان کی ساری زندگی یونہی گزر رہی تھی کہ ایک دیوار آڑے با زو گھنگھرو چھنک رہے ہیں اور طبلہ دھنک رہا ہے۔ اس چھن چھن اور دھن دھن کے ہتھوڑے زندگی بھر اس دل پر ایسے پڑے کہ وہ فولاد بن کر رہ گیا۔ مگر اس وقت وہ سارے حوصلے بھول چکی تھیں ۔۔۔ یہ نہیں کہ انھوں نے آج تک کوئی موت نہ دیکھی ہو ۔۔۔ کون بشر ایسا ہوگا جس نے اپنی زندگی میں دو ایک بار حیات کا تار ٹوٹتے نہ دیکھا ہوگا۔ بڑی بیگم بھی کوئی الگ نہیں تھیں لیکن زندگی کا یہ روپ وہ آج پہلی بار دیکھ رہی تھیں جب کوئی اپنے جیون کا سارا رس کسی ایک ننھے منے پودے کو دے دیتا ہے کہ وہ پھلے پھولے اور خود فنا ہو جاتا ہے۔

بڑی بیگم نے بچوں کے سے ڈر جانے والے جذبے کے ساتھ سہم کر صنوبر کی طرف دیکھا جس کا سونے کی طرح پیلا اور دمکتا ہوا چہرہ ابھی ابھی دائی نے سرخ چادر سے ڈھک دیا تھا ۔۔۔ وہ سہاگن مری تھی نا ؟ اُسے ایک دُلہن کی طرح پورے سنگار، چاؤ اور سرخ لباس میں دفنایا جائے گا ۔۔۔ اُسے ایک بار پھولوں کا گہنا پہنایا جائے گا۔ ایک بار پھر اس کا دولہا اس کی ڈولی کو سہارا دے گا ۔۔۔ وہ دلہن بن گئی ہے نا !

بڑی بیگم نے لرز کر دیکھا ۔۔۔ سامنے اس کا دولہا کھڑا تھا۔

ابھی سال بھر پہلے جب بڑی بیگم خود بیٹے کی طرح پال پوس کر جوان کئے ہوئے اس بیٹے کو دولہا بنا کر دلہن بہو کو لانے کے لئے گئی تھیں تو یہی چہرہ خوشیوں اور امیدوں سے کس طرح چڑھتے سورج کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا ۔۔۔ آج چہرے کا سورج غروب ہو چکا تھا اور دل کی وادیوں میں گھٹا ٹوپ اندھیروں کا راج تھا ۔۔۔ دائی نے ننھی منی سی گڑیا کو چادر میں لپیٹ کر باپ کی گود میں دے دیا۔ باپ نے ایک لمحہ کو اُسے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ پھپھک کر عورتوں کی طرح رو پڑا ۔۔۔

"میں اسے کیسے پالوں گا ۔۔۔ ! میں کیا کروں ۔۔۔ خدایا !"

اک دم بڑی بیگم ہوش میں آگئیں ۔۔۔ میاں کی بے وفائی سے ٹوٹا دل انھوں نے سدا اسی طرح جوڑنے کی کوشش کی تھی کہ سدا دوسروں کے غموں کو اپنا جانا ۔۔۔ یہ چیز رفتہ رفتہ ان کی عادت، ان کی فطرت بن گئی اور اب یہ تھا کہ خدا ترسی کا ایسا جذبہ ان کے دل میں گھر کر چکا تھا کہ وہ کہیں ایسے موقعے پر پیچھے نہ ہٹیں ۔۔۔ ان کی اپنی تو لے دے کے دو ہی اولادیں ہوئی تھیں جو جوان ہونے کے بعد بیاہی بھی جا چکی تھیں۔ بیٹی اپنے گھر کی تھی اور بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ گاؤں میں چھوٹے سے رجواڑے کو سنبھالے ہوئے تھا ۔۔۔ اور بڑی بیگم کی زندگی کا اب یہی مصرف تھا کہ کسی یتیم لڑکی کو لے کر پال لیا، کسی ناجائز اولاد کو کلیجے سے لگا لیا۔ کوئی بھیک منگی منگتی حویلی کے دروازے پر آ نکلی تو اسے اپنے دامن میں پناہ دے دی ۔ کسی نے لجاجت سے دو روٹی مانگی تو انھوں نے گھر کا کونا ہی دے دیا ۔۔۔ بے پناہ دولت کا، انھوں نے یہی خرچ کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ ان کی حویلی کیا تھی اچھا خاصہ لنگر خانہ تھا۔ پھر یہ تھا کہ پالی پوسی لڑکیوں لڑکوں کی شادی خود ماں بن کر کر رہی ہیں۔ زچگیوں میں عمل دخل دے رہی ہیں۔ کسی کی بسم اللہ کا ہنگامہ رچا رہی ہیں۔ کسی کی ختنہ کا دھوم دھڑکا مچا رکھا ہے۔ ایسے میں وہ گھونگھرو کے چھناکے اور طبلے کے دھماکے بالکل بھول چکی تھیں۔ وہ سوچتیں میرا دل تو دنیا میں بہل ہی گیا۔ عاقبت بھی خدا ضرور روشن کرے گا۔ کسی یتیم یسیر کے سر پر ہاتھ پھیر دینے سے اتنی ہی نیکیاں شمار ہوتی ہیں جتنی کہ اس کے سر پہ بال ۔۔۔ تو یہاں صرف سر پر ہاتھ پھیرنے کا سوال تو نہ تھا۔ وہ تو جسے بھی اپنی گود میں ایک بار لے لیتیں، خدا کے بعد یہ اس کا واحد سہارا بن جاتیں۔ اس کی زندگی سنوار دیتیں ۔۔۔ اس کی خوشیاں ان کی اپنی خوشیاں ہو جاتیں اور اس کا ہلکا سا غم بھی ان کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہا دیتا ۔۔۔

نور خاں بھی انھیں کا پروردہ تھا۔ بعد میں تھوڑا بہت پڑھا لکھا کر انھوں نے اسے اپنی زمینوں کا حساب رکھنے کے لئے منشی کا درجہ دے دیا تھا ۔۔۔ اس کی شادی بھی انھوں نے ہی اپنی پسند سے پار سال ہی کروائی تھی ۔۔۔ انھوں نے سوچا بھی نہ تھا۔ نئی نئی بہار سے بھری یہ بگیا دم بھر میں یوں اُجڑ کر رہ جائے گی !

نورخان حویلی سے ملحق، مگر ایک کمرے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی حیثیت نوکروں کی سی نہ تھی۔ وہ پڑھا لکھا تھا اور دوسروں کے علاوہ وہ خود بھی، اپنے آپ کو اوروں سے ذرا ممتاز سمجھتا تھا۔ اس نے بڑی بیگم سے کہہ رکھا تھا اور بڑی بیگم نے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ صنوبر کے ماں بننے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی زمین پہ خود کاشت کر کے خود مختار زندگی گزار سکتا ہے۔ بڑی بیگم نے زمین بھی اس کے نام کر دی تھی لیکن بیس ایکڑ زمین پر جا کر بسنے کی بجائے صنوبر نے پانچ ہاتھ ٹکڑے کو زیادہ ترجیح دی — اب سارے ارمان دفن ہو چکے تھے اور وہ — کہ جس کے دل میں ایک لمبی اور بھری پڑی زندگی گزارنے کا ارمان تھا۔ کھڑا پوچھ رہا تھا ——

”میں اسے کیسے پالوں گا — ؟ میں کیا کروں خدایا — ؟“

”لاؤ میاں اسے مجھے دے دو۔ میں نے تمھیں پال پوس کر بڑا کیا تو کیا اس ننھی منی جان کو نہیں کر سکتی — ؟“ اک دم بڑی بیگم کا لہجہ اعتماد سے بھر گیا

نورخاں کے بہتے آنسو اک دم رک گئے۔ ارے — خدا کے بعد اس عظیم سہارے کو وہ کیسے بھول گیا تھا ؟ وہ زندگی کو بوجھ کیوں تصور کر بیٹھا تھا؟ ان تجربہ کار ہاتھوں اور خدا ترس اور محبت بھرے دل میں چھپ کر تو یہ ننھی کلی دنوں ہی دنوں میں پھول بن جائے گی — میں کیوں فکر کرتا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر چادر میں لپٹی ننھی سی جان بے حد محفوظ ہاتھوں میں دے دی۔

اس ذمہ داری پہ بڑی بیگم کا دل ایک لمحے کو کانپ سا گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ اس قسم کی عظیم سے عظیم ذمہ داریاں اپنے سر لے چکی اور انھیں نبھا چکی تھیں۔ لیکن یہ اپنی نوعیت کی پہلی ذمہ داری تھی کہ اتنی ننھی سی جان کہ جو ابھی چند گھنٹوں کی بھی نہ ہوئی تھی، ان کے سایۂ عاطفت میں آئی آج تک کے پلنے والے بچوں میں کوئی دو سال سے کم کا نہ تھا، لیکن یہ جان جس نے ماں کے دودھ کو منہ تک نہ لگایا۔ اوپر کے دودھ سے کس مصیبت سے پلے گی — ؟ لیکن ان کے کانپتے دل کو قرار اُسی لمحہ آ گیا جب انھوں نے ساتھ ہی یہ بھی سوچا کہ جتنی کٹھنائیاں مجھے پالنے پوسنے میں پیش آئیں گی جنت کا اتنا ہی اونچا مقام مجھے ملے گا —“ اور وہ بے حد پُرسکون ہو گئیں —

بڑی بیگم کی زندگی کا یہ دور سب سے جدا تھا — نئے نئے تجربے ہو رہے تھے۔ نئی نئی مشکلیں آن پڑ رہی تھیں اور دل سمجھاتا تھا انھیں تھامنا، روپ مت دو۔ یہ بڑے بڑے معرکے ہیں، جو تمھاری جنت کو جانے والی راہوں کو استوار کر رہے ہیں — بڑی بیگم کے اپنے بھی دو بچے ہوئے تھے مگر ان بچوں کو پالنے اور اس بچی کو پالنے میں واقعی زمین آسمان کا سا فرق تھا۔ وہ ان کے خود کے بچے تھے، وہ ماں تھیں، خود ہی اپنا دودھ پلاتی تھیں۔ اوپر کے دودھ کی کھٹ کھٹ اور مصیبت کا انھیں کچھ اندازہ ہی نہ تھا۔ پھر یہ تھا کہ اپنے بچے اپنے ہی بچے ہوتے ہیں۔ مارو، ٹھونک دو، غصہ آئے تو پٹخ دو — کون باز پرس کرنے چلا ہے — مگر اب وہ بات نہ تھی ہر چند کہ یہ بھی اپنی ہی بچی جیسی تھی مگر اس کی مسلسل ریں ریں سے تنگ آ کر کبھی ان کا جی اُسے ایک آدھ دھپہ جڑ دینے کو چاہتا تو ایسا لگتا کہ خدا کی آنکھیں صرف انھیں پر مرکوز ہیں — اور وہ ڈگمگا جاتیں — ”ایسے سے مجھے جنت کیسے مل پائے گی ؟“ ان کے اپنے بچوں پہ آیائیں تھیں — میاں لاکھ بے وفا اور بد دل تھے، مگر مرد کی ذات کا پورا کمینہ پن ان میں موجود تھا جو عورت کو تو جوتی تلے کی چیونٹی سمجھتا اور دبانا اپنا حق جانتا ہے، مگر اپنی اولاد کو کلیجے کی کور سمجھتا اور اس کی آسائش اور آرام کا پورا خیال رکھتا ہے۔ نواب صاحب بھی بالکل مرد تھے —— بیوی کو جتنی بے توجہی بخشی، اولاد کو اتنی ہی توجہ اور محبت کی گرمی دی ’ہیں‘ بھی آواز سنتے تو دوڑے آتے کہ بچہ کیوں رویا — کیسے رویا ؟ انھوں نے ایک ایک بچے پر دو دو آیائیں رکھ چھوڑی تھیں۔ دودھ ماں ہی پلاتی تھیں مگر اپنی بھی ان کی اپنی ہی تھی۔ یہاں یہ اڑچن آن پڑی تھی کہ اگر آیا نہ رکھتیں تو خدا کے آگے جواب دہ ہوتیں کہ اپنے برتے پہ لیا تھا تو پھر آرام کی کیوں سوچی — ؟ ڈبے کا اوپر کا دودھ بنانا، رات بے رات جگنا، اپنے ہاتھوں گو موت کرنا۔ بس بڑی بیگم بن داموں

کی غلام بن کر رہ گئیں۔

انھیں دنوں ایک دل ہلا دینے والا واقعہ رونما ہو گیا

نور خاں بیل گاڑی میں زمینوں پر سے حساب کتاب کی جانچ کر کے واپس آ رہا تھا کہ بیل گاڑی اوبڑ کھابڑ راستوں سے، پتھروں سے ٹکراتی نیچے آ پڑی اور اس کے تلے نور خاں مرچ دھنیے کی طرح پس کر رہ گیا۔ جانے والا تو اپنی جان سے گیا مگر بڑی بیگم ذمہ داری کے دوہرے بوجھ تلے دب گئیں۔ اب وہ ایک معصوم یتیم یسیر کی نگہ دار ٹھیریں۔ کیسے کڑے مقام پہ خدا نے انھیں لا کر کھڑا کر دیا تھا ——! انھیں اس بوجھ سے اپنی کمر ٹوٹتی محسوس ہوئی مگر اسی خدا ترسی کے جذبے اور جنت کی آس نے انھیں سہارا دیا اور وہ تن من دھن سے جٹ گئیں —

ننھی چونکہ ان کی عاقبت کی خوشیوں کا سہارا بن کر آئی تھی، اس لئے انھوں نے اس کا نام مسرت رکھا۔ ویسے تو انھوں نے اسے ہزار نام دے رکھے تھے —— بالکل اسی طرح، جیسے کہ ایک ماں — سگی ماں اپنی سگی اولاد کو ہزار دل ہی پیار بھرے ناموں سے پکارتی رہتی ہے۔

بڑی بیگم نے اب تک جتنے بھی بچوں کو پالا تھا، یہ سمجھ کر پالا تھا کہ بس نیچے ہیں — پل جائیں بڑے ہو جائیں، اپنے اپنے ٹھکانوں سے بیٹھ جائیں۔ مگر مسرت کی بات ہی کچھ اور تھی۔ انھوں نے ایک دن ہر خاص و عام میں اعلان کر دیا کہ مسرت میری بیٹی ہے۔

کسی بات کو منہ سے کہہ دینا اور ہے نباہنا اور — مگر دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ بڑی بیگم نے منہ سے اگر یہ بات نکال دی تو واقعی دل سے اسے نباہ کر ہی چھوڑا۔ زمانہ بدل رہا تھا، انھوں نے عربی اردو تعلیم کے ساتھ ساتھ مسرت کے لئے ایک انگریز مس بھی رکھی جو اسے بے حد جانفشانی سے انگلش پڑھانے لگی —— ساتھ ہی سیون پیرودن، نٹنگ، پکوان، سلیقہ قرینہ، غرض کوئی بات ایسی نہ چھوٹی جس کا بڑی بیگم نے بطورِ خاص خیال نہ رکھا ہو ——! مسرت ابھی آٹھ نو سال کی ہی ہوگی کہ اس نے خود بھی بڑی بیگم کی محبت کو پرکھ لیا۔ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی موقعے پر کوئی نہ کوئی تو پوچھ ہی بیٹھتا —— "اے ہے بڑی بیگم —— آپ تو بچی کے پیچھے جان تیاگ کئے دے رہی ہیں ——"

تو وہ مسرت کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتیں —— "وہ تو میری بیٹی ہے اور یہ تو سوچو یتیم یسیر ہے۔ اس کے طفیل تو مجھے جنت ملے گی ——"

انھیں دنوں رمضان کے مبارک مہینے کی بات ہے —یو۔پی سے ایک مولانا صاحب بطورِ خاص تراویح کی نمازیں پڑھانے کے لئے گاؤں بلوائے گئے — مہینے بھر تک انھوں نے ہر کس و ناکس کے منہ سے یہی بات سنی کہ بڑی بیگم کس قدر خدا پرست ہیں۔ کس طرح غریبوں کے لئے ان کی تجوری کا منہ کھلا ہوا ہے — کیسے کیسے انھوں نے اپنی زندگی تمام تر انھیں لوگوں کے لئے وقف کر رکھی ہے جو مصیبت کے مارے ہیں اور یہ کہ ایک یسیر اور یتیم لڑکی کو کس طرح جگر کا ٹکڑا بنا کر رکھا ہے ——

مہینے کے ختم پر جب وہ واپس یو۔پی جانے لگے تو پردے کی آڑ سے بڑی بیگم سے بات چیت ہوئی —— انھوں نے بغیر کسی قسم کی خوشامد چاپلوسی کے واقعی سچائی کے ساتھ کہا

"بیگم صاحبہ آپ یہ سب جو کچھ کر رہی ہیں خدا کے ہاں آپ کی نجات ہی نجات ہے —"

بڑی بیگم کی تشکر سے بھرائی آواز آئی —— "مولانا صاحب بس یہی دعا ہے کہ خدا عاقبت بخیر کرے۔ دنیا کے مزے تو چکھ لئے اب آخرت کی دھن ہے ——"

"ارے یہ آپ کیا کہتی ہیں — آپ کچھ نہ کرتیں، لیکن صرف ایک یتیم یسیر لڑکی کو پال کر ہی آپ نے وہ کچھ کیا ہے کہ جس کا اظہار الفاظ میں ممکن ہی نہیں ——"

بڑی بیگم نے تڑپ کر بات کاٹی — "مولانا صاحب اسے یتیم لڑکی کے نام سے نہ پکاریئے — میری بیٹی ہے وہ — اسے اسی طرح مخاطب کیجئے جیسے وہ ......" ان کی آواز پھوٹ بہی۔

"مرحبا — مرحبا —" مولانا صاحب بے اختیار ہو کر پکار اٹھے "مبارک ہیں آپ — مبارک ہیں وہ در و دیوار جن کی پناہ میں آپ رہتی ہیں۔ مبارک ہے وہ زمین جس پر آپ قدم دھرتی ہیں آپ کی جگہ برحق ہے — جنت میں آپ کا بلند مقام برحق ہے ...."

اور وہ اللہ ہو — اللہ ہو کا ورد کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے ——

اس دن سے بڑی بیگم پر ایک نئی دنیا کے دروازے کھل گئے ۔ ان کی منت خدا نے قبول کر دی ۔ اتنے بڑے مولانا فرما گئے کہ جنت بر حق ہے تو یقینی ہوگی ۔ اور یہ سب نیک اعمال کا نتیجہ ہے ۔۔ اور یہ اعمال مسرت کے قدموں کے طفیل ہیں ۔ وہ اسے جی جان سے ہمارنے لگیں

صالحہ ان کی اپنی بڑی بیٹی سال کے سال ان کے ہاں گرمیاں گزارنے اور آم کھانے آتی تھیں ۔۔ ماں نے مسرت کو گود لیا تھا تبھی سے وہ کھٹکیں ۔ لیکن منہ سے کچھ بول نہ پاتی تھیں ۔ جانتی تھیں کہ ماں نے زندگی بھر ہر طرح کے دکھ سہے اب بڑھاپے میں دل بہلانے کی خاطر یہ سہارے پال رکھے ہیں ۔ اور ان کی برابری کا کوئی جوڑی دار ہوتا تو شاید طوفان اٹھا لیتا بھی ۔ مگر جانتی تھیں کہ جتنے ہیں سب ایسے ویسے ہی ہیں ۔ کسی کے ماں باپ نے غربت کے مارے لاکر گود ڈال دیا ہے ۔ کوئی حرام کا تھا تو کوئی کونے کھدرے نالے پرنالے سے برآمد کیا ہوا ہے ۔ کوئی بھٹکتا بھٹکتا آکر گلے پڑ گیا ہے ۔ لیکن مسرت کو جن چاؤ چوچلوں سے لیا تھا وہ دل جلا کر دینے کے لئے بہت کافی تھا ، مگر ٹال گئیں ہر برس آتیں اور جلا دینگ دیکھ کر جاتیں ۔ ماں نے جب اعلان کیا تھا کہ مسرت بیٹی ہے تو ان کا ماتھا ٹھنکا اب تو یقیناً یہ بھی جائداد کی ایک وارث ٹھہری ۔ مگر ماں کے آگے بھلا بول ہی کیا سکتی تھیں ۔ لیکن اس سال تو پیمانہ ہی چھلک گیا ۔ بڑی بیگم کی زندگی کا رخ ہی مولانا صاحب نے پھیر دیا تھا ۔ جب سے انھوں نے اتنے پہونچے ہوئے بزرگ کے منہ سے یہ بات سن لی تھی کہ وہ جنت کی واقعی مستحق ہیں ، ان کی محبت مسرت سے کچھ زیادہ ہی سوا ہو گئی تھی ۔ وہ یہ ہی کہ انھوں نے اپنے ہر میں ملنے والی تمام جائداد بھی مسرت کے نام جیتے جی لکھ دی جو کم و بیش سوا لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی بنتی تھی ۔۔ یہ وار ایسا نہ تھا کہ بیٹی چین سے سہار جاتیں ۔ بھئی ظاہر ہے کہ اس کے بیچ میں یہ لعینوں چلی مسرت نہ ٹپک جاتی تو یہ انھیں کا تو حق ہوتا نا ۔۔ بڑے ارمان سے ماں سے کہا ۔" اماں بیگم ۔ آپ نے بنا سوچے سمجھے اتنی بڑی جائداد مسرت کے نام کر دی ۔ بڑی بیگم بے حد مطمئن انداز سے مسکرائیں ۔۔ تو کیا ہوا بیٹی تمھارے جہیز میں بھی تو کم و بیش ایک لاکھ نقد اور ایک لاکھ کا زیور کپڑا گیا ہے وہ بھی تو میری ہی بیٹی ہے ۔ رکتے رکتے صالحہ بولیں ۔۔" مگر اماں بیگم ۔ گود لی ہوئی اور سگی اولاد میں کچھ تو فرق رکھتیں آپ ۔۔ کیا سچ مچ وہ میری برابری کر سکتی ہے ۔ اور کیا سچ مچ آپ اُسے مجھ سے زیادہ چاہ سکتی ہیں ۔

اسی لمحے مسرت کسی کام سے ادھر آنکلی ۔ لمحے بھر کو تو صالحہ بھی اُسے دیکھ کر بات کرنی بھول گئیں ۔ غضب خدا کا ۔ کیا رنگ روپ پایا تھا ۔ کیا دبدبہ کیسی شان ۔ کیسی پاکیزگی برس رہی تھی صورت پر ۔ سچ ہے خدا حسن کی دولت جسے چاہتا ہے دے دیتا ہے ، اس میں غریب امیر کی تخصیص نہیں رکھتا ۔ بڑے بڑے پائنچوں کے گلابی غرارے گلابی فراک اور ہلکے سبز ڈوپٹے میں کیسی نکھر رہی تھی کہ جی چاہتا تھا انگ انگ کو چوم چوم لیں ۔

بڑی بیگم ان کی بات کا جواب دے رہی تھیں ۔" بیٹیا محبت نفرت کا کیا ہے جانور کو پالو اُس سے بھی ہو جاتی ہے اور دل پھر جائے تو سگی اولاد کی طرف ہو گئے تک کو جی نہیں چاہتا ۔ مسرت کی بات ہی اور ہے ۔ میں نے اُسے جی جان کا ٹکڑا بنا کر پالا ہے ۔ سچ کہتی ہوں اتنی محنت اور توجہ میں نے تم دونوں بہن بھائی پر بھی نہیں صرف کی تھی ۔ مجھے سچ مچ اس کی اتنی ہی محبت آتی ہے جتنی تم دونوں کی ۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تم سے بھی زیادہ ۔۔ اس کی یہی وجہ ہے وہ یتیم یسیر ہے ۔ اُسے میں نے جتنی محبت دی ہے ، اس کے صلے میں مجھے اتنی ہی نیکیاں ملیں گی ۔۔ وہ میری بیٹی بھی ہے میری عاقبت میری نجات اور میری جنت کا راستہ بھی ۔۔"

مسرت نے ایک ٹک رک کر یہ ساری باتیں سنیں ۔ اس نے پہلے بڑی بیگم کی طرف دیکھا ، پھر صالحہ کی طرف ۔ منہ سے کچھ نہیں بولی ۔

صالحہ بیگم بھی چپ رہ گئیں ۔ بات آئی گئی ہو گئی ۔

چند سال اور گزر گئے ۔ مسرت نے شہر جا کر میٹرک کا امتحان بھی دیا اور پاس بھی ہوئی ۔ اب بڑی بیگم کو اس کے مستقبل کی ۔ شادی کی فکر تھی ۔ مگر خود مسرت چاہتی تھی کہ ابھی کچھ اور پڑھ لے

زمانہ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہونا چاہتی تھی۔ ایک دن بڑی بیگم کے سامنے اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو وہ حیران حیران سی بولیں —

"بیٹی — تجھے کمانے دھمانے کی کون حاجت ہے — میں نے تیرے نام اتنی اتنی بھی نہیں ڈیڑھ لاکھ کی جائداد کر دی ہے۔ کچھ نہ کرے، اگر صرف بینک میں ہی یہ رقم رکھی رہے تو ہر ماہ ۶-۷ سو آجائیں۔ کیا اتنے میں تیری گذر بسر نہیں ہو سکتی —"؟

"نہیں - امّی - ایسی کوئی بات نہیں۔" مسرت بے بسی سے بولی "آپ سمجھتی نہیں ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا —"

"تو اور کیا مطلب تھا —؟" بڑی بیگم ذرا بناوٹی غصے سے بولیں —"کیا تو مجھے ماں نہیں سمجھتی —؟"

مسرت نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے — "امّی خدا کے لئے یوں نہ سوچئے — میں نے کب کہا آپ میری ماں نہیں ہیں" وہ بھرائی آواز سے بولی — "خدا کے بعد تو جو کچھ ہیں آپ ہی ہیں — میرے لئے اور کون ہے ....

آگے اس سے کچھ کہا نہ گیا - وہ رو پڑی - اس کے ساتھ بڑی بیگم بھی رو دیں - مسرت سچ مچ ان کی جان ایمان بن کر رہ گئی تھی وہ اس کی آنکھوں میں آنسو کیسے دیکھ پاتیں جبکہ اس کے چہرے پر غم کی ہلکی سی چھاپ بھی انھیں دنوں ملول کر دیتی - وہ اس کے آنسوؤں اور مسکراہٹوں، غم اور خوشیوں، اس کے اندھیروں اجالوں کی — سبھی چیزوں کی وہی ذمہ دار تھیں - یہ ناممکن تھا کہ ان کے جیتے جی کوئی مسرت کی طرف انگلی بھی اٹھا سکتا اور اُسے ایک بول بھی بول سکتا — بیٹے سے تو اسی مارے مدت ہوئی بول چال بند ہو چکی تھی جب سے کہ انھوں نے جائداد کا وارث مسرت کو قرار دے دیا تھا — صاحبہ بھی بگڑیں بہت - مگر قدرتی بات ہے کہ بیٹیاں ماں سے زیادہ قریب ہوتی ہیں اس لئے وہ ماں سے ٹوٹ تو نہ سکیں ہاں شیشے میں بال ضرور پڑ گیا - مگر یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی وجہ سے بڑی بیگم بددل ہو کر بیٹے بیٹی کی بات مان جائیں - وہ جس مقصد کو لے کر چلی تھیں وہ مقصد — وہ راہ سیدھی جنت تک پہونچتی تھی -

مسرت خوبصورت تھی، جوان تھی، تعلیم یافتہ تھی اور پیسے والی بھی — جب یہ ساری خوبیاں ایک جگہ جمع ہوں تو پیام یوں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے آندھی پانی سے کچی امیاں ٹپاٹپ گرتی ہیں قریبی لوگوں کو معلوم بھی تھا کہ مسرت بڑی بیگم کی اپنی سگی بیٹی نہیں مگر ڈیڑھ دو لاکھ کی جائداد نے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا - پیام لانے والوں میں وہ بھی تھے جنھوں نے بڑی بیگم کے اس اقدام پر ناک بھوں چڑھائی تھی کہ اور کچھ نہیں سوجھا تو غلام زادے کی یتیم یسیر لڑکی کو ہی بیٹی بنا ڈالا — اور وہ بھی جو اس نیک قدم کو جی جان سے سراہتے تھے اور چاہتے تھے کہ واقعی اس بے مثال ہیرے کی جوت انھیں کے مقدر کی جوت بن جائے -

بڑی چھان بین کے بعد آخر کار بڑی بیگم نے ایک خاندانی لڑکا پسند کر ہی لیا - لڑکا بے حد قابل اور بے حد سمجھ بوجھ والا تھا سول انجینئر تھا - گھر کا بھی کھاتا پیتا تھا اور تنخواہ بھی آٹھ سو تھی - زیادہ زر زیور دولت کی بڑی بیگم کو لالچ تھی نہ خواہش - خدا کا دیا ان کی مسرت کے پاس اتنا کچھ موجود تھا کہ زندگی بھر چاہتی تو چار کو کھلا کر خود کھا سکتی تھی - وہ صرف شرافت پر جان دیتی تھیں سو خدا نے ان کی سن لی -

جہیز کا جوڑ جاؤ ہونا شروع ہوا تو بس یوں لگتا تھا کہ گھر میں دو کانیں کھل گئی ہیں - حویلی کتنی بڑی تھی - اس کمرے میں کپڑے سل رہے ہیں - اس کمرے میں جوڑوں پر گوٹا کناری ٹنک رہا ہے - اس کمرے میں سنار بیٹھا ٹھک ٹھک کر رہا ہے - اس کمرے میں برتنوں کا ڈھیر لگا ہے تو اس کمرے میں تیار زیورات کی جانچ ہو رہی ہے —

رقعے چھپے اور مقررہ تاریخ پر لوگ باگ آنے شروع ہوئے ان میں جلنے والے بھی تھے اور سچے دل سے خوش ہونے والے بھی - مسرت مایوں بیٹھ چکی تھی - سنہرے لباس میں اس کا حسن اور نکھر آیا تھا - جو دیکھتا بس دیکھتا رہ جاتا - بڑی بیگم کا کمرہ اس کے کمرے سے ہی ملحق تھا - ملنے جلنے والیاں آتیں - اس کا چہرہ دیکھ جاتیں

اور پھر دان جہیز کا نظارہ کرتی بڑی بیگم کے پاس پہونچ کر گفتگو کا ایک ہی ایک موضوع باقی رہ جاتا ۔ "بیگم آپ نے تو واقعی حد کردی حد ۔ کیا دل پایا ہے کہ بس واہ ۔۔!" بڑی بیگم مطمئن لہجے میں بڑے انکسار سے کہتیں ۔ "میں نے کیا کیا ہے بی بی ۔ سب حوصلہ خدا کا دیا ہوا تھا ورنہ میں کیا کرسکتی تھی ۔ بس خدا نے سن لی ۔ لڑکی اپنے گھر کی ہوجائے اور بس ۔ پھر میں اللہ اللہ کردوں ۔ سوائے عاقبت کے اب کوئی فکر نہیں ۔"

کہنے والیاں ہاں میں ہاں ملاتیں "اور کیا ۔ اب آپ نے اتنا بڑا ایثار کیا ہے تو خدا کے ہاں جنت تو آپ کی ہی منتظر ہے بس ۔۔"

"ہاں بی بی ۔ حضور صلعم نے فرمایا ہے کہ جس نے تین لڑکیوں کو پال پوس کر جوان کیا اور بیاہ دیا وہ جنت کا مستحق ہوگیا ۔ یہ میرے ہاتھوں گیارھویں لڑکی بیاہی جارہی ہے ۔ صرف جنت کی اور خدا کی خوشنودی کی آس ہے ورنہ اب دنیا میں اور کیا رہ گیا ہے ۔۔"!

بازو کے کمرے میں مسرت بیٹھی سنتی رہتی ۔ بیٹھے بیٹھے آپ ہی آپ اس کی سسکیاں ابھرنے لگتیں ۔ کون جانے میکہ چھوٹتے پر یہ آنسو بہتے تھے یا اور کوئی غم چپکے چپکے اُسے کھائے جاتا تھا ۔!

اگلا دن عقد خوانی کا تھا ۔ ایک دن پہلے مہندی ہوتی تھی ۔ ہرے ہرے جوڑے میں مسرت کومل ڈالی کی طرح جھکی جارہی تھی مہین پلو میں سے عارض کی تابانی جھلکتی تو کچھ یوں لگتا کہ شاید سورج ابھی ادھر ہی سے طلوع ہوگا ۔

مہمان بیبیاں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں ۔ وہ دھوم دھڑکا تھا کہ کان پھٹ کر رہ جائیں ۔۔ زنانے مردانے دونوں جگہ لوگوں کا ہجوم تھا ۔۔ لوگوں کا اندازہ تھا کہ دان جہیز کو تو چھوڑو ، صرف بارات اور مہمانوں کا اوپری خرچ ہی کوئی تیس چالیس ہزار کا پڑ جائے گا کل کا دن تو بڑے ہنگامے کا ہوگا ۔ اس خیال سے حویلی میں آج ہی سے جہیز جانا شروع کردیا گیا ۔ بھر بھر کمرے جہیز سے اٹے پڑے تھے ۔ بڑے وسیع ہال میں جگ مگ کرتی کار ۔۔ ریڈیو سیٹ ، گراموفون فرج گرام ۔۔ صوفہ سیٹ ۔ ڈبل بیڈ ۔۔ کیا کیا نہ تھا ۔ بس حویلی کیا تھی وہ کانوں کا روپ ہوکر رہ گئی تھی ۔

بڑی بیگم مسرت کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں ۔ ان کی آنکھیں بار بار بھر آتیں اور وہ آنسو پی پی جاتیں ۔ کل مسرت پرائی ہوجائے گی ۔ کتنی مصیبتوں سے پالا ۔ کتنی محبت اُسے دی ۔۔ سب چیز سے منہ موڑ کر سارے بندھن توڑ کر وہ بڑی بیگم کو اکیلی چھوڑ کر چلی جائے گی ۔۔! جھر جھر بہتے آنسوؤں کو اب ہاتھوں نے روکنے کی کوشش کی بھی نہیں ۔۔ اسی دن کے لئے تو وہ آس مند تھیں صرف اسی دن کے لئے اتنی ساری کٹھنائیوں کو وہ شربت جان کر پی گئی تھیں کہ بیٹی اپنے گھر کی ہوجائے ۔ آخر کو یتیم اسیر تھی ۔ کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو ساری دنیا مل کر ان کے منہ پر کالک تھوپ گدھے پر بٹھا دیتی ۔ کل اس کے وداع ہوتے ہی ان کی نامکمل جنت میں آخری اینٹ بھی رکھ دی جائے گی اور وہ اپنے خدا کے آگے سرخرو ہوسکیں گی ۔

بڑی بیگم اپنے خیالات سے جب چونکیں ، تب ممانی جان نے ان کا شانہ تھپ تھپا کر کہا

"مبارک ہو بہن ۔۔ خدا نے تمھاری دیرینہ آرزو پوری کی ۔ لڑکی اپنے گھر کی ہوجائے اس سے زیادہ ایک ماں کی تمنا اور کیا ہوسکتی ہے ۔"

"ہاں بی بی ۔۔" بڑی بیگم اور کچھ نہ کہہ سکیں ۔ پھر بھر آنے والے آنسوؤں نے ان کا گلا دبوچ لیا ۔ مہمان بیبیوں میں سے کوئی بولیں ۔

"مگر بڑی بیگم آپ پر واقعی کمال حیرت ہے ۔ آپ نے کس طرح بیس برسوں تک اپنے وجود کو بھلا کر بالکل ایک نوکر بن کر بٹیا کی خدمت کی ہے ۔ کبھی دیکھنے والوں کو ایسا لگا ہی نہیں کہ یہ آپ کی سگی بٹیا نہیں ۔۔"

"نہیں نہیں" بڑی بیگم تڑپ کر بولیں "ایسا نہ کہئے ایسا نہ سوچئے ۔۔ وہ میری سگی بیٹی ہی ہے بلکہ سگی سے بھی بڑھ کر ہے ۔ اسے اس منزل تک پہنچا کر میں خود بھی تو جنت کی اہل .....

بات ابھی بڑی بیگم کے منہ میں ہی تھی کہ مسرت کی کانپتی آواز پوری طاقت کے ساتھ کمرے میں ابھری — "میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں بڑی بیگم — میں آپ کی بیٹی نہیں   بیس برسوں سے اس جملے کو سنتے سنتے خدا گواہ ہے میرے کان پک گئے ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ میں آپ کی بیٹی نہیں صرف وہ راہ ہوں جس پر چل کر آپ جنت تک جا سکیں گی — آپ نے زندگی میں کبھی مجھے ماں کی محبت نہیں دی۔ کبھی باپ کا پیار نہیں دیا۔ کبھی مجھے اپنی اولاد نہ جانا — جانا تو بس یہ جانا کہ میں ایک سہارا ہوں آپ کی جنت کے حصول کا — آپ کی دولت، عزت، جائداد، دان دہیز یہ سب فریب ہے، دکھاوا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اصلیت کیا ہے۔ اصلیت صرف یہ ہے کہ آپ کو جنت چاہیئے تھی جو آپ نے میرے خون کے بدلے واقعی حاصل کر لی — ....

بڑی بیگم نے گھبرا کر دیکھا — "مسرت — مسرت یہ کیا کہہ رہی ہے تو — کیا ہو گیا ہے تجھے — تو ہوش میں ہے یا نہیں — لوگ کیا سوچیں گے، کیا کہیں گے بیٹی۔ ذرا ہوش کی لے —"

مسرت پلنگ پر سے اُٹھ کر بھاگی —

"میں ہوش میں ہوں — پورے ہوش میں   بیس برس سے ہوش میں ہی تو ہوں — لیکن آج میں اپنے ہر نفس کو بھول جانا چاہتی ہوں — لیکن ایک دعا کرتی جاؤں گی کہ خدا آپ کو واقعی جنت دے۔ بیس برسوں تک آپ نے جس خلوص اور جس چاہت سے جنت کی آرزو کی ہے، اگر خدا نے نہ دی تو اس جیسا ناانصاف کوئی نہیں —"

بڑی بیگم اسے سنبھالنے کو لپکیں مگر وہ سب سے بلند اور اونچی ٹیک پر سے نیچے چھلانگ لگا چکی تھی — انھوں نے ہولا کر نیچے جھانکا جیسے جیسے سُرخ سُرخ خون کی ندی سی بہہ نکلی تھی — ان کی قطعاً سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ندی جنت کو جا رہی ہے یا دوزخ کو — !



نریندر لوتھر

بند کواڑ

وہ پانچ سال کے بعد وطن واپس آیا۔ یکے بعد دیگرے وہ کئی شہروں، کئی ایسی جگہوں پر گیا جہاں اس نے زندگی کے حسین لمحات گزارے تھے۔ مگر نہ جانے کیوں ہر جگہ اسے اداسی نظر آئی جہاں پہلے ہر طرف مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں نظر آتی تھیں وہاں اب ویرانی سی تھی۔ شہر وہی تھے جگہیں وہی تھیں۔ وہ کیا چیز تھی جو پانچ سال پہلے اس کو وہاں نظر آتی تھی اور اب نہیں تھی؟ جس کی وجہ سے زندگی میں کچھ خلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ ویسے تو ہر جگہ کافی ترقی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ لیکن ترقی اور چیز ہے اور رونق اور چیز۔ ایسا لگتا تھا جیسے شہر والوں نے سودا کر لیا ہو کہ لے جاؤ ہماری ساری رونق اور ہمیں ترقی یافتہ بنا دو۔ جگہ جگہ نئے مکان بھی نظر آتے تھے۔ ایسے مکان جو لوگ کرایہ حاصل کرنے کے لئے بنواتے ہیں خود رہنے کے لئے نہیں۔ پیسے بنانے کا ایک اور دھندہ۔ ڈربوں میں کنبوں کو گھسیڑ دو۔ اور پھر یہ امید کہ وہاں انسانی زندگیاں پھولیں پھلیں گی۔

لیکن یہ بھی کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ ایسا تو تب بھی تھا۔ ہاں پانچ سال میں لوگ بدل گئے۔ کالج کے سب طلبا نکل چکے تھے اور جو نئے نئے بچے فرسٹ ایر میں فول بنائے جاتے تھے وہ بھی اس بڑی دنیا میں روزی کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ بیشتر پروفیسر ریٹائر ہو چکے تھے۔ اور جو لوگ اسے اچھی طرح جانتے تھے وہ بھی کچھ ٹھنڈے ٹھنڈے سے نظر آ رہے تھے۔ اداسی اس کے چاروں طرف تھی۔ اس ویرانی میں اسے اپنی تنہائی کا شدید احساس ہوا۔ کیا دنیا واقعی بدصورت اور بے رونق ہو گئی تھی یا یہ سب میرے دل کا عکس تھا؟ اس نے اپنے سے سوال کیا۔

بہر حال یہاں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ پھر اس نے سوچا چلو رام پور چلتے ہیں۔ وہاں شاید دل لگ جائے۔ پانچ سال پہلے رام پور جنت نشان تھا۔ اب بھی ویسا ہی ہوگا۔ وہاں اس کے چچا رہتے تھے۔ اپنے چھوٹے سے کنبے کے ساتھ ان کے گھر میں ہمیشہ اسے عجیب سی تسکین اور شانتی ملتی تھی۔ اس گھر میں اس کی بہت عزت تھی۔ سب لوگ اسے ایک چھوٹا سا دیوتا مانتے تھے۔ جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کبھی چوری نہیں کرتا، کبھی کوئی پاپ نہیں کرتا۔ کبھی کوئی غلطی کر ہی نہیں سکتا۔ ایک عجیب سی غیر مرئی شخصیت کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ سارے کنبے کا دوست۔ ہر کوئی اسے اپنا خاص صلاح کار تصور کرتا اور اس کی صلاح کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تیش اس سے بے پناہ محبت کرتا۔ چھوٹی بہن۔ کیا نام تھا اس کا۔ رتنا اسے اپنا ہمجولی سمجھ کر اس کے ساتھ ہر قسم کا کھیل کھیلتی۔ اور رتنا کے ساتھ اسے گہرا انس تھا۔ رتنا نے ابھی کالج میں قدم رکھا ہی تھا۔ حالانکہ عمر میں اس سے قدرے چھوٹی ہی تھی، لیکن تھی بڑی سلجھی ہوئی اور سمجھدار لڑکی۔ سارے کنبے میں صرف وہی لڑکی اسے دکھائی دیتی تھی جو کچھ سوچ وچار کر سکے۔ باقی سب لوگ تو پرانے ماڈرن قسم کے دقیانوسی لوگ تھے جو یہ مانتے تھے کہ ایشور اپنی

جگہ سکتی ہے اور جو ہونا ہے سو ہوتا ہے۔ ان کے دماغ کے سوچ وچار کے دائرے محدود تھے جو ہزاروں برس پہلے منو مہاراج مقرر کر گئے تھے اور وہ انھیں حدود میں خوش تھے۔ اس گھر میں ونود کو صرف رتنا ہی ایسی نظر آتی تھی جو سمجھ سکتی تھی کہ کنوئیں کے باہر بہت سارے وسیع تالاب بھی ہیں۔ دریا ہیں، سمندر ہیں۔ وہ بارہا اس کی مدد سے ان کے خیالات اور ان کے نقطۂ نظر کو پرانے راستوں سے ہٹا کر نئے راستوں پر لانے کی کوشش کرتا لیکن رتنا کی بساط ہی کیا تھی۔ فرسٹ ایر کی چھوکری اور وہ بھی تو اسے ایسا ہی سمجھتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا جیسے وہ ایک چھوٹی سی بچی ہو اور وہ سالارِ کارواں۔ یہ کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ ان کا آپس میں سوائے "کزن" کے اور کوئی بھی رشتہ ممکن ہو سکتا ہے۔

ان دنوں ونود نے ابھی پڑھائی ختم ہی کی تھی اور کسی نوکری کی تلاش میں تھا۔ اس کے دل میں قوم کی خدمت کرنے کا اسے ابھارنے کا بے پناہ جذبہ تھا اس لئے وہ ادھر ادھر کی کئی سوسائٹیوں کا کرتا دھرتا بن بیٹھا۔ ویسے وقت گزارنے کے لئے وہ ایک کالج میں دو گھنٹے روز پڑھانے بھی چلا جایا کرتا تھا۔ اس کے کالج کے اوقات ایسے تھے کہ وہ سب کے بعد جاتا اور سب سے پہلے گھر واپس آ جاتا۔ صبح جب لوگ اپنے کاموں کو جاتے تو وہ گھر میں ہوتا اور شام کو جب وہ واپس آتے تو بھی وہ گھر میں ہوتا۔ اس لئے سب لوگ اسے چھیڑنے کے لئے کہتے کہ وہ تو کوئی کام ہی نہیں کرتا۔ انکل اکثر کہتے "بھیا جو لوگ کام سے خالی ہیں وہی سوشلسٹ ہو سکتے ہیں۔ ہمیں کام سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے جو تمہاری طرح قوم کی ترقی کے بارے میں سوچیں!"

جب وہ کالج سے واپس آتا تو ڈرائینگ روم میں آ کر ریڈیو لگا کر بیٹھ جاتا اور جیسے جیسے دوسرے لوگ واپس آتے وہ بھی وہیں ڈھیر ہو جاتے۔ پھر ایک دو بجے کھانا لگ جاتا اور اس کے بعد سب لوگ واپس اپنے کام پر چلے جاتے یا اپنے بلوں میں۔ پانچ بجے کے قریب سب لوگ اکٹھے ہو جاتے۔ شام کو وہ عموماً اکیلا ہی باہر جاتا۔ کبھی لمبی سیر ہو جاتی کبھی پرانی کتابوں کی تلاش اور کبھی کسی کونے میں بیٹھ کر زندگی کے مسئلوں پر گہرا وچار۔ کبھی کبھی وہ لوگ اسے گھسیٹ کر پکچر وغیرہ لے جاتے۔ حالانکہ وہ اس پروگرام سے ہمیشہ کتراتا۔ زندگی ایسے ہی گزر رہی تھی۔ نیّا کنارے کنارے جا رہی تھی اور پانی میں موجوں کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔

شہر وہی تھا، گھر وہی تھا اور لوگ وہی تھے۔ لیکن پانچ سال کے عرصے میں بچے بڑے ہو گئے ہوں گے۔ رتنا کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ اتنی دور سے وہ شادی میں نہ آ سکا تھا۔ صرف ایک مختصر سا تار بھیج دیا تھا۔ "جیون میں دیپ جلتے رہیں راستوں میں پھول کھلتے رہیں۔" اسے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ اس کے نہ آنے سے ان لوگوں نے بہت برا منایا تھا۔ انھیں ہرگز یہ امید نہ تھی کہ زمانے کے ساتھ وہ بھی بدل جائے گا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ بدلا نہیں وہ کبھی نہیں بدلے گا۔ اب بھی وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ تمام غلط فہمیاں دور کر دے گا۔ سنا تھا رتنا بھی وہیں آئی ہوئی ہے۔

گھر کے باہر کار کھڑی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ سب لوگ گھر میں ہی تھے۔ برآمدے میں ایک کتا بیٹھا ہوا تھا۔ "ادت" اسے اچانک یاد آ گیا۔ یہ تو وہی کتا ہے۔ کیا نام تھا اس کا۔ کوئی موٹا سا تاریخی نام تھا اس کا۔ بے چارہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ بے چارے کتوں کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ بس دس بارہ سال۔ اور یہ کتا اب آٹھ سال کا تو ضرور ہو گا۔ کتا اٹھا اور اس کی طرف بڑے سست قدموں سے بڑھا۔ اسے کتوں سے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔ پتہ نہیں بھونکتے ہی حملہ کر دیں اور اگر نہ بھی کاٹیں تو بھی افراتفری میں انسان کی ساری "ڈگنٹی" درہم برہم ہو جاتی ہے۔ لیکن کتے کی دم ہل رہی تھی۔ تو کیا وہ پہچان گیا تھا ونود کو۔ اسے سخت ندامت کا احساس ہوا کہ اسے تو کتے کا نام بھی یاد نہیں تھا اور کتے نے پانچ سال کے بعد بھی اسے پہچان لیا تھا۔ اپنی خفت چھپانے کے لئے اس نے بڑی شفقت سے کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ اور اس کو ساتھ لیتے ہوئے برآمدے تک پہنچ گیا۔ کال بیل کا

بٹن دباتے ہی ساتھ والے کمرے سے اُٹھنے کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھلا اور اندر سے کسی نوجوان نے جھانکا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے ونود کو دیکھا اور پھر "ارے آپ" کہہ کر اس سے لپٹ گیا۔ اچھا تو یہ ستیش تھا۔" اماں یار تم پورے مرد بن گئے ہو۔ کیا کمال کیا ہے۔"

ستیش اسے اندر لے گیا۔ انکل نے کتاب سے نظر ہٹا کر ونود کو دیکھا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا وہ اسے پہچان نہ سکے۔ "ونود بھیا" ستیش نے اعلان کر کے انکل کا کام آسان کر دیا۔ "اچھا اچھا" کہہ کر انکل اُٹھے اور ونود کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے 'ہونہہ' کہہ کر گویا بہت کچھ کہہ دیا۔ ونود نے دیکھا اس کے سامنے کھڑا ہوا آدمی اب جوان نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ان کے بال پک گئے تھے۔ آنکھوں کی چمک دمک ختم ہو چکی تھی۔ ہلکی سی کھانسی میں زندگی کی آواز کم اور موت کی زیادہ تھی۔ ایسا لگتا کہ انکل زندگی کو کہیں پیچھے بھول آئے ہوں۔ اب وہ کچھ کھوئے کھوئے سے دکھائی پڑتے تھے۔ ان سے مل کر اسے خوشی کی بجائے شدید غم کا احساس ہوا۔

"گھر کے باقی لوگ کہاں ہیں؟" ونود نے گھر کے سونے پن کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ سب ہسپتال گئے ہوئے تھے۔ ہسپتال — خیر تو ہے نا — اوہو تو رتنا کے بچّہ ہوا ہے۔ صرف دو ہی دن ہوئے ہیں۔ آنٹی اور بے بی وہیں ہیں تو اسی لئے گھر سونا سونا لگ رہا ہے۔ "چلو ہسپتال چلیں۔" ونود نے مشورہ دیا۔

لیکن اب تو بہت دیر ہو چکی تھی اور ملنے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ انکل نے صلاح دی اور پھر نوکر کو بلا کر ونود کے لئے کھانا بنانے کو کہا۔ وہ سب لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ اسے اپنی خاطر کوئی بھی اہتمام پسند نہیں تھا۔ اس نے کہنا چاہا کوئی بات نہیں۔ پھر سوچا کون سنے گا میری بات۔ چلو جو بھی ملے گا کھا لوں گا۔

رات سونے کے وقت پھر اسے گھر کے سونے پن کا احساس ہونے لگا۔ یہ کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو۔ اتنے بور کیوں دکھائی پڑتے ہیں یہ سب لوگ۔ یہ سب گزشتہ پانچ سال کی برکت ہے کیا۔ شاید وہ بھی دوسروں کے لئے اتنا ہی بدل گیا ہو۔ تبھی تو اسے ایک دم پہچانا نہیں جا سکا۔ نہیں یہ سونا پن صرف آنٹی اور رتنا کی غیر حاضری کی وجہ سے ہے۔ ان سے مل کر سب کچھ دور ہو جائے گا۔ ان کے واپس آنے پر پھر گھر میں رونق آ جائے گی۔ سب کچھ خود ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ دو چار دن یہاں رک جائے گا۔ شاید اداسی کچھ کم ہو جائے۔

صبح ایک سرسری قسم کے بریک فاسٹ کے بعد وہ انکل کے ساتھ ہسپتال چلا گیا۔ انکل کو کسی ضروری کام سے کہیں اور جانا تھا۔ اس لئے وہ اس کے ساتھ اندر نہ جا سکے۔ اسے انھوں نے گیٹ پر ہی اُتار دیا۔ اور کمرے کا نمبر بتا کر کار آگے بڑھا دی۔ ونود نے سوچا۔ کیا ضروری کام ہو گا انکل کو جو وہ پانچ منٹ کو بھی نہیں آ سکے۔ جوں جوں انسان بڑا ہوتا جاتا ہے اس کے ضروری کام بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ اس نے انکل کو بلانا چاہا لیکن پھر سوچا، چلو جانے دو۔ ویسے بھی کار کافی دور جا چکی تھی۔

کمرہ اسپیشل وارڈ میں تھا۔ پاس جا کر اس نے دیکھا کمرہ ادھ کھلا تھا۔ دروازے کے شیشے پر اس نے انگلی سے تین چار بار ٹک ٹک کی۔ اندر سے آواز آئی۔ "کون؟ — آ جائیے!" یہ آنٹی کی آواز تھی۔ یہ پانچ سال کی مدت تھی جس نے آواز میں کچھ کمزوری کا اثر ڈال دیا تھا۔ یا شاید اسپتال میں اور خاص کر اسپیشل وارڈ میں لوگ آہستہ ہی بولتے ہیں کہ تندرست آدمیوں میں بھی زندگی کچھ دبی دبی سی رہتی ہے۔ اسپتال میں بیماریوں کا راج ہوتا ہے۔ تندرست کو تو صرف اس شرط پر داخلے کی اجازت ملتی ہے کہ وہ زیادہ شور نہ کرے۔ شاید وہ سمجھتی ہوں ڈاکٹر ہے یا نرسنگ نرس۔ کچھ بھی ہو اس ٹک ٹک سے انھیں یہ تو نہیں معلوم ہو گا کہ باہر "وہ" کھڑا ہے۔ پانچ سال کے بعد اکیلا۔ اس کی دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اور آہستہ سے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

ایک لمحہ کے لئے آنٹی نے اسے بیگانہ پن سے دیکھا

اور پھر "ارے تم کہاں سے آن ٹپکے نہ خط نہ پتر۔ وہی پرانی عادتیں۔" ونود نے ہاتھ جوڑ دئے۔ دائیں طرف پلنگ تھا جس پر رتنا لیٹی ہوئی تھی۔ رتنا کا صرف منہ اور بازو دکھائی دیتے تھے۔ باقی جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ چادر شاید وہ گھر سے لائے ہوں گے۔ اسپتال کی چادریں اتنی سفید اور اتنے اچھے کپڑے کی نہیں ہوتیں۔ اس نے رتنا کی طرف مڑتے ہوئے ایک ہی نظر میں رتنا اور اس کے بچے کی طرف دیکھ کر لمبا سا "ہیلو" کہا۔

رتنا کے جوان چہرے پر ایک مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اب بچی نہیں تھی۔ بچے کی ماں تھی۔ اس کی مسکراہٹ نے ونود سے کہا دیکھا اب میں کتنی بڑی ہو گئی ہوں۔ اب تو میں تمھارے برابر کی ہو گئی نا؟

آنٹی نے ونود کو کندھے سے ہلاتے ہوئے کہا "لڑکا ہے۔ سفید۔ بالکل رتنا کی طرح۔" اور یہ کہہ کر آنٹی نے رتنا کا منہ چڑا دیا۔

وہ جھکا اور کپڑوں میں لیٹی ہوئی اس ننھی سی انسانی زندگی کو دیکھنے لگا۔ اس عمر میں سب کے بچے ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق جو کوئی کچھ بھی کہہ دے ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ بچے کا بغور معائنہ کرکے اس نے بہت گہری مسکراہٹ کے ساتھ رتنا کو دیکھا اور پوچھا۔ "رتنا تم خوش ہو نا۔"

اس سوال میں کتنے ہی سوال تھے۔ وہ کس بات کے بارے میں پوچھ رہا ہے کہ وہ خوش ہے۔ شادی ہو جانے کی وجہ سے، یا بچہ ہونے کی وجہ سے، ماں باپ کے پاس آنے کی وجہ سے، یا 'ان' کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات کی وجہ سے، یا خود اس کی اپنی آمد کی وجہ سے۔

"بہت خوش۔" رتنا نے آنکھیں میچ کے کہا۔ اس کے اس چھوٹے سے جواب میں کتنے ہی جواب تھے۔ اس جواب نے ونود کو بتایا کہ رتنا کا شوہر اچھا ہے۔ اس کا خیال رکھتا ہے۔ وہ ماں بن گئی ہے اور اب اس کا ایک چھوٹا سا خوب صورت گھر ہے جہاں وہ کچھ دنوں کے بعد واپس چلی جائے گی۔ ونود کو گویا ایک دھکا سا لگا۔

وہ جیسے اس جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ "بہت خوش" اس نے پوچھنا چاہا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم کسی اور کے ساتھ کیسے خوش ہو سکتی ہو۔ یاد ہے نا تم نے مجھ سے پیار کیا تھا۔ میرے منع کرنے پہ بھی، میرے لاکھ سمجھانے پر بھی۔ اس دن جب میں اکیلا ڈرائینگ روم میں بیٹھا ریڈیو سن رہا تھا اور تم دوسری طرف سے پردے کے پیچھے سے وہی گانا گنگناتی ہوئی آئی تھیں، کیا بول تھے اس کے۔ 'من کی بات پیا مان جاؤ'۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا 'ہیلو'۔ جیسے ہمیشہ کہتا تھا جیسے آج بھی کہا اور تم نے میرے بازوؤں میں اپنے آپ کو ڈھیر کر دیا تھا۔ یہ سب چند ہی لمحوں میں اور بالکل انجانے میں ہو گیا تھا کم سے کم میری طرف سے۔ اچانک دوسری طرف سے نوکر آ گیا۔ تم نے ایک دم اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ نہ جانے نوکر نے کیا سوچا ہو۔ لیکن مجھے تو ایسا لگا جیسے تم نے یہ ان جانے پن میں نہیں کیا تھا۔ میں تو تمھیں بچی سمجھتا تھا لیکن شاید فلمیں دیکھنے کی وجہ سے یا شاید مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ لڑکیاں سب باتیں اتنی جلدی سمجھنا شروع کر دیتی ہیں۔ اس دن تم خوش تھیں اور آج بھی۔

"کیا سوچ رہے ہو۔" آنٹی نے گویا لاٹھی سی مار دی۔
"مٹھائی کھاؤ۔ میرا پہلا نواسہ ہے، چائے پیو گے؟"

"نہیں آنٹی تھینک یو۔ میں تو بریک فاسٹ کھا کے آیا ہوں۔ ہاں آپ کے بغیر کھانے میں مزہ نہیں آیا۔"

"منہ تو میٹھا کر دو نا۔" رتنا نے لیٹے لیٹے اپنی کمزور آواز میں اصرار کیا۔ "ہاں سب کچھ کھائے گا۔ ابھی چائے بناتی ہوں، ہمیں بھی تو کھانا ہے نا۔" آنٹی نے ادھر اُدھر سے چیزیں اُٹھانی شروع کیں۔ ایک ہی کمرہ تھا اور وہ پورا گھر بنا ہوا تھا۔ سب کچھ وہیں کرنا پڑتا تھا۔ اسٹوو کو میز پہ رکھ کر انھوں نے اسے صاف کرنا شروع کیا۔

ونود رتنا کے پلنگ کی پائیں بیٹھ گیا۔

"تمھارے "وہ" کیسے ہیں؟ کیا نام ہے ان کا؟ میں تو بھول ہی گیا۔"

"ہرلیش بہت اچھے ہیں۔ بہت سیدھے سادے آدمی ہیں۔"

"اور تمہاری ساس، وہ کیسی ہے۔ اچھی مرمت کرتی ہوگی۔"

"نہیں تو۔ بہت اچھی ہیں ماتاجی۔ بالکل امّی کی طرح مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔"

"اور۔" ونودنے تھوڑی دیر کے لئے سوچا۔ "اور گھر بار کیسا ہے؟"

"بہت خوب صورت ہے۔ دو نوکر ہیں۔ بڑا آرام ہے۔"

ونود نے رتنا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ وہی آنکھیں جن کے متعلق رتنا نے ایک بار کہا تھا "آپ کی یہ آنکھیں بڑی بڑی جوگنوں کا تپ بھسم کر دیں گی۔"

"تم ہر طرح سے سکھی رہو رتنا۔"

رتنا مسکرائی اور نظریں جھکا کر اپنے بچّے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس وقت وہ اتھاہ ممتا کی تصویر نظر آرہی تھی۔ بولی۔ "ہاں بھیّا میں سکھی ہوں ہر طرح سے۔ مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔" اور پھر لہجہ بدلتے ہوئے کہنے لگی۔ "آپ کبھی ہمارے گھر آیئے نا۔ میں نے آپ کے متعلق انھیں بہت کچھ بتایا ہے۔ وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"کیا کچھ بتایا ہے بھائی؟" اس نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا اور پھر دل میں ہی کہنے لگا ۔۔ بہت کچھ ۔۔ لیکن سب کچھ نہیں۔ وہ بھی بتایا ہے جس دن میں بیمار تھا اکیلا ہی بخار میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا یستیش اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا اور میرے علاوہ گھر میں صرف تمھیں تھیں۔ باقی شاید سب لوگ کہیں پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔

"چائے پروفیسر صاحب"۔ آنٹی نے چائے کا پیالہ بالکل اس کی ناک کے پاس لاتے ہوئے اور "صاحب" کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا "پانچ سال پہلے بھی جب وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوتا تو اسے جگانے کے لئے آنٹی ایسے کیا کرتیں۔ "پروفیسر صاحب!" اس کی پرانی چڑ تھی۔

پیالہ ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ آنٹی کو دیکھا۔ تو آنٹی کو وہ دن یاد ہیں۔ مجھے بھی سب یاد ہے۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔ اس زندگی کے دن کتنے سنہرے تھے، زندگی میں سکون تھا، طمانیت تھی، اداسی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ پھر بجائے کچھ کہنے کے اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا چائے کے ساتھ ہی اسے کمرے میں دواؤں کی ملی جلی بھینی بھینی خوشبو محسوس ہوئی۔ رتنا کے بستر کے سرہانے میز پر کئی دواؤں کی شیشیاں اور ڈبیاں پڑی ہوئی تھیں۔ گرائپ واٹر کی شیشی ٹنکچر آیوڈین اور پھر کئی ایک ٹانک، اس نے سب کے نام پڑھنا شروع کر دیئے۔ وٹامن بی کمپلکس، واٹربری کمپاؤنڈ، کورامن انجکشن (اس کی ضرورت کس کو پڑتی تھی، کس کا دل کمزور ہو گیا تھا آنٹی کا) اور سلفاگوناڈین کی گولیاں۔ یہاں آکر اس کی نظر رک گئی۔ اس کے لئے تبھی بھی تو یہ گولیاں لائی گئی تھیں۔ اس دن جب وہ بیمار تھا اور اپنے کمرے میں اکیلا لیٹا ہوا تھا۔ سب لوگ باہر گئے ہوئے تھے سوائے رتنا کے۔ اس کے بستر کے سرہانے بھی ایسی ہی میز رکھی ہوئی تھی اور میز پہ ڈھکا پانی کا گلاس اور یہ گولیاں۔ ہلکا سا بخار۔

اچانک دروازہ کھلا اور دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی رتنا بالکل ایک تصویر سی دکھائی دینے لگی "میں اندر آسکتی ہوں؟" رتنا نے وہیں کھڑے کھڑے سہمی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ضرور ضرور"۔ ونود نے آدھا اٹھتے ہوئے کہا۔ رتنا آکر اس کے بستر کی پائنتی بیٹھ گئی۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" رتنا نے بڑی اداسی سے پوچھا۔

"اچھی ہے۔ دیکھو تو۔ بخار تو اتر رہا ہے۔" رتنا نے اس کی بڑھائی ہوئی کلائی پہ بڑی نرمی سے انگلیاں رکھ دیں۔ جیسے نبض کی رفتار گن رہی ہو۔ پھر اسے دیکھتی ہوئی بولی۔ "آپ بیمار کیوں ہوئے ہیں؟ جب بھی آپ کو کچھ ہوتا ہے۔ میرا کلیجہ بیٹھ جاتا ہے۔"

ونود جواب میں صرف مسکرا دیا۔

"اور آپ ہیں کہ آپ کو پرواہی نہیں۔ نہ اپنی اور نہ کسی

اور کی۔"

رتنا نے جواب کا انتظار کیا اور پھر بولی۔" ٹھیک ہو جائیے نا۔" ونود نے رتنا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔" پگلی لڑکی۔" اس نے رتنا کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا اور رتنا نے اپنے آپ کو ونود کے بازوؤں میں گھر جانے دیا۔ اور اپنا سر اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔ وقت رُک گیا۔ ماضی، حال مستقبل سب، ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ ہر طرف سکون تھا، شانتی تھی، زمین نے اپنی گردش بند کر دی تھی۔ ان چند گھڑیوں میں انسانی خوشیوں کی کئی صدیاں منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ دفعتاً رتنا کو اپنی گردن کی پشت پر گرم گرم سانس کے چھونے سے محسوس ہوا کہ ونود کا بخار ابھی کافی تیز ہے پھر ونود نے رتنا کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔" اچھا دیکھو اب کوئی آجائے گا۔" اور آہستہ سے اس سے علیحدہ ہو گیا۔

"آپ بہت ڈرپوک ہیں"۔ رتنا نے ٹکور لگائی اور اٹھ کر کمرے کے باہر چلی گئی۔

بات یہیں تک رہی۔ وہ آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بچیاں تو سینما دیکھ کر نہ جانے کیوں ایکٹنگ کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ اسے اس بات کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے۔

اور پھر کچھ دنوں کے بعد نقشہ بدل گیا۔ اسے کام کے سلسلے میں دُور جانا پڑا۔ اور پھر رتنا کی شادی ہو گئی اور وہ اس شادی میں آنہ سکا۔ اب رتنا کے لڑکا ہوا ہے۔ اس دن وہ لیٹا ہوا تھا اور رتنا اس کے پائنتی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور آج وہ لیٹی ہوئی تھی اور ونود اس کی پائنتی بیٹھا ہوا تھا۔ چکر پورا ہو گیا تھا۔ رتنا کے بازو میں اس کے دو دن کا بچہ تھا اور وہ خوش تھی۔ ہاں ہاں دوبار ونود نے پوچھا تھا اور دونوں ہی بار رتنا نے یہی جواب دیا تھا۔" میں بہت خوش ہوں۔" وہ خوش کیسے ہو سکتی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا۔ اسے تو غمگین ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے انتظار میں، اس کی یاد میں، اس کے ہجر میں۔ رتنا کو مسکرانے کے بجائے آہیں بھرنا چاہیئے تھا۔ رتنا نے اسے چاہا تھا۔ اتنی جلدی بھلا وہ اپنا پیار کیسے بھول سکتی تھی۔ کیا اس نے ماضی کے سب دروازے بند کر دئے تھے۔ اس ماضی پر جہاں وہ اب بھی کھڑا تھا۔ اس کمرے میں، پلنگ پر، وہ میز اور سلفا گوناڈین کی گولیاں۔ اور یہ سب گولیاں۔ ہلکا سا بخار اب بھی تھا اسے۔ لیکن اب رتنا کا کلیجہ نہیں بیٹھا تھا۔ وہ خوش تھی۔ اس نے خود کہا تھا وہ خوش تھی۔ وہ جھوٹ تو نہیں بول رہی تھی۔ پانچ سال میں دنیا آگے نکل گئی تھی۔ لیکن وہ وہیں کھڑا ہر ایک چیز کو وہیں سے دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ ایک محور تھا دنیا اس کے گرد گھومتی تھی۔ ان پانچ سالوں میں جیسے دنیا نے اپنی عادت بدل دی ہو۔ گھومنے کی بجائے وہ آگے نکل گئی تھی اور وہ وہیں رہ گیا تھا۔ اکیلا اداس تنہا بے چارہ محور۔ آنٹی بھی محور کو چھوڑ کر باتھ روم میں نہانے کو چلی گئی تھیں۔ اس نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا جہاں لوگ تیزی سے چل رہے تھے تاکہ دنیا کے ساتھ ساتھ قدم رکھ سکیں۔ رتنا اس کی ہو سکتی تھی۔ یہ بچہ اس کا ہو سکتا تھا۔ رتنا ہر لشن کے بجائے اس کے بارے میں لوگوں سے باتیں کرتی ہوتی اگر وہ رک نہ جاتا۔ لیکن ۔۔۔ سچ بتاؤ رتنا۔ تم واقعی خوش ہو؟"

"تمھیں کیا ہو گیا ہے بھیّا؟ کہا تو ہے نا میں نے۔ میں بہت خوش ہوں۔ مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔ اور کیا چاہیئے تھا مجھے۔" ونود مسکرا پڑا۔ اس نے بچے کا ماتھا چوما۔ رتنا کے سر پہ بڑے بھائی کی طرح شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اُٹھ کر آہستہ سے باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر اس نے کمرے کا کواڑ آہستہ سے بند کر دیا ۔ آہستہ سے لیکن مضبوطی سے ہمیشہ کے لئے۔

رام لعل

دُکھ کی آتما

شنکھوں کی مدھر آواز نے ایک نئے دن کی آمد کا اعلان کیا۔ شری دھر ہوٹل کے کمرے میں کھڑکی سے لگا تاڑ کے اونچے پیڑوں کو دیکھ رہا تھا جو صبح کی نرم ٹھنڈی ہواؤں میں جھوم رہے تھے۔ کئی عورتیں اور مرد اس دیش کی صدیوں پرانی تمل بھاشا میں بھجن گاتے ہوئے مندر کی اور جا رہے تھے۔ اس طرح نئی صبح کا آغاز ہزاروں سال پہلے بھی کئی بار ہوا ہوگا۔ ہزاروں سال پہلے بھی صبح ہوتے ہی اس دھرتی پر سنہری دھوپ کی چادر بچھ جاتی ہوگی۔ اس دھرتی کے مندر اور گیت من کو بے اختیار کھینچتے ہیں۔

یاترا کرتے کرتے جب وہ دکھشنی بھارت آیا اور یہاں چٹانوں سے تراشے ہوئے عالیشان مندر دیکھے تو بالکل کھو سا گیا۔ وہ دھرم سے کہیں زیادہ آرٹ کے قریب تھا۔ ماضی پرست ہونے سے کہیں زیادہ وہ تاریخ کا ایک ذہین اور باشعور طالب علم تھا۔ گھومنا اور مشاہدہ کرنا اس کا خاص مشغلہ تھا۔ اسی میں اسے روحانی اطمینان ملتا تھا۔ ہر دو سال کے بعد وہ اتنا روپیہ یقیناً جمع کر لیتا جس سے دیش کے کسی ایک حصے کا سفر ممکن ہو جاتا۔ وہ تنہا ہی گھومتا تھا۔ تنہائی اس کے اندر افسردگی پیدا نہیں کرتی تھی۔ وہ دنیا کے ان خوش نصیب تنہا آدمیوں میں سے ایک تھا جو اپنی تنہائی سے ہی لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس بار تو وہ بے حد اداس نظر آ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو وہ اب کے اکیلا نہیں تھا۔ یاترا کے دوران میں ایک اور شخص بھی ساتھ ہو لیا تھا — پروفیسر مکرجی —

پروفیسر مکرجی اُسے جلگاؤں میں اچانک مل گئے تھے۔ پہلے سے ملاقات نہیں تھی۔ لیکن ان کی پُرکشش شخصیت نے جو اونچے قد، لمبی سفید داڑھی اور بکھرے بکھرے بالوں کے علاوہ گہرے بھورے رنگ کی پتلون اور اسی رنگ کے لمبے کوٹ سے مل کر بنی تھی، شری دھر کو پہلی نظر میں ہی متاثر کر لیا تھا۔ اس کا سر بے اختیار ایک بے نام سی عقیدت سے ان کے سامنے جھک گیا تھا جس کے لئے اُسے بعد میں کبھی ندامت نہیں ہوئی۔

جب اُسے معلوم ہوا کہ اجنتا کی بودھی خانقاہیں دیکھ لینے کے بعد پروفیسر مکرجی بھی جنوبی ہند کی طرف جائیں گے تو وہ بہت خوش ہوا تھا۔ اتنی بڑی شخصیت کا ساتھ مل جانا یقیناً ایک وردان ہی تھا! لیکن چند ہی منٹ کی گفتگو کے بعد شری دھر نے یہ جان لیا، مکرجی بے حد دکھی انسان ہے۔ بہت ہی افسردہ! وہ یاترا کے ذریعے سے اپنا من بہلانے نہیں نکلا ہے بلکہ خود کو اور دکھی بنانے، اپنی اداسی کو اور بڑھانے کے لئے، کسی ایسے اذیت پسند انسان کی طرح جو بار بار اپنے ہی زخموں کو کریدتا ہے اور اسی میں سکھ پاتا ہے۔

چناں چہ جب شری دھر نے دو ہزار سال پہلے کے مندروں کی دیواروں اور چھتوں پر آبی رنگ سے بنے روغنی فریسکوز کی تعریف کرنی چاہی تو مکرجی نے اُسے روک دیا۔ جیب میں سے پرانی تصاویر کا ایک بنڈل نکالا۔ پانچ دس ایسے فوٹو نکال کر دکھائے جو انہی فریسکوز کے تھے۔ کہا،

" یہ میری بیٹی وندنا نے کھینچے تھے ۔ وہ کلا اور گیان کے اس طویل سلسلے کو آٹھ سو برس تک چلنے والا ایپک کہا کرتی تھی ۔ ایک ایسی طویل نظم جس کی سنسکرتی تو ایک ہی ہے نکتۂ نظر بھی ایک ہی ۔ لیکن اُسی ایک ہی کلپنا کو ان مورتیوں میں ڈھالنے کا کام کتنی ساری نسلوں کے کتنے سارے ہاتھوں نے کیا تھا ۔ کیا یہ حیرانی کی بات نہیں؟"

انھوں نے شری دھر کو وندنا کے بارے میں بہت کچھ بتایا ۔

وہ بچپن سے ہی ان کے ساتھ تھی ۔ ساتھ ساتھ گھومتی تھی اور ذہنی تربیت پاتی تھی ۔ کوئی کوئی بچہ اپنے باپ کا ہی ہو رہتا ہے ۔ اپنی ماں کے ساتھ اس کا لگاؤ خاص نہیں ہوتا اور وہ اپنے باپ سے نہ صرف متاثر ہی ہوتا ہے بلکہ اسے بھی متاثر کرتا ہے ۔ مکرجی کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا وہ اپنی بیٹی کو بے حد چاہتے تھے ۔ ان کی بیٹی بے حد ذہین تھی ۔ بے حد تیز فہم اور بے حد ہی خوب صورت ۔ ایم اے تک تعلیم پائی ۔ اتنی اچھی تعلیم و تربیت کا محل مکرجی نے ایک اچھے باپ کی حیثیت سے خود اپنے ہاتھوں ایک ایک زینہ لگا کر تعمیر کیا تھا ۔ وہ ایک ایک اینٹ کے رکھنے اور جمانے کی کہانی شری دھر کو سفر کے دوران میں سناتے آئے تھے ۔ انھوں نے کہانی کو بار بار دہرایا بھی تھا ۔ جہاں جہاں وہ گھومتے پھرے تھے ، وندنا کا ذکر بھی چلتا رہا تھا بعض دفعہ کسی خاص جگہ کی خوب صورتی اسی کہانی کی بھینٹ چڑھ گئی تھی ۔ سفر کی آخری حد تک پہنچتے پہنچتے یہ سارا سفر شری دھر کو ایک نئی ہی قسم کا معلوم ہونے لگا ۔ اس سارے سفر میں پروفیسر مکرجی کی باتیں چلتی رہی تھیں جو ان کی بیٹی وندنا کے بارے میں تھیں ۔ وندنا اب زندہ نہیں تھی ۔ پچھلے سال اچانک چل بسی تھی ، بن بیاہی ہی! اس کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے ہی مکرجی ان سب استھانوں پر بھٹکتے پھرتے تھے جہاں جہاں وندنا کبھی ان کے ساتھ جا چکی تھی ۔

شری دھر نے مکرجی کا دل نہیں توڑا ۔ انھیں بولنے سے کہیں منع نہیں کیا ۔ کبھی کبھی وہ اوب گیا تب بھی ان کی باتوں میں دل چسپی دکھائی ۔ پروفیسر مکرجی ایسی شخصیت ہرگز نہیں تھے جن کا وہ مذاق اڑاتا یا بے توجہی دکھا کر ان کا دل توڑتا ۔ نہیں ایسا تو شری دھر بھی نہیں تھا ۔

شری دھر آج واپس جانے والا تھا ۔ مدورائی میں آج اس کا آخری دن تھا ۔ لیکن پروفیسر مکرجی کا وہاں سے ابھی جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا ۔ وہ وہاں سے ترچناپلی جانے والے تھے ۔ وہاں سری رنگم کے مندر کے ساتھ بھی وندنا کی یاد وابستہ تھی ۔

" اُس مندر کی چار سو چونتیس سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وندنا اوپر پہنچی تھی تو تھک کر چور چور ہو چکی تھی ۔ چاروں طرف نشیب میں پھیلی ہوئی ہری بھری دھرتی اور بہت سست رفتار سے بہتی ہوئی ندی کاویری کو دیکھ کر اس نے کہا تھا ۔ " اب آگے بڑھوں گی تو کاویری ندی کی طرح ۔ بہت ہی مندگتی سے !" —

—" لیکن وہ آگے کہاں بڑھ سکی تھی ! اس کے بعد وہ ادھر ہی لوٹ کر چلی گئی جدھر سے آئی تھی !"

یہ سب بتاتے بتاتے مکرجی کی آنکھیں ہمیشہ بھیگ بھیگ جاتی تھیں ۔

شری دھر وندنا کے بارے میں اتنا کچھ سن چکا تھا کہ اب وندنا اس کے دل و دماغ میں بس گئی تھی ۔ ایک تصور کی طرح نہیں' جیتی جاگتی ، سانس لیتی ہوئی ، دل چسپ اور ذہانت سے بھرپور باتیں کرنے والی لڑکی کی حیثیت سے ۔ اب شری دھر خود اس کے متعلق بہت کچھ بتا سکتا تھا ۔

شری دھر نے اچانک اپنے پیچھے کسی کو کھڑا ہوا محسوس کیا ۔ چونک کر سر گھمایا ۔ بوڑھے مکرجی مسکرا رہے تھے ۔

وہ پہلی بار اس طرح مسکرائے تھے ۔ شری دھر نے بڑی کربناک خاموشی سے دیکھا ۔ مکرجی کی آنکھوں سے ساری افسردگی غائب ہے ۔ بس ایک عجیب سے اطمینان کی جھلک ہے ۔

" چلو بھگوان گنپتی کا مندر بھی دیکھ آئیں !"

شری دھر نے کوئی جواب نہ دیا ۔ باہر دیکھنے لگا اُسی کھڑکی کے باہر ۔

" کیا ہوا شری دھر ؟" وہ آگے آ کر کھڑے ہو گئے ۔ " تم اتنے غمگین کیوں ہو ؟ کئی روز سے تمھارے اندر یہ تبدیلی دیکھ رہا ہوں ۔ تم پہلے کی طرح خوش کیوں نہیں رہتے ؟"

متری دھر کی آنکھوں میں دہی گہرا ملال تھا اور بڑی بے چینی سے کروٹیں لیتا ہوا غم کا سمندر!

مکرجی نے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دئے جھک کر اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ملائیں۔ "بتاؤ نا متر! آخر بات کیا ہے؟ بیس روز سے تم میرا ساتھ دے رہے ہو، اپنی محبت دے رہے ہو، سہارا دے رہے ہو۔ مجھے بہت کچھ کہنے کے لئے قیمتی وقت بھی، اور آج میں صرف تمہاری وجہ سے ہی خود کو ایک پہاڑ کے نیچے سے نکلتا ہوا سا محسوس کرتا ہوں۔ کتنی عجیب بات ہے میں اپنے اندر مسکرانے کے لئے ایک شدید خواہش بھی پاتا ہوں! لیکن جب ایسا ممکن ہو سکا ہے تو تم نے اپنا موڈ ہی بدل لیا ہے۔"

پروفیسر مکرجی اور متری دھر کے درمیان عمر کا بہت فاصلہ تھا۔ ایک لمبا فاصلہ۔ متری دھر نے اپنے بکھرے ہوئے کالے گھنے بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹا اور ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا:

"کونارک کے سورج دیوتا کا رتھ دیکھ کر وندنا نے کیا کہا تھا؟ سات گھوڑوں اور چوبیس پہیوں کی کوئی اور مثال اس دنیا کی مورتی کلا میں نہیں ملتی؟"

پروفیسر مکرجی کے چہرے سے حیرانی دُور ہو گئی۔ لیکن وہ اداس نہ ہوئے۔ اسی طرح مطمئن سے کھڑے کھڑے اُسے دیکھتے رہے۔ وہ متری دھر کی علگینی کا سبب کچھ کچھ سمجھ گئے۔ بولے،

"تمہیں میں نے بتایا تھا وندنا مر چکی ہے؟"

"بتایا تھا۔"

"پھر بھی تم وندنا کے لئے ——!"

آگے وہ کچھ نہ کہہ پائے۔ متری دھر کے سامنے سے ہٹ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اسی طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے جیسے کہہ رہے ہوں —— "کتنی عجیب بات ہے' میرا سارا دکھ متری دھر کے پاس کیسے چلا گیا —— ؟ وہ اس دُکھ کو کہاں تک ساتھ ساتھ لئے پھرے گا؟ کب تک!"

قیصر تمکین

ہزیمت

مشیر مرزا کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ ان کا پارہ چڑھ گیا۔ حسب عادت انھوں نے روٹیاں گنیں۔ دستر خواں میں کل چھ چپاتیاں تھیں۔ انھوں نے غصّے میں پوچھا۔ "ابھی سکندر کھانے میں باقی ہے؟"

لڑکیاں چپ ہوگئیں جس کا مطلب یہ تھا کہ ان چھ روٹیوں ہی میں دونوں باپ بیٹوں کو کھانا تھا۔ انھوں نے بغیر بگھاری ہوئی دال کے ساتھ جیسے تیسے کرکے ڈھائی تین روٹیاں زہر مار کیں اور محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔

واپس آکر وہ حسب معمول آنکھیں بند کرکے لیٹ گئے اور وظیفہ پڑھنے لگے۔ دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ ابھی کچھ زیادہ رات نہیں گئی تھی مگر سب لوگ اس طرح منہ ڈھانپے پڑے تھے گویا اب کبھی اٹھنا ہی نہ ہو۔ جب دستک کی آواز بڑھی تو مشیر مرزا سے ضبط نہ ہوا اور انھوں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ سکندر مست ہاتھی کی طرح جھومتا اکڑتا ہوا داخل ہوا۔ مشیر مرزا چپ چاپ پھر جاکر لیٹ گیے۔

دونوں لڑکیاں ابھی تک بنی ہوئی سوئی پڑی تھیں مگر بھائی کے آتے ہی ایک نے کروٹ بدلی کیونکہ اب بھائی کو کھانا کھلانے کے لیے تو اٹھنا ہی تھا۔

ساجدہ نے اٹھ کر کھانا گرم کیا اور جب تک سکندر کپڑے بدلے اس نے دسترخواں بچھا دیا۔ اس وقت دال کے ساتھ ایک تازہ تلا ہوا انڈا بھی تھا۔ سکندر اپنے کھانے کے بارے میں بڑا محتاط تھا اور ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ کھاؤں گا نہیں تو کماؤں گا کیا۔ "

روٹیاں صرف تین ہی تھیں۔ سکندر نے کچھ کہنا چاہا وہ شاید زور سے بگڑتا مگر ساجدہ نے ہونٹھ پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پہلے اس گھر میں ڈانٹنے ڈپٹنے کا حق صرف مشیر مرزا کو تھا مگر جب سے ان کی پنشن ہوئی اور بڑا لڑکا سکندر روزی سے لگا۔ یہ حق صرف سکندر کو حاصل ہوگیا۔ چناں چہ اب سب لوگ صرف اس کے غصّے سے ڈرتے تھے۔

مشیر مرزا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے آہٹوں پر دھیان دیا۔ ساجدہ باورچی خانے سے کچھ روٹیاں چھپا کر لائی اور سکندر کے سامنے رکھ دیں۔ مشیر مرزا وظیفہ بھول گئے۔ ان کے دل پر عجیب گھونسہ سا لگا۔ ان کو دکھ اس بات کا نہیں ہوا کہ انھوں نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا بلکہ قلق اپنی لڑکی کے کردار پر ہوا۔ مگر پھر ان کو یاد آگیا کہ سکندر مرزا جوان ہے، برسر روزگار ہے اور اس گھر میں ان کی پنشن کے بعد جو سرد جنگ کا ماحول پیدا ہوگیا ہے اس میں ان کی حیثیت ایک پیچھے ہٹتے ہوئے شکست پا سپاہی کی سی ہے۔

مشیر مرزا نے اپنی سو روپے ماہانہ کی آمدنی میں سات اولادیں پالی تھیں جن میں سے چار جوان لڑکے تھے۔ انھوں نے پچھلے بیس بائیس برس برابر بغیر گھی کی دال اور روٹی پر بسر کیے تھے اور صرف ایک وقت کھانا کھانے کی عادت ان کی اس وقت سے پڑ گئی تھی جب سے کہ تنخواہ اور بچّوں کی اسکول کی فیس میں تفاوت ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ مگر آج ان کے اشارۂ چشم و آبرو پر چلنے والی بھی ان کا

ساتھ چھوڑ چکی تھیں اور ہر بات پر لڑکے کے ساتھ ہو جاتیں ۔ شوہر کے بارے میں وہ یہی کہتیں ۔" اوہو انھیں بکنے دو ۔ ان کو تو جھک جھک کی عادت پڑ گئی ہے ۔"

سکندر نے کھانا کھاتے کھاتے پوچھا ۔ " تو پھر کل کیا بڑے پھاٹک والے آئیں گے ؟"

یہ بات شاہدہ کی نسبت کے بارے میں تھی اس لیے ساجدہ چپ رہی ۔ مگر اس کی ماں بستر پر میں کسمسائیں اور پھر سکندر کو خوش کرنے کی نیت سے اٹھ کر بیٹھ گئیں ۔ " ہاں محمدی بوا کہہ تو گئی ہیں ۔"

بڑے پھاٹک والوں نے شاہدہ کے لیے شادی کا پیغام بھیجا تھا اور ماں بیٹے آپس میں مشورہ کر کے اس سلسلے میں فیصلہ کیے ہوئے تھے ۔ مشیر مرزا سے کسی نے رسمی طور پر بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ مشیر مرزا کو غصہ آگیا ۔ ان کو خیال آیا کہ اب اگر وہ نہ چونکے تو ساری بازی ہاتھوں سے نکل جائے گی ۔ وہ کھنکھار کر اٹھ بیٹھے ۔ " یہ کیا پھاٹک والوں کا کیا قصہ ہے ؟"

سکندر کو اس دخل در معقولات پر غصہ آگیا مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے بیوی بول اٹھیں " اے وہی شاہدہ کی نسبت کی بات ۔ ایسے بن رہے ہیں جیسے بچہ ہوں کچھ معلوم ہی نہ ہو ۔

" کس مردود نے اس نسبت کی بات کی ۔ " مشیر مرزا نے زور سے اپنی پرانی آن بان والی آواز نکالی جس میں آج بھی نہ جانے کیوں ایسی گرج تھی کہ سب سہم اٹھے ۔

" ارے دھیرے دھیرے بولیے ۔ محلے والے کہیں گے کہ کیا رات دن ان کے یہاں ادھم مچا رہتا ہے ۔ " بیوی نے آواز دھیمی کر کے ایک بہت ہی درشت لجاجت سے کہا ۔

" میں نے کہہ دیا ۔ میری زندگی میں شاہدہ کا رشتہ اس لفنگے لچے رضوان کے ساتھ نہیں ہو سکتا ۔ " یہ آواز اپنی بازگشت کے ساتھ دور دور تک گونج گئی اور سکندر نے بڑا سا لقمہ نگلتے ہوئے پہلو بدلا ۔ " میں نے کہا اب آپ چپ بھی ہوں گے کہ نہیں ۔ "

بیوی نے فوراً ہلکے کے خیال سے شوہر اور بیٹے کے ہاتھ جوڑنا شروع کر دئے مگر مشیر مرزا اپنے جلال پر آچکے تھے اور انھوں نے انگریزی کا سہارا لیا ۔ " یو شٹ اپ "

انگریزی میں ڈانٹنے سے یہ فائدہ تھا کہ آواز کی گرج میں اضافہ ہو جاتا اور محلے کی عورتیں جو ادھم ہنگامے کی آواز سنتے ہی تمام کام چھوڑ کر بڑے ذوق شوق سے اس طرف کان لگا دیتی تھیں ، لڑائی کے چٹ پٹے پن سے محروم رہ جاتیں ۔

ماں بہنیں سکندر کے ہاتھ جوڑتی ہوئی اس کو الگ گھسیٹ لے گئیں اور مشیر مرزا دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے ہوئے دیر تک غصے میں ٹہلتے اور بڑبڑاتے رہے ۔

دوسرے دن مشیر مرزا اپنے پنشن کے کاغذات پر دستخط کرانے اور بنک کا چکر کاٹنے میں مصروف رہے اور گھر میں شاہدہ کی شادی کی بات طے بھی ہو گئی ۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ عجلت سکندر کو تھی جو جلد سے جلد گھر کے ممبروں کی تعداد گھٹنے کا متمنی تھا ۔

مشیر مرزا زیادہ تر وقت نماز اور وظائف میں گزارتے اور گھر میں شاہدہ کی شادی کی تیاریاں ہوتی رہتیں ۔ وہ جب اندر داخل ہوتے تو سب لوگ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے ۔ کبھی وہ دیکھتے کہ ماں بیٹیوں میں بہت ہی رازداری سے تبادلۂ خیال ہو رہا ہے مگر ان کے آتے ہی باتوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا اور بیوی مصنوعی غصّے کے ساتھ بات بدل کر ساجدہ کو ڈانٹتیں ۔ " اے یہ سوئی تم نے پھر کھو دی نا ۔ مجال ہے کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر رکھی مل جائے ۔"

مشیر مرزا بعض وقت سب کے بیچ میں ایک کرسی ڈال کر بیٹھ جاتے ۔ مگر جتنی دیر وہ بیٹھے رہتے ایسی کشیدگی کی فضا رہتی کہ ایک ایک کر کے سب لوگ کسی نہ کسی طرح ہٹ جاتے اور وہ اکیلے جھک مارتے رہ جاتے ۔

ایک دن مشیر مرزا بیٹھے تھے کہ ایک مراثن آگئی اور اس نے بہت ہی خوشامدی لہجے میں کہا " میاں مبارک ہو ۔ اب چار ہی دن میں بیٹی اپنے گھر بار کی ہو جائے گی ۔ "

مشیر مرزا سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی انتہائی ناگواری اور بہت ہی سنسنی خیز بیباکی سے بولے ۔ " کس کی شادی ۔ کیسی

شادی۔ میری مرضی سے کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔"

مشیر مرزا کی بیوی سناٹے میں رہ گئیں۔ عورت بھی دنگ رہ گئی۔ مشیر مرزا یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے۔ "میں اپنے جیتے جی اس تقریب میں شرکت نہیں کروں گا۔"

بیوی گھبرا گئیں۔ مشیر مرزا نے بہت ہی تلخی اور کچھ بہت ہی مایوسی میں یہ جملے کہے جن کی چبھن اور درد انگیزی کو وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس کے علاوہ ان کو یہ بھی ڈر تھا کہ مراثن کس طرح ان سب باتوں کا بتنگڑ بنا دے گی۔

اور آخر ہوا بھی یہی۔ ادھر تو بیوی مشیر مرزا کی منت سماجت کرنے لگیں کیونکہ ایک یہی راستہ رہ گیا تھا اور دوسری طرف مراثن نے جا کر پوری بات نمک مرچ لگا کر لڑکے والوں میں کہہ دی۔ وہ لوگ بھی چونک گئے۔ اتنا اندازہ تو سب کو تھا کہ مشیر مرزا کی مرضی کے خلاف یہ شادی ہو رہی ہے۔ مگر یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ حالات اتنے سنگین ہیں۔

شام تک دو تین آدمی مشیر مرزا سے ملنے آ پہونچے۔ انھوں نے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد پوچھا: "تو پھر اس تقریب میں آپ کی شرکت یقینی نہیں ہے۔"

تب تک مشیر مرزا کا دل بیوی کی منت سماجت سے پگھل چکا تھا اور کچھ وہ خود بھی معاملے کی نزاکت محسوس کر چکے تھے اس لیے فوراً بولے۔ "کیوں نہیں، کیوں نہیں؟"

پوچھنے والے شرمندہ ہو کر بولے۔ "نہیں مطلب یہ ہے کہ آپ شاید کچھ زیادہ اس کی موافقت میں نہیں تھے۔"

"اگر میں موافقت میں نہیں تھا تو یہ رشتہ ہو کیسے رہا ہے؟" انھوں نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اور ایک خاص انداز سے سیدھے ہاتھ کا پنجہ گھماتے ہوئے کہا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر اس واقعے کے بعد لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ مشیر مرزا نے طوعاً کرہاً اس رشتے کو منظور کر لیا ہے۔ اس لیے اب ذرا اطمینان اور قدرے بے خوفی سے ان کی موجودگی میں کپڑوں کی سلائی اور دوسرے انتظامات کا ذکر کرنے لگا۔ پھر بھی مشیر مرزا اپنے میں اپنی ٹانگ اڑانے سے باز نہ آئے۔ مثلاً ایک دفعہ جب لوگ فراک اور جمپر کی سلائی کی باتیں کر رہے تھے کئی عورتوں کی موجودگی میں وہ بگڑ کر بولے: "فراک ہمارے یہاں نہیں سلے گی۔ غیر شرعی چیز ہے۔"

"اے ہے آپ عورتوں کی باتوں میں مت بولا کیجیے"— بیوی نے کہا۔ مگر مشیر مرزا تقریباً نیم دیوانگی کے انداز میں ڈپٹ کر بولے۔ "کیسے نہ بولوں، میری لڑکی کی شادی کی بات ہے۔ میرے ہوتے میری لڑکی فراکیں جمپر نہیں پہنے گی۔ صرف قمیصیں سلیں گی، قمیصیں سن لیا —؟"

سب لوگ چپ ہو گئے۔ فراکیں سلتی رہیں۔ بقول مشیر مرزا انتہائی غیر شرعی قسم کی فراکیں، چست جمپر، بغیر آستینوں کی فراکیں — مگر مشیر مرزا کی موجودگی میں ان کا نام "قمیصیں" لیا جاتا۔

بارات کے کھانے کی فہرست تیار کی جانے لگی۔ مشیر مرزا نے جھنجھلا کر پھر غصے سے کہا "یہ سب کہاں سے آئے گا؟ کس برتے پر بڑائی دکھائی جا رہی ہے۔ بس سادہ سالن اور روٹی کافی ہے۔ ہماری حیثیت ہے کہ ہم پلاؤ اور مرغ کا انتظام کریں۔"

ایک بار پھر ان کی اور سکندر کی مڈبھیڑ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ بہنیں اور بھائی بیچ میں پڑے۔ "رہنے دیجیے بھائی صاحب رہنے دیجیے۔ آپ ابا میاں کو بکنے دیجیے۔ ان کے جانے والے آئیں گے تو خالی سالن روٹی کھلا دی جائے گی۔ بارات کا کھانا تو ڈھنگ کا ہونا چاہیے۔ نہیں تو سب تھو تھو کریں گے۔"

مہمانوں کی فہرست تیار کی جانے لگی تو مشیر مرزا نے اپنی رضاعی بہنوں، مشفق بہن، قیامن بہن اور رفیقن بہن کے نام گنائے۔ اس بار بیوی بپھر اٹھیں۔ "یہ سب حرام خوریں، کام کے وقت منھ نہیں دکھائیں۔ روٹیاں توڑنے اور عیب نکالنے آ جائیں گی۔"

"خاموش۔ بس ایک حرف جو منھ سے نکلا۔ اب تمھاری یہ ہمت کہ میرے سامنے میری دودھ شریکی بہنوں کو حرام خور کہو — حرام خور تم — تمھارے گھر والے۔ تمھارے باپ دادا تمھارے..."

ہرچند کہ سکندر اس وقت گھر میں نہیں تھا اور سب بیٹی بیٹے ماں پر چپ رہنے کے لیے زور دے رہے تھے مگر مشیر مرزا کی بیوی نہ مانیں اور ہم کر لڑنے کو تیار ہو بیٹھیں۔ "میں کہتی ہوں نہ شفق بہن، نہ رفیقن بہن کوئی نہیں آئے گا اگر یہ ٹنیاں آئیں تو میں چوڑیاں پیس کر کھا لوں گی۔ اے ہاں کوئی سگی بہن ہو تو برداشت کرے...."

مشیر مرزا جزبز ہوئے اور ڈپٹ کر بولے۔ "میں نے کہا کہ تم چپ بھی رہو گی کہ....."

" کہ کیا — کیا کر لیجئے گا آپ — میں نہیں چپ رہوں گی۔ نہیں چپ رہوں گی....."

اتنے میں دو چار ملنے والیاں آ گئیں۔ مشیر مرزا اخبار دیکھنے لگے اور بیوی بڑی شاداب اور شگفتہ مسکراہٹ چہرے پر لا کر بولیں:-

"آؤ آؤ بہن، بڑی دیر کر دی۔ ابھی تمھارے بھائی صاحب کہہ ہی رہے تھے کہ کیا بات ہے احتشامن بہن نہیں آئیں۔"

پھر ذکر چھڑ گیا اگلی پچھلی تمام تقریبوں کا — اور مشیر مرزا ظہر کی نماز پڑھنے مسجد چلے گئے۔

شادی کے دن لڑکے والوں نے کچھ ٹانگیں پھیلائیں اور دولھا میاں نے اپنے مطالبات کی ایک فہرست پیش کی۔ ابھی تک تو مشیر مرزا سب سے خندہ پیشانی سے پیش آ رہے تھے۔ دولھا میاں کی خواہشات سن کر آگ بگولا ہو گئے اور تیر کی طرح دولھا میاں کے پاس پہونچے اور تلوار کی دھار کی طرح تیز اور کاری طنز کے لہجے میں بولے "میاں صاحبزادے تمھارے باپ دادا نے بھی کبھی ریفریجریٹر دیکھا تھا۔"

محفل میں سناٹا چھا گیا۔ قاضی صاحب ذرا پیچھے کھسک کر بیٹھ گئے اور دولھا میاں برہم ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے — "یہ میری بے عزتی ہے۔"

"بے عزتی — ؟؟ عزت ہے کس کی برخوردار — زندگی بھر مسجدوں میں خیرات کی روٹیوں پر پلنے والے تمھارے باپ کو میں نے ہی پڑھایا۔ میں نے ہی مولوی چراغ حسن کو حیدر آباد بھجوا کر وظیفہ دلایا۔ بھول گیے اپنی حیثیت آج۔ اللہ کی شان آج تم کو ریفریجریٹر چاہیئے — تمھاری حیثیت کیا ہے۔ ہو، سوا سو کی کلرکی پر یہ نخرے ہیں۔ اگر کچھ ہوتے تو کیا کرتے — ؟"

سکندر آگے بڑھا اس نے باپ کو پیچھے کھینچا اور سب سے کہنے لگا "آپ ان کی باتوں کا برا نہ مانیئے گا۔ آج کل ان کا دماغ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" دو تین اور آدمیوں نے مشیر مرزا کو پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے ان کو لے جا کر کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ لالہ گوری شنکر افسوس کرتے ہوئے کہنے لگے — "چچ چچ۔ ایشور موت دے دے پر پاگل نہ کرے —"

لیکن مشیر مرزا کی تلخ بیانی بھی کام کر گئی۔ دولھا میاں اور ان کے ساتھیوں کو اپنی حیثیت اچھی طرح یاد آ گئی۔ پھر دولھا میاں کو شاہدہ کا خیال آیا۔ پھر وہ تمام گھرانے بھی یاد آئے جہاں سے ان کی شادی کے پیغام مسترد ہو چکے تھے۔ وہ سکندر کے دو ہی چار جملوں میں من گئے — انھوں نے سوچا "ارے ہاں پاگل کی بات کا برا کیا ماننا۔"

مبارک سلامت کا شور پھر گونجا۔ رات گئے تک شادی کی تقریب اور چہل پہل جاری رہی۔ اندھیری کوٹھری کے کونے میں مرزا چیختے چلّاتے اور بکتے جھکتے سچ مچ پاگل ہو چکے تھے۔ انھوں نے دیوار سے اپنا سر پھوڑ لیا تھا اور بے ہوشی کے عالم میں معلوم نہیں کیا کیا بڑبڑاتے ہوئے آخری سانسیں لے رہے تھے۔ کسی کو اس طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

شاہدہ رخصت ہو کر سسرال جا رہی تھی۔ ہاں مگر مشیر مرزا کے جیتے جی نہیں۔

دفاع اور



ترقی کا کام



ساتھ ساتھ چلتا ہے

دفاعی کوششوں میں براہِ راست شریک ہونے کے لئے فولاد کی صنعت نے اپنی پیداوار بڑھا دی ہے اور رولنگ ملوں کے پیداواری پروگراموں میں ضروری ترمیم و تبدیلی کر دی گئی ہے۔ مسلح افواج کے کام میں آنے والی موٹر گاڑیوں کا معیار مقرر کر دیا گیا ہے۔ انجینیئری صنعت کی صلاحیت بھی بڑھا دی گئی ہے۔ برقی پلانٹ چالو کرنے کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ جنگی صورت میں استعمال کے لئے جنریٹر سیٹوں کا ایک ذخیرہ بنایا جا رہا ہے۔ ریلوے ورکشاپوں سے زیادہ تعداد میں مال ڈبے بن کر نکل رہے ہیں۔ اہم و دوسری سڑکوں کو بہتر اور جدید بنایا جا رہا ہے۔

ان نئی ترجیحات سے ملک کے دفاعی نظام کی مضبوط بنیاد تیار ہو رہی ہے۔ اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے جی جان سے ہاتھ بٹایئے۔



پلان کو
کامیاب
بنایئے

بھارت کے دفاع کو
مضبوط کیجئے

DA 63/447

ترتیب

سرورق :- کشمیر میں دھان کی فصل
رسالے کی پشت پر :- گوآ کا لوک نرتیہ

جلد ۲۴ - نمبر ۲

بھدراشک سمت ۱۸۸۶
ستمبر ۱۹۶۴ء

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل دہلی

مجلسِ ادارت

محمد مجیب — جامعہ ملیہ دہلی
گوپی ناتھ امن — دہلی
خواجہ احمد فاروقی — دہلی
عبدالقادر سروری — سری نگر
یو - ایس - موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
شنکر دیال ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی نجنا ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)
بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو (سکریٹری)
(مدیر مسئول)

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- شہباز حسین

سالانہ چندہ :-
ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ :-
ہندوستان میں :- ۶۰ پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

مُلاحظات

رشوت ستانی اور بدعنوانیوں کے انسداد کے لئے سداچار سمیتیوں کا قیام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کسی ملک کی ترقی و فلاح کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ اس کا معاشرہ اس لعنت سے پاک ہو۔ ورنہ غلط طریقوں اور ناجائز حربوں کے استعمال کی وجہ سے بڑا عدم توازن پیدا ہو جائے گا جو ملک کی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہوگا۔

اس لعنت کو دور کرنے کے لئے جہاں ایک طرف نگرانی، طریق کار میں ترمیم اور سزاؤں کی ضرورت ہے وہاں دوسری طرف معاشرے کے اخلاقی شعور کو بھی جگانے کی ضرورت ہے۔ انتظامیہ کے لوگ بھی معاشرے کا ہی ایک حصہ ہیں۔ لہٰذا اگر ہمارا سماج ان کی غیر سماجی حرکتوں کو برداشت نہ کرے اور بڑی سختی اور شدت کے ساتھ اس سے بیزاری کا اظہار کرے اور بے ایمان افراد کا پول کھول دے تو لوگوں کا ایسا رویہ قانون کی سخت گیریوں سے زیادہ مؤثر ثابت ہوگا۔ خود شری نندہ کو اس بات کا پورا احساس ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ کرپشن سرطان کی ایک ایسی بیماری ہے جو گہری جڑیں پکڑے ہوئے ہے۔ اس کے انسداد کے لئے ہر ایک کو مختلف سمتوں سے اس پر حملہ کرنا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر سیاسی کارکن صحیح لگن سے اس کام میں جٹ جائیں اور کرپشن کے خلاف دیش کے لکھو کھا نیک افراد کی کوششوں اور عام آدمیوں کی حمایت کو حرکت میں لے آیا جائے تو جلد ہی بدعنوانیوں پر قابو پا لیا جائے۔

ضرورت ہے کہ ملک کا ہر شہری حکومت کی قائم کردہ ایجنسیوں سے تعاون کرے اور خود اپنے اعمال و کردار کا بھی محاسبہ کرے۔

اجتماعی ترقی اور پنچایتی راج دیہی ہندوستان کی ترقی و خوش حالی کے لئے بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس پروگرام نے بارہ سال کی قلیل مدت میں کئی کارِ نمایاں انجام دئے ہیں۔ ہندوستان کے ۵½ لاکھ گاؤوں کو پس ماندگی اور بدحالی کے راستے سے ہٹا کر ترقی و خوش حالی کے راستے پر آگے بڑھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

۲۰- جولائی ۱۹۶۴ء کو دلّی میں اجتماعی ترقی اور پنچایتی راج کی سالانہ کانفرنس ہوئی۔ اس کا افتتاح کرتے ہوئے شری اشوک مہتہ نے کہا کہ ترقی کے لئے موجودہ حالات سے بے اطمینانی اور بہتر حالات قائم کرنے کے لئے لگن دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ آپ نے مزید کہا کہ یہ ادارے ایک سماجی فضا تیار کرتے ہیں اور ان کی توسیع یا تقویت خود ترقی کا ایک عمل ہے۔ اس وقت ملک کو زیادہ پیداوار کی سخت ضرورت ہے اور ان اسکیموں کو فروغ دے کر اور کامیابی سے ان پر عمل درآمد کر کے ہم اپنا مقصد بخوبی پورا کر سکتے ہیں۔

مرکزی وزیر برائے اجتماعی ترقی و امداد باہمی نے کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ان چار مقاصد کا ذکر کیا جنھیں پردھان منتری نے قوم کے سامنے رکھا ہے۔ یعنی عوام کے لئے کم سے کم مدت میں بعض ضروری سہولتوں کا انتظام، بے روزگار کے لئے روزگار کے مواقع پیدا کرنا۔ زرعی پیداوار بڑھانے پر انتہائی زور اور کمزور و غریب طبقوں کی بھلائی اور آرام کا خاص انتظام۔ ان مقاصد کو پورا کرنے میں اجتماعی ترقی، پنچایتی راج اور امداد باہمی کی انجمنوں کو نمایاں حصہ لینا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ان سے جو مقاصد وابستہ کئے گئے ہیں وہ ضرور پورے ہوں گے اور ایک بہتر اور خوش حال ہندوستان وجود میں آئے گا۔

اردو میں ڈرامائی ادب کو فروغ دینے کی خاطر آندھرا پردیش کی ساہتیہ اکادمی نے اردو ڈراموں کا ایک مقابلہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے سب سے بہترین ڈراما نگار کو ۱۱۱۶ روپے انعام دیا جائے گا۔ اس میں تمام ہندوستان کے اردو ڈراما نویس حصہ لے سکتے ہیں۔

منظفر حنفی ہسوی

شعرائے زنداں

آگرہ جیل کا سیاسی مشاعرہ —— مولانا عارف ہسوی (مرحوم)

ہسوہ (فتحپور۔ یو۔پی) بڑے باکمالوں کی بستی رہی ہے۔ وحید ہسوی، احسان ہسوی وغیرہ انیسویں صدی اواخر کے مقبول و مشہور شعرأ تھے۔ اوّل الذکر اس زمانے میں فتحپور سے "سحرِ بابل" نامی ایک رسالہ نکالتے تھے اور بذاتِ خود صاحبِ دیوان و تقریباً ڈیڑھ درجن کتابوں کے مصنّف تھے، مولانا محمد فائق ہسوی اور مولانا عبدالسلام ہسوی انیسویں صدی کے صاحبِ کمال بزرگوں میں گزرے ہیں۔ جو ہندوستان گیر شہرت کے مالک اور درجنوں مذہبی و علمی کتب کے خالق تھے۔ محمد فائق صاحب کا مزار میرٹھ میں مرجع خلائق بنا رہتا ہے۔ اور مولانا عبدالسلام ہسوی خاص ہسوہ میں مدفون ہیں اور ان سے صوفیائے کرام کا ایک وسیع حلقہ متعلق ہے۔

مولانا عارف ہسوی اواخر انیسویں و اوائل بیسویں صدی کی نمایاں شخصیتوں میں تھے۔ موصوف شاعر ہونے کے علاوہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے بے حد جوشیلے اور صفِ اوّل کے رہنماؤں میں سے تھے اور دہلی میں ۱۹۱۵ء میں اخبار 'خطیب' کے بابِ سیاست کے مدیر تھے۔ پھر اخبار 'انقلاب' دہلی کے ایڈیٹر رہے۔ یہ اخبار جلد ہی انگریزوں کے عتاب کا شکار ہو گیا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر کا روزنامہ 'ہمدرد' جو صحافت و سیاست کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، دہلی سے نکلتا تھا۔ مولانا محمد علی بڑے چاؤ سے انھیں اپنے ادارے میں لے گئے۔ مولوی عبدالحمید خاں کے رسالہ 'مولوی' کے اس زمانے کے شذرات و سیاسی کالم مولانا عارف ہسوی ہی کے قلم ہی کا نتیجہ ہیں۔ راشد الخیری، خواجہ فضل احمد رشید، بھیّا احسان الحق (میرٹھی) وغیرہ موصوف کے مقربانِ خاص میں سے تھے۔ موصوف تحریکِ آزادی کے سلسلے میں اظہارِ خیال کو اپنی انتہا تک لے جانا چاہتے تھے اس لیے عمر بھر گھوم پھر کر جوشیلے مضامین لکھتے اور جیل جاتے رہے۔ ۱۹۱۹ء میں جب سردار دیوان سنگھ مفتون نے روزنامہ 'رعیت'، مالی دشواریوں کی بنا پر بھیّا احسان الحق کو فروخت کر دیا اور نیاز فتحپوری اس کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے تو مولانا عارف ہسوی اخبار مذکور کی معتدل پالیسی کے مخالف تھے کیوں کہ وہ ان کی انتہا پسند طبیعت سے لاگ نہ کھاتی تھی۔ آخر یہ اخبار بھی بند ہو گیا اور مولانا عارف نے اس سلسلے میں جشنِ مسرت منعقد کیا۔

آپ نے دلّی پراونشل کانگریس کمیٹی کی طرف سے اخبار 'کانگریس' نکالا۔ جس کے اداریوں اور مضامین کی بے باکی اس دور میں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا جگرے کے لوگ تھے۔ مولانا عارف ہسوی پراونشل کانگریس کمیٹی کے صدر بھی تھے۔ اخیر اخیر جب جیل گئے تو سلطان

کاشکار ہو کر باہر آئے اور ۱۹۳۶ء میں انتقال فرمایا۔ موصوف کی بیوہ آج بھی ہسوہ میں کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

مولانا عارف ہسوی سیاست سے ہٹ کر ایک شاعرانہ شخصیت کے مالک بھی تھے اور دورانِ قیام جیل میں اکثر مشاعرے وغیرہ منعقد کرتے رہتے تھے۔ جس زمانہ میں موصوف آگرہ جیل میں تھے، کئی دوسرے سیاسی قیدی مختلف جیلوں مثلاً الہ آباد، فتح گڑھ، میرٹھ، متھرا وغیرہ سے آگرہ جیل میں منتقل کر دیئے گئے تھے۔ ان سیاسی قیدیوں میں بہت سے شاعر بھی تھے جن کی شرکت سے مولانا عارف ہسوی کے مشاعرے جیل میں منعقد ہونے کے باوجود ہر لحاظ سے آج کے آل انڈیا مشاعروں سے بلند نظر آتے ہیں۔ اسی قسم کے ایک مشاعرے کی کارروائی مولانا عارف ہسوی کی ترتیب دی ہوئی بجنسہٖ درج ذیل ہے۔ اس مشاعرے کے شرکاء میں مولانا خجندی میرٹھ، عبدالمجید خواجہ پرنسپل نیشنل یونیورسٹی علی گڑھ، رگھوپتی سہائے فراق، شاہد فاخری، کرشن کانت مالویہ، صغیر حسن شاہ الہ آبادی، بہابیر تیاگی، محمد عثمان علی گڑھ، زمرد سکندر آبادی، حفظ الرحمٰن فرخ آبادی، رام نریش ترپاٹھی، احمق پھپھوندوی زمانہ مذکور و زمانہ حال کے صفِ اول کے سیاسی لیڈروں میں تھے اور ہیں۔ افسوس کہ مسودہ پیشِ نظر سے صحیح سنہ اس مشاعرہ کا معلوم نہیں ہوتا لیکن گمان غالب ہے کہ یہ مشاعرہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں کبھی آگرہ جیل میں منعقد ہوا تھا۔ (مظفر حنفی ہسوی)

---

(۱) مولانا خجندی میرٹھ - ۶ ماہ قید

(۱) تشنہ کامی پہ مرے آپ کا احساں نہ ہوا
آبِ خنجر سے بھی تسکین کا ساماں نہ ہوا

۲- دار پہ وار کئے پھر بھی میں بے جاں نہ ہوا
ہے یہ ارمان کہ پورا مرا ارماں نہ ہوا

۳- اور ایجاد کرو ظلم و ستم کے انداز
پورا مطلب نہ ہوا آپ کا ہاں ہاں نہ ہوا

۴- منزلِ عشق پہ پہنچا نہیں کوئی، جب تک
پابجولاں نہ ہوا چاک گریباں نہ ہوا

۵- ذرہ ذرہ میں نظر آتا ہے کس کا جلوہ
رازِ وحدت ترا کثرت میں بھی پنہاں نہ ہوا

۶- آسماں سمجھے ہیں جس کو وہ مری آہیں ہیں
عرش رس کب مرا دودِ دلِ سوزاں نہ ہوا

۷- خلعتِ غیر سے بہتر ہے لنگوٹی اپنی
جذبۂ عشق میں حارج تنِ عریاں نہ ہوا

(تمام غزل مرصع اور استادانہ تھی، بہت پسند کی گئی۔ مولانا کی غزل سب سے آخر میں ہوئی عارف ہسوی)

(۲) مسٹر عبدالمجید خواجہ پرنسپل نیشنل یونیورسٹی علی گڑھ ۶ ماہ قید محض

۱- کس کو سودا ترا اے زلفِ پریشاں نہ ہوا
کون پابندِ بلائے شبِ ہجراں نہ ہوا

۲- یاد رہتی ہے ترے مصحفِ عارض کی سدا
مجھ سے بڑھ کر تو کوئی حافظِ قرآں نہ ہوا

۳- کاوشِ وحشتِ جنوں ہے ہمیں اس درجہ پسند
کبھی تلووں سے جدا خارِ مغیلاں نہ ہوا

۴- شور ہے محفلِ عشاق میں وہ آتے ہیں
فتنۂ حشر ہوا، جلوۂ جاناں نہ ہوا

۵- بسکہ سینے میں چھپائی ہے تمہاری تصویر
ہم سے وحشت میں کبھی چاک گریباں نہ ہوا

۶- ناتوانی کی یہ حالت ہے کہ کہنا تو کجا
میرے چہرے سے بھی ظاہر غمِ پنہاں نہ ہوا

۷- تو وہ قطرہ ہے کہ پوشیدہ تھا دریا جس میں
تیری نادانی کہ برپا کبھی طوفاں نہ ہوا

۸- میں وہ ذرہ ہوں کہ پوشیدہ ہے صحرا جس میں
قید ہو کر بھی اسیرِ غمِ زنداں نہ ہوا

(شعرہ حاصلِ مشاعرہ مانا گیا۔ عارف ہسوی)

۳- بابو رگھوپتی سہائے صاحب بی۔ اے گورکھپور - ۱۸ ماہ قید محض پانچ سو روپیہ جرمانہ

(۱) میری ہمت میں بھی توفیقِ خدا شامل تھی

دشمنِ دیں کے ستانے سے ہراساں نہ ہوا

(۲) عہدِ ظلمت میں نمایاں ہے صداقت کی جھلک

ہے یہ وہ چاند جو بدلی میں بھی پنہاں نہ ہوا

(۳) اس کی قسمت میں نہیں لطفِ حیاتِ ابدی

جو دل و جان سے اسلام پہ قرباں نہ ہوا

(۴) سر پکڑ کر یہ کوئی دن میں کہیں گے ریڈنگ

ہند میں ایک بھی پورا مرا ارماں نہ ہوا

(شعر کی بہت داد ملی ۔ عارف ہسوی)

(۹) بابو رتن لال صاحب زمردِ سکندر آبادی

(۱) دل دیا مال دیا زر بھی دیا جان بھی دی

اس پہ طرّہ ہے کہ اُن پر کوئی احساں نہ ہوا

(۲) بے حیائی کے تو جینے سے ہے مرنا بہتر

جس کی عزت نہ ہو دنیا میں وہ انساں نہ ہوا

(۱۰) جناب حفظ الرحمن صاحب فرخ آبادی ۔ سزا ایک سال

(۱) سر اڑایا نہ گیا، دار کا فرماں نہ ہوا

خوگرِ جور پہ اتنا سا بھی احساں نہ ہوا

(۲) اپنا ایمان ہے وہ صاحبِ ایماں نہ ہوا

جو خلافت کے لیے شوق سے قرباں نہ ہوا

(۳) دل وہ دل ہی نہیں جس دل میں نہ ہو دردِ وطن

سر وہ سر ہی نہیں جو قوم پہ قرباں نہ ہوا

(۴) بیڑیاں بھی تو نہ ڈالیں ترے دیوانے کے

جیل میں آکے بھی پورا مرا ارماں نہ ہوا

(۵) وہ حفیظ آپ کو انسان نہیں کہہ سکتا

جس کو سوراج کا تھوڑا سا بھی ارماں نہ ہوا

(پوری غزل بہت صاف اور سلیس تھی خوب داد دی گئی ۔

(عارف ہسوی)

(۱۱) پنڈت رام نریش ترپاٹھی الہ آباد ۔ ۸ ماہ قید سخت

سو روپیہ جرمانہ ہندی کے اچھے شاعر ہیں اور

بہت سی ہندی کتابوں کے مصنّف ہیں ۔

(۱) اس نے سمجھا ہی نہیں حبِّ وطن کیا شے ہے

جیل میں آکے جو سرکار کا مہماں نہ ہوا

(۱۲) ~~محمد محی الدین صاحب رضاکار الہ آباد ۔ ۸ ماہ قید سخت عمر سولہ سال~~[1]

(۱۳) محمد مصطفےٰ صاحب پھپھوندوی المتخلص بہ احمق - - - [2]

(۱) خبطِ گیسو ہوا عشقِ رُخِ جاناں نہ ہوا

مجھ کو پیچش ہی ہوئی شکر ہے یرقاں نہ ہوا

(۲) صلۂ قوم فروشی کی تمنا ہی رہی

مر مٹا شیخ خوشامد میں مگر خاں نہ ہوا

(۳) مجھ کو حیرت ہے ترے عہد میں اے دورِ صلیب

کیوں ابھی آرڈرِ ضبطیٔ قرآں نہ ہوا

(۴) گل عارض پہ ترے بلبلِ شیدا کی طرح

ایک اُلّو بھی تو کم بخت غزل خواں نہ ہوا

(۵) جیل خانے کے چنے جس نے کبھی چاب لیے

پھر وہ صاحب سے مٹن چاپ کا خواہاں نہ ہوا

(۶) اہلِ یورپ نے کیا ہے وہ تماشہ جو کبھی

آپ کے باپ سے بھی حضرتِ شیطاں نہ ہوا

(۷) نہ قفس کی تجھے پروا ہے نہ صیّاد کا خوف

شکر کر زاغ کہ تو مرغِ خوش الحاں نہ ہوا

(۸) چارہ گر اس لیے روتے ہیں کہ بیمارِ فراق

تختۂ مشقِ بنفشہ و سپستاں نہ ہوا

(۹) مر گیا موت سے پہلے ہی شبِ ہجر احمقؔ

ملک الموت کا شرمندۂ احساں نہ ہوا

دوسری غیر طرحی غزل جو فتح گڑھ جیل سے آگرہ جیل آتے ہوئے لکھی گئی تھی ۔

---

[1] یہ سطر کاٹ دی گئی ۔ غالباً رضاکار موصوف شاعر نہ تھے ۔

[2] یہاں اصل مسوّدہ پھٹ چکا ہے ۔

سامنے سے مدعی کی بزم میں جاتے ہوئے — وہ نکل جاتے ہیں میرے دل کو برماتے ہوئے
کونسل میں شیخ جی پہنچے جو اٹھلاتے ہوئے — خوف سے شیطان بھاگے ٹھوکریں کھاتے ہوئے
میں کوئی ہوا نہیں جو آپ کو کھا جاؤں گا — آپ گھبراتے ہیں ناحق میرے پاس آتے ہوئے
دیکھئے ان بندروں کی ہیئت میمونیت — کیا بھلے معلوم ہوتے ہیں یہ غراتے ہوئے
باوجود اس اتقائے خاص کے بھی شیخ جی — بارہا پکڑے گئے ہیں ان کے گھر جاتے ہوئے
کیا سودیشی تاربیڈو میں نہیں اتنا بھی زور — ڈوب جائیں مانچسٹر کے جہاز آتے ہوئے
ایسے وعدے سے تو اچھا تھا کہیں انکار وصل — دو مہینے ہو گئے ظالم کو ٹرخاتے ہوئے
ضبط کونسل نے جو دالہ ہی دیا ان کا نکال — نذرانہ سیٹھ جی کے سب ہی کھاتے ہوئے
ہے محلے میں رقیبوں کے ہی میرا بھی مکاں — اس طرف بھی آنکلئے گا ادھر جاتے ہوئے

ریل گاڑی میں لکھی ہے ہم نے احمق یہ غزل
فتح گڑھ سے آگرے کی جیل کو جاتے ہوئے

حضرت احمق کی دو تو غزلیں بہت پسند کی گئیں اور نہایت دل چسپی سے سنی گئیں اور ان کو بار بار پڑھنے کی فرمائش کی گئی۔

(عارف ہسوی)

غزل غیر طرحی بابو رگھوپتی سہائے فراق بی اے گورکھپور

حشر میں کہتے ہیں کہہ دو یہ مرا قاتل نہ تھا
صدقے اس تقریر کے گویا کہ میں بسمل نہ تھا

غرق کر کے میری کشتی، پھر گئی تو بھی تو موج
تجھ کو سر ہی تھا جو ٹکرانا تو کیا ساحل نہ تھا

کر کے دشمن سب کو میرا تم نے ثابت کر دیا
دعوئ تسخیر عالم دعوئ باطل نہ تھا

کیوں نہ موجیں سر پٹکتیں جوشِ غم میں اے حباب
گو میں دریا تھا تو کیا تشنہ لب ساحل نہ تھا

دآئندہ مشاعرہ کے لیے حسب ذیل مصرع طرح تجویز کیا گیا

ع دیا ہے درد اگر تو نے تو اس کو لا دوا کر دے

دوا، دعا، خدا، مدعا، آشنا قافیہ۔ کر دے ردیف

(عارف ہسوی)

نازش پرتاب گڑھی

انتظار

(عظیم عوامی شاعر گوسوامی تلسی داس جی کے حضور میں خراجِ عقیدت)

تو منزلِ سخن ہے میں اڑتا غبار ہوں　　تو جانِ فصلِ گل، میں گدائے بہار ہوں
میں ذرۂ حقیر و عقیدت گزار ہوں　　اپنی کمی آگہی پہ بہت شرمسار ہوں

عجزِ بیاں ہے، جنبشِ لب کر رہا ہوں میں
تلسی! تجھے سلامِ ادب کر رہا ہوں میں

دعوائے ہمسری کرے، کس کی مجال ہے　　بزمِ ادب میں ذات تری بے مثال ہے
مضموں ہیں بلند، مقدس خیال ہے　　حق ہے کہ تیری فکرِ سخن لازوال ہے

کچھ اس ادا سے عرضِ ہنر کر گیا ہے تو
کنکر کو آب دے کے گہر کر گیا ہے تو

ہر عقدۂ حیاتِ بشر کھولتا ہوا　　لفظوں کو موتیوں کی طرح رولتا ہوا
کانوں میں جیسے شہد و شکر گھولتا ہوا　　جنتا کے پاس، انھیں کی طرح بولتا ہوا

پہونچا جو تو تو بزمِ سخن عام ہو گئی
جو بات منہ سے نکلی وہ الہام ہو گئی

تسلیم ہے کہ شاعرِ معجز بیاں ہے تو　　تسلیم ہے کہ نکتہ ور و نکتہ داں ہے تو
ہے اعتراف رہبرِ منزل نشاں ہے تو　　اور یہ بھی اعتراف کہ حق کی زباں ہے تو

اس درجہ جان کر بھی تجھے جانتے نہیں
یعنی ترے پیام کو ہم مانتے نہیں

ہم میں کوئی نہیں جو محبت شعار ہو　　ہنومان کے خلوص کا آئینہ دار ہو
میدانِ زندگی میں جو مردانہ وار ہو　　ہے کون جو پدر کا اطاعت گزار ہو

سیتا کی پاکبازی کا ہم میں چلن نہیں
بھائی تو بے شمار، کوئی لکشمن نہیں

ہر موڑ پر حیات کا پیغام چاہیئے　　علم و شعور آج سرِ عام چاہیئے
خلق و وفا کا، سچ کا کہیں نام چاہیئے　　لاکھوں تو سینکڑوں ہیں ہمیں رام چاہیئے

تلسی! ابھی حیاتِ بشر ہے اسیرِ غم
کس منہ سے پھر کہیں کہ تجھے جانتے ہیں ہم

جب ہر زباں پہ ہوگی محبت کی راگنی
جب عام کر سکیں گے ترا درسِ زندگی
جب ہر طرف ملے گی رہ و رسمِ دوستی
جب ہر نظر میں جاگے گا ذوقِ خود آگہی

جب سازِ دل میں ہوں گے ترے گیت تیری لے
اس وقت ہم کہیں گے کہ تلسی عظیم ہے

محمود زکی

نذرِ عقیدت

(شاعرِ اعظم کالیداس کی خدمت میں بصد خلوص)

عظیم شاعر سلام تم پر، سلام تم پر عظیم شاعر

تمہارے نغموں کی مستیوں میں ہزار برسوں سے گم ہے دنیا
تمہارے نغمے ہی گونجتے ہیں ابھی دماغوں میں ایشیاء کے
ادب کی وادی میں حسن بن کر کیا اُجالا شکنتلا نے
تمہاری جیوتی امر رہے گی سدا چراغوں میں، ایشیاء کے
رُتوں کا سنگھار کرنے والے تمہارے نغموں کی تازگی سے
نئی بہاریں سنور رہی ہیں تمام باغوں میں ایشیا کے

عظیم شاعر سلام تم پر، سلام تم پر عظیم شاعر

یہ ایشیا کا عظیم بھارت پھر ایک کروٹ بدل رہا ہے
حسین بھارت کہ میگھ جس کے پیامِ الفت لئے ہوئے ہیں
تمہاری وادی سے پیار الفت لئے اٹھی ہیں وہی گھٹائیں
جو اپنے دامن میں زندگی کی نئی حقیقت لئے ہوئے ہیں
وہی حقیقت جسے سنا کر مہاکوی تم امر ہوئے ہو
تمہاری عظمت کی تو دلوں میں سبھی عقیدت لیے ہوئے ہیں

عظیم شاعر سلام تم پر، سلام تم پر عظیم شاعر

تمہاری عظمت کا پوچھنا کیا، تمہاری عظمت ہے غیر فانی
زمانہ بیتا مگر سلامت تمہارے نقشِ قدم ملے ہیں
تمہاری راہوں میں درحقیقت حسین دلکش سی روشنی ہے
تلاش کرنے پر اہلِ فن کو نئے نئے پیچ و خم ملے ہیں
تمہاری نگری سدا ہی علم و ادب کا مرکز بنی رہی ہے
وہی تمہاری "اونتیکا" [1] جس میں آج اہلِ قلم ملے ہیں

عظیم شاعر سلام تم پر، سلام تم پر عظیم شاعر

یہ اہلِ فن جو یہاں ملے ہیں تمہاری راہوں پہ چل رہے ہیں
انھیں کے دم سے ضرور سکھ شانتی کا پرچار عام ہوگا
انھیں کے دم سے تمہارا وہ دَور لوٹ آئے گا پھر یقیناً
مسرتوں کے دیئے جلیں گے، محبتوں کا نظام ہوگا
کریں گے مل جل کے سب جو کوشش کبھی اکارت نہ جا سکے گی
یقین مانو تمہارے بھارت کا سب سے اونچا مقام ہوگا

عظیم شاعر سلام تم پر، سلام تم پر عظیم شاعر

[1] اجین

صدرالدین فضا شمسی

ولی کا سالِ وفات

میں یوں تو مقلد ہوں مگر میں ادب میں تنقید کا حامی نہیں کہ اسی تنقید نے اردو ادب کی آزادانہ نشو و نما میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی ہیں اور اس کی انفرادیت کو مسخ کر ڈالا ہے یہاں تک کہ ہمارا ادب آج ع تا ثریا رسید کج دیوار، کا مصداق بن کے رہ گیا ہے۔ میں ادب میں بغاوت کو ادب کی زندگی اور زندگی کی توانائی سمجھتا ہوں۔ مگر بغاوت تعمیر کی خاطر ہو تخریب کے لئے نہیں۔

ولی ان بدبخت شاعروں میں ہیں جن کی حیات ملک و ملت کے لئے انمول سرمایہ ہوتے ہوئے بھی ابھی تک پردۂ خفا میں ہے۔ آج تک یہ محقق نہ ہو سکا کہ ولی کا وطن کہاں تھا، ولی نے کس طرح زندگی بسر کی، ان کے آبا و اجداد کون تھے، کہاں کے تھے اور ان کا انتقال کب ہوا؟

اصل یہ ہے کہ اردو داں طبقہ اس حقیقت سے آشنا دیر میں ہوا کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی حیات اور اس کی وراثت کا گہرا اثر اس کے ادب پر پڑتا ہے۔ اسی لئے قدیم زمانے کے لوگ ادیبوں کی زندگی، ان کی زندگی کے کارنامے، ان کے ماحول، ان کی وراثت اور ان کے مختلف رجحانات کے ذکر سے بے اعتنائی برتتے رہے۔ ولی کا وطن اورنگ آباد تھا یا گجرات، ولی نے دلّی کا سفر ایک بار کیا یا چند بار، ہمیں اس سے سر دست بحث نہیں۔ یہ تو مسلّم ہے کہ ولی ایک آزاد مشرب رند نما ولی تھے جنھوں نے کوچۂ یار پا کر اپنے وطن کو وطن کی حیثیت سے حرفِ غلط کی طرح مٹایا۔ چونکہ خود ولی نے اپنے وطن کو بھلا دیا قوم نے بھی ان کے وطن کو بھلا دیا، مگر ان کی وفات . . . . یہ بھی ایک معمہ ہے! کسی نے کہا ۱۱۴۳ھ میں انتقال ہوا۔ کسی نے ۱۱۵۵ھ میں وفات بتائی اور کسی نے ۱۱۰۱ھ میں ان کو مرحوم و مغفور کر دیا۔ آخر الذکر سنہ تو کسی طرح صحیح نہیں۔ اس لئے کہ ولی نے رسالہ "نور المعرفت" مدرسہ ہدایت بخش کی تعریف میں لکھا تھا، اس مدرسہ کا سنگِ بنیاد ۱۱۰۹ھ میں رکھا گیا اور ۱۱۱۱ھ میں یہ تیار ہو گیا۔ میں نے یہ رسالہ نہیں پڑھا ہے مگر یہ رسالہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی نے شائع کر دیا ہے۔ جناب ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے ولی کا سالِ وفات ۱۱۱۹ھ مان لیا ہے اور ہمارے ادباء نے اس تحقیق کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ اس سالِ وفات کے ثبوت میں مندرجہ ذیل قطعہ پیش کیا جاتا ہے جو کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے قلمی نسخہ دیوان ولی (نشان ۲۷۹) کے خاتمے پر درج ہے:

مطلع دیوانِ عشق بیدار یاب دل | والیِ ملکِ سخن صاحبِ فالِ شلی
سالِ وفاتش خرد از سرالہام گفت | بار رہنا ہ ولی ساقی کوثر علی

۱۱۱۹ = ۱ + ۱۱۱۸

(سرالہام سے تعمیہ کر کے ۱۱۱۹ پورا کیا گیا ہے) مگر سردار عبدالحمید کو تعمیہ کی خبر نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ شاید سہو کتابت ہے ورنہ

ا مصرع ناموزوں ہے

تاریخ تو ۱۱۱۸ ہجری نکلتی ہے (اورینٹل کالج میگزین لاہور ۱۹۳۴ء) اس دیوان کی کتابت ۱۱۳۹ھ جلوس محمد شاہی (۱۱۱۸ + ۲۱) میں ہوئی اور کاتب کا نام شہوار بیگ ہے۔ اس قطعہ کے مصنف مولوی احسن مفتی ہیں (یادگار ولی ص۶۳) ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کا یہ مضمون سب سے پہلے رسالہ 'اردو' ماہ جنوری ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اور بزم الموسیٰ کے یادگار ولی نمبر میں یہی مضمون بار دیگر شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے شائع ہوتے ہی مولوی یحییٰ تنہا صاحب غازی آبادی نے زمانہ اپریل ۱۹۳۴ء میں اس تحقیق سے اختلاف کرتے ہوئے بہت سارے دلائل دئیے لیکن سالِ وفات ۱۱۵۵ھ مان کر وہ بھی غلطی کر بیٹھے۔ سردار عبدالحمید نے اورینٹل کالج میگزین لاہور ماہ اگست کے شمارہ میں تنہا صاحب کے مضمون کا جواب بڑے تند و تیز لہجے میں دیا جس میں حقیقت سے زیادہ عقیدت اور درایت سے زیادہ عصبیت کا مظاہرہ کیا۔ سردار موصوف یہ تو جتانے میں کامیاب ہو گئے کہ ولی کا انتقال ۱۱۵۵ھ سے پہلے ہو چکا تھا، لیکن وہ یہ ثابت نہ کر سکے کہ ان کا انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا تھا۔

یادگارِ ولی میں اس قطعہ کا تیسرا مصرع یوں ہے ع
'سالِ وفاتش خود از سرِ الہام گفت'۔ مجھکو اس مصرع کے پڑھنے سے بڑی الجھن ہوئی۔ ایک تو یہ کہ یہ مصرع[1] ناموزوں ہے اور دوسرے یہ کہ اس مصرع سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھا مصرع خود ولی کا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے اور جہاں تک میری نظر پہنچی ہے یہ مصرع ولی کے کسی دیوان میں نہیں۔ میری پریشانی بڑھتی گئی یہاں تک کہ میں نے اس کا ذکر برادرِ مکرم پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی سے کیا۔ انھوں نے مجھے 'ولی گجراتی' نام کی ایک کتاب مصنفہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی دی جس کے مطالعہ سے میری یہ الجھن ختم ہو گئی اور اس قطعہ کا تیسرا مصرع صحیح طور پر معلوم ہو گیا۔ رسالہ اردو میں بھی لفظ "خرد" کچھ اس طرح لکھا ہوا ہے کہ 'خود' بھی پڑھا جا سکے۔ ڈاکٹر موصوف نے یہ کتاب بڑی محنت اور کاوش کے بعد لکھی ہے جو نادر معلومات سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ ولی گجراتی تھے اورنگ آبادی نہ تھے اور یہ طریقہ استثناء و استشہاد اختیار کیا گیا ہے اس سے بظاہر انکار کی گنجائش نہیں۔ مگر اس سلسلہ کی کچھ اور کڑیاں بھی ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اب آئیے ذرا اس قطعہ پر غور کیا جائے۔ چوتھے مصرع کا ترجمہ کیجیۓ اور دیکھئے کہ حضرت علی کو ساقیٔ کوثر اور شفیع فی الحشر بتانا کس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اہل سنت والجماعت حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساقیٔ کوثر اور شافع محشر مانتے ہیں اور اہلِ تشیع حضرت علی کی ذات سے ان صفات کو وابستہ کرتے ہیں۔ ولی کے عقیدہ کی بابت بھی اختلاف رائے ہے لیکن ان کے کلیات میں کئی مقامات ایسے ہیں جن سے ان کا عقیدہ اہلِ سنت والجماعۃ کا معلوم ہوتا ہے۔ نعتیہ مثنوی میں چاروں اصحاب کرام کا ایک جا ذکر کیا ہے اور کسی کا بھی ذکر علیحدہ نہیں ہے اس کے علاوہ بزرگانِ دین سے ان کو عقیدت تھی۔ وہ شاہ سعد اللہ گلشن کے مرید تھے۔ یہ باتیں اہلِ تشیع کے عقائد کے منافی ہیں۔

اہلِ سنت میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جسے ہم تفضیلیہ کہتے ہیں۔ یہ فرقہ ترتیب خلافت کو صحیح مانتے ہوئے حضرت علی کی فضیلت کا قائل ہے۔ لیکن جس عقیدہ کا اظہار چوتھے مصرع میں ہے وہ تفضیلیت سے بھی زیادہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی احسن مفتی نے دیدہ و دانستہ اس قطعہ میں ولی کی تعریف اپنے عقیدے کے مطابق کی ہے۔

اب پہلے دو مصرعوں پر غور کیا جائے۔ ولی کی پیدائش ۱۰۷۹ میں ہوئی۔ ابھی تک کسی نے بھی کوئی اختلاف نہیں کیا ہے۔ اور نہ ہی کوئی دوسری تاریخ بتائی گئی ہے۔ تذکرہ شعرائے اورنگ آباد میں محمد سردار علی حیدر آبادی نے صراحت سے یہ سال بتایا ہے۔ کتاب یادگار ولی ص۲۲۲ پر ایک فہرست مندرج ہے جس میں دیوان ولی کے قلمی نسخوں کا ذکر ہے۔ نمبر ۳ میں ایک ایسے مخطوطہ کا ذکر ہے جو ۱۱۴۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہاں اس سلسلہ کی پوری عبارت نقل کر دی جاتی ہے

۳۔ ۱۱۴۱ھ

[1] مصرع ناموزوں نہیں رہا۔ م

اس نسخہ میں ولی اور قاضی القضاۃ کی مہریں ثبت ہیں۔ کتب خانہ مولوی حکیم سید محمد قاسم صاحب ناظم سمیات میں موجود ہے اور اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:۔

" مختصر حالات ولی سید عبدالغفار نے اپنے والد بزرگوار مولانا سید قاسم صاحب شاہ نوری سے، پیدائش ولی ۱۰۷۹ھ تصنیف پہلے ۱۱۴۱ھ وہ مجلس کے' دیوان دکنی نثر وغیرہ' وہ مجلس و دیوان محمد ولی (محمد شمس الدین المتخلص بہ ولی) وحضرت استاذنا و مولانا سید اسمٰعیل صاحب شیخ الحدیث مدرسہ علویہ گجرات متوطن دارالظفر بیجاپور وشاہ نور کے ملاحظہ میں پیش کیا کرتے۔ محمد ولی کی اورنگ آباد میں ولادت ہوئی۔ شوقِ تحصیلِ علم گجرات کے مدرسہ علویہ میں کھینچ لایا بعد الفراغ تحصیل علم بانیٔ مدرسہ سجادہ نشین علوی کے عقیدت مندوں میں داخل ہوئے ...... المرقوم ۱۳۰۵ھ
سید عبدالغفار نوری۔

ظاہر ہے کہ یہ عبارت دیوان کی کتابت کے بہت بعد سپرد قلم ہوئی ہے۔

یہاں پر اس سے بحث نہیں کہ ولی کا وطن کہاں تھا اور ولی وہ مجلس نام کی کسی کتاب کے مصنف تھے کہ نہیں۔ یہاں صرف یہ دکھلانا مقصود ہے کہ ولی ۱۰۷۹ھ میں پیدا ہوئے۔ اب اگر ہم انھیں ۱۱۱۹ھ میں مار دیتے ہیں تو گویا ہم کل چالیس سال کی حیات بخشتے ہیں۔ چالیس سالہ انسان کی موت اس زمانہ میں یقینی جوان موت تھی مگر کسی نے آج تک ولی کو جواں مرگ نہیں بتایا ہے۔ اور جس کسی نے بھی ان کی موت کا ذکر کیا ہے وہ اس طرح ہے جیسے ولی کو حیات طبعی میسر ہوئی تھی اور ان کی موت کی بابت کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں، خود ولی کا ایک شعر ایسا ہے جو ان کی کبر سنی کی طرف اشارہ کرتا ہے

اول سوں تھا ضعیف بہ پابستہ سوز میں
جیوں بال ہے اگن کے اوپر بے قرار دل

اس شعر میں ضعیف سے مراد کمزوری لی جاسکتی ہے لیکن دوسرا مصرع غور کرنے کے لائق ہے۔

بارِ دگر اب پہلے دو مصرعوں کی طرف رجوع کریں تو ہمیں چار بیش بہا صنعتیں ولی کی طرف منسوب کی ہوئی ملتی ہیں:۔

(۱) مطلع دیوان عشق (۲) بسار یاب دل (۳) والی ملک سخن (۴) صاحب عرفاں۔ ان صفات سے مجموعی طور پر جس احترام اور اعزاز کی شان نکلتی ہے جس بالیدگی شعور اور پختگی تجربات کا پتا چلتا ہے اور چالیس سالہ انسان کے لئے کہاں تک موزوں و مناسب ہے۔ اس کا فیصلہ ذوقِ سلیم پر چھوڑتا ہوں۔

یادگارِ ولی کے مضمون 'کلیاتِ ولی کے قلمی نسخے' (ص ۲۲۲) سے تینتیس ۳۳ ایسے مخطوطوں کا علم ہوتا ہے جن پر سنہ کتابت درج ہے۔ ان نسخوں میں نمبر ۹ سنہ ۱۱۵۳ھ کا لکھا ہوا ہے اس کے خاتمے پر جو عبارت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک ولی کا انتقال ہوچکا ہے " تمت ہٰذا الکتاب دیوانِ ولی علیہ الرحمہ نیم شب سنہ ۲۲ جلوس" مضمون متذکرہ بالا کے نمبر ۱ میں دیوان ولی کا وہ قلمی نسخہ ہے جو ۱۱۲۰ھ کا اورنگ آباد میں لکھا ہوا ہے۔ اور نصیر حسین خیال کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ بڑا ہی اہم ہے اگرچہ میری نظر سے یہ نسخہ نہیں گزرا ہے لیکن خبر دینے والے نے اس انداز سے خبر دی ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس میں ولی کو مرحوم یا علیہ الرحمہ وغیرہ نہیں لکھا گیا ہے۔ اگر ولی ۱۱۱۹ھ میں فوت ہو چکے تھے تو چونکہ یہ پہلا نسخہ ہے اس لئے اس میں اس کا ذکر کرنا ضرور تھا خصوصاً ایسی صورت میں کہ ولی جواں مرگ تھا۔ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات میں ایک قلمی نسخہ دیوان ولی کا ہے جو ۱۱۴۶ھ میں لکھا گیا اس میں ولی کو مرحوم یا علیہ الرحمہ نہیں لکھا گیا ہے۔

جامع مسجد بمبئی والا نسخہ ۱۱۵۲ھ کا لکھا ہوا ہے اس میں ولی کو مرحوم بتایا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ولی گجراتی ص ۸۰ پر رقمطراز ہیں:۔

" پنجاب یونیورسٹی میں دیوان ولی کا ایک نسخہ رکھا گیا تھا جسے سنہ جلوس محمد شاہی (۱۱۳۰ھ) میں ثناء اللہ فانی نے لکھا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:۔

"دیوان اشعار ولی مسمی سید ولی محمد مرحوم بتاریخ چہاردہم محرم الحرام سنہ از جلوس میمنت مانوس محمد شاہ بادشاہ خلداللہ تعالیٰ ملکہ وسلطانہ روز چہارشنبہ وقت چاشت در بلدہ خیرالبلاد احمد آباد حمیت عن الفساد بخط فقیر حقیر اضعف العباد وکلب محبوب سبحانی نمودنے بودتنا واللہ فانی سمت انجام وصورت اتمام پذیرفت" اس نسخہ کا پتا سردار عبدالحمید نے ۱۹۳۴ء میں دیا تھا۔

(اورینٹل کالج میگزین لاہور۔ ماہ اگست ۱۹۳۴ء)

مولوی احسن مفتی کا زمانہ کیا تھا اس کی تصریح ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے نہیں کی۔ اردو کے کسی تذکرے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مولوی احسن مفتی ولی کے ہم عصر تھے لیکن ولی گجراتی کی یہ عبارت (ص۱۸) مولوی احسن مفتی کے زمانے کی تعیین میں مدد کرتی ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:

"تنہا صاحب کے جواب میں سردار عبدالحمید نے اس نسخہ کے حوالے سے ایک یہ بھی دلیل پیش کی ہے کہ جب ولی ۱۱۵۵ھ تک بقید حیات تھا تو ۱۱۵۲ھ میں مفتی احسن نے ولی کی وفات سے تین سال قبل قطعہ سنہ وفات کیوں کہا؟"

اس تحریر سے یہی آشکار ہوتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف ولی کے معاصر نہ تھے اور یہ قطعہ ۱۱۵۲ھ میں لکھا گیا۔ سردار عبدالحمید کا طریقۂ استدلال مغالطہ انگیز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب اس نے قطعۂ وفات لکھا تو ظاہر ہے کہ یا تو وہ ولی کا معاصر یا جاننے والا ہے۔ یا اگر ذاتی طور پر جاننے والا نہیں تو اس نے ولی کے کسی جاننے والے کی فرمائش پر قطعہ لکھا ہے۔ قطعہ مذکور بہر حال ۱۱۵۲ھ کے قبل کا نوشتہ ہے۔"

اس انداز سے تو یہی واضح ہوتا ہے کہ احسن مفتی کی بابت خود سردار عبدالحمید کو بھی پتا نہیں کہ وہ کون تھے اور کس زمانہ کے تھے۔ لیکن چونکہ یہ قطعہ ان کی طرف منسوب ہے اس لئے وہ ضرور ولی کے جاننے والے ہوں گے۔ پڑھنے والے خود فیصلہ کرلیں کہ اس میں منطقی استواری کہاں تک ہے۔

یہ عجیب طرح کی بات ہے کہ قطعہ تاریخ وفات، وفات کے تینتیس سال بعد کہا جائے، وہ بھی ایسے شخص کا جس کی وفات کا سنہ بتانے سے ہر تذکرہ نگار قاصر ہے اور ایسا شخص لکھے جو مرنے والے کا ہم عصر نہ ہو، دوست نہ ہو۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ قطعاتِ تاریخ انتقال کے بعد ہی کہے جاتے ہیں۔ مگر یہ تو ایک انوکھا انداز ہے۔ آخر مولوی صاحب موصوف کس بناء پر یہ سال بتاتے ہیں۔ یہ کہیں مذکور نہیں خود اعراس نامہ مملوکہ حسینی پیر صاحب میں ولی کی وفات کی تاریخ ۴ شعبان اور وقت عصر مندرج ہے" مگر سال وفات شاید یہاں بھی نہیں۔ پتا نہیں شہوار بیگ (کاتب دیوان) کو یہ قطعہ کہاں سے ہاتھ لگا۔ ولی کے معاصرین میں کسی نے اس کی خبر نہیں دی اور نہ ہی کسی تذکرہ نگار نے یہ قطعہ درج کیا۔

اب اس سلسلہ کے دوسرے شواہد کا جائزہ لیجئے۔ تذکرہ نگاروں نے ولی کے سفر ہند کی تاریخ نہیں بتائی ہے صرف قائم چاندپوری نے مخزنِ نکات میں سفر دہلی کا حال بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ولی عالمگیر کے ۴۴ سنہ جلوس (۱۱۱۲ھ) میں دہلی گئے۔ دہلی کا دوبارہ سفر مشکوک بتایا جاتا ہے۔ لیکن ایک بار دہلی آنے کا اعتراف سبھی کرتے آئے ہیں۔ تذکرہ گلشن بے خار میں ہے "ولی در زمان عالمگیر بادشاہ بودہ" مصحفی نے تذکرہ ہندی میں حاتم کا حال سپرد قلم کرتے ہوئے حاتم کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے۔ "روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دوم فردوس آرامگاہ دیوان ولی در شاہجہان آباد آمدہ واشعارش بر زبان خورد وبزرگ جاری گشتہ" اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دیوان ولی سال مذکور میں دہلی آیا، رہا یہ امر کہ ولی خود آئے کہ نہ آئے اس کی بابت نہ اقرار ہے نہ انکار۔ اگر صرف دیوان آیا تھا تو حاتم کو لازم تھا کہ صراحت کر دیتے اور کس طرح یہ دیوان شاہ جہاں آباد آیا اس کی بھی وضاحت کرنا ضرور تھا۔ اس کو بھی چھوڑیئے اگر حاتم کی مراد اس بیان سے واقعی یہ تھی کہ صرف دیوان ولی دہلی آیا، ولی نہ آئے اس لئے کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے تو اس کا تذکرہ کر دینے میں کوئی قباحت یا

رکاوٹ نہ تھی۔ حاتم کوئی ایسے کم سخن بھی نہ تھے اور فطری طور پر ایسے وقت میں انسان اظہارِ افسوس کرتا ہے اور ولی کی بابت یہ غم اور بھی سنگین تھا کہ وہ کچی عمر میں رحلت کر گئے۔ کم از کم مصحفی نے کوئی ایسی بات نقل نہ کی۔ لطف تو یہ ہے کہ اس تذکرہ میں ولی کا ذکر بھی نہیں۔ اگر ہم مان بھی لیں کہ صرف ولی کا دیوان دہلی آیا تو اس سے یہ کہاں نکلتا ہے کہ ولی کا انتقال بھی ہو چکا تھا۔ یہ امر بھی حیرت انگیز ہے کہ ولی کا انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا اور دکن والوں نے حق شناسی کی یہ داد دی کہ چودہ سال کے بعد ان کے دیوان کی طرف التفات کی۔ یہ ولی وہ تھے جنہیں مطلع دیوانِ عشق، سید اربابِ دل، والی ملکِ سخن اور صاحبِ عرفاں کے القاب سے نوازا گیا ہو۔ یہ دکنیوں کی کھلی ہوئی توہین ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ اورنگ آباد ہی میں ان کے دیوان کی نقل ۱۱۲۰ھ میں ہو چکی تھی اور ۱۱۲۵ھ میں اس کی دوسری نقل کی جا چکی تھی۔

ولی کے بہ عہدِ محمد شاہ دہلی آنے کے ثبوت میں عام طور پر یہ شعر بھی نقل کیا جاتا ہے۔

دل ولی کا لے لیا دلّی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

چمنستانِ شعراء میں یہ شعر مضموںؔ کی طرف منسوب کر کے نقل ہوا ہے بلکہ اس کے علاوہ ایک شعر اور ہے

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین
کوئی کہے جا کر محمد شاہ سوں
شرم سوں سب پانی ہو جاویں قریب
گر مرا یوسف ملے آ چاہ سوں

تذکرہ گلزارِ ابراہیم میں مضموںؔ کے نام سے صرف شعر نمبر ۲ لکھا ہوا ہے نمبر ایک نہیں ہے۔

ولی کی طرف جو شعر منسوب ہے اس کا مصرع اول مختلف ہے اور دوسرے مصرع میں بھی الفاظ کا اختلاف ہے۔ اگر ہم مصرع اول پر غور کریں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مضموںؔ دہلی میں ہوتے ہوئے بھی اس طرح کہتے ہیں ع

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین

دہلی میں رہ کر یہ کہنا کہ دہلی نے دل چھین لیا ہے ایک بھونڈا سا اظہارِ خیال ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے یہ نہ بتایا کہ یہ شعر مضموںؔ کے دیوان میں ہے کہ نہیں اور چمنستانِ شعرا و گلشنِ بے خار کے علاوہ اور بھی کہیں یہ شعر پایا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ یہ بتا دیتے ہیں کہ ان کے پاس بارہ نسخے دیوانِ ولی کے ہیں لیکن کسی میں یہ شعر نہیں ملتا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس شعر میں جو مضمون ادا ہوا ہے اس میں توارد بخوبی ممکن ہے اس لئے حتمی طور پر یہ کہنا تحقیق کی شان کے خلاف ہے کہ ولی کا دیوان ہی محمد شاہ کے عہد میں آیا اور ولی نہ آئے۔ اس لئے کہ وہ مر چکے تھے اور جو شعر ولی کی طرف منتسب ہے وہ بھی مضموںؔ ہی کا ہے، ولی کا کسی طرح ہو نہیں سکتا۔

"ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کہتے ہیں کہ مزید توضیح و توثیق احمد آباد کے ایک خانگی کتب خانہ کی بیاض سے ہوئی۔ یہ توضیح کس طرح کی ہے یہ ظاہر نہیں اگر کوئی مزید ثبوت فراہم ہوا تھا تو اس کا ذکر واجب تھا اور اگر وہی قطعہ اس بیاض میں پایا جاتا ہے تو محض اس قطعہ کے کئی کتابوں میں اندراج سے کوئی مزید ثبوت ہاتھ نہیں آتا، ہاں اس قطعہ کے مصنف شاعر کا نام معلوم ہو جاتا ہے جس سے بات اور بھی اُلجھ جاتی ہے سلجھتی نہیں۔

خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کی تصنیف گلشنِ گفتار مرقومہ ۱۱۶۵ھ کو ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی بہت اہم قرار دیتے ہیں مگر وائے مجبوری کہ خواجہ صاحب موصوف بھی ولی کا سالِ وفات نہیں بتلاتے۔ اس کی طرف رہبری کرنے والا کوئی تذکرہ ہے تو وہ میر کا نکات الشعراء ہے جس کے صفحہ ۹۴ پر یہ عبارت مرقوم ہے:

"مخفی نہ ماند کہ احوال یکے ازیں شاعران سمت دکن کہ پُر بہ رتبا اند مگر بعض چنانچہ ولی، سید محمد عبدالولی عزلت و سراج و آزاد کہ معاصر ولی بود سر رشتہ مربوط گوئی بدست ایشاں یافتہ می شود" عبدالولی عزلت کی پیدائش ۱۱۰۴ھ میں ہوئی اور ولی کی موت اگر ۱۱۱۹ھ میں ہوئی۔ گویا عزلت صرف پندرہ سال کے تھے جب ولی کا انتقال ہوا۔ اس لئے صحیح معنوں میں عزلت کو معاصر ولی نہیں کہنا چاہیئے اور میر نے جس غرض

سے یہ بیان سپردِ قلم کیا ہے وہ بھی حاصل نہیں ہوتی۔ آزاد غالبؔ فقیر اللہ آزاد ہیں اور ان کو معاصرِ ولی کہنے میں کوئی دشواری نہیں ولی کا یہ شعر خود شاہد ہے:

آزاد سوں سُنیا ہوں یو مصرع مناسب
جس سوں وہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

رہا سراج کا سوال، یہ کون سراج تھے؟ شاہ سراج: بشاعر تو نتاں خیال؟ یہ مشہور ہے کہ میر کی معلومات کا ماخذ عزلت کی بیاض ہے۔ میر نے اپنا تذکرہ ۱۱۶۵ھ میں لکھا۔ گلشنِ گفتار بھی ۱۱۶۵ھ کا لکھا ہوا ہے لیکن میر کا ماخذ ۱۱۶۵ھ سے قبل کی ایک بیاض ہے۔ اس شخص کی بیاض ہے جو ولی کا معاصر تھا۔ خود میر بھی ایک محتاط تذکرہ نگار مانے جاتے ہیں اس لئے ہمیں سوچنا ہوگا کہ ولی، عزلت، سراج اور آزاد کے معاصر کس طرح کہے جا سکے۔

ولی کی ایک غزل کے حسبِ ذیل دو اشعار سے ان کے کسی دوست سراج کا پتا چلتا ہے جن کی شادی میں ولی شریک ہوئے تھے:

پروانہ ہو کے کیوں نہ گرے چاند چرخ سوں
فانوسِ دل میں شوق ترا ہے سراج آج
وہ شوخ مجھ کوں آ کے ملا اس سبب ولی
شادی میں اس کی صرف کیا ہوں میں لاج آج

کلیاتِ سراج کے مؤلف ص ۵۹ پر رقمطراز ہیں "شاہ سراج کی کوئی اولاد وغیرہ نہیں تھی انھوں نے غالباً تمام عمر تجرد کی حالت میں گزاری اس کی توثیق وہ شاہ سراج کے ایک خط سے کرتے ہیں جس کی عبارت یہ ہے ..... دہر روز دوائے حکیماں بہ عمل می آید یکے بیماری و دویم تنہائی و کسے دل سوز و در خدمت نیست" (صفحہ ۶۶۱)

اس تنہائی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ سراج کی شادی نہیں ہوئی۔ مگر صرف اتنا کہنے سے کام نہیں چلتا ہے اس لئے کہ ولی کا کلام ایک ایسی اندرونی شہادت ہے جسے ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ کلیاتِ سراج میں ص ۱۱۳ سے ص ۱۲۲ تک چار چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں۔ نامۂ شوق، احوالِ فراق، خطِ بندگی اور مطلبِ دل۔ ان نظموں میں سراج کسی محرمِ راز کی جدائی اور بے وفائی کا شکوہ کرتے ہیں۔ یہ محرمِ راز بالیقین کوئی ایسی ہستی ہے جس کو کھلے بند شاہ صاحب ایسے الفاظ سے یاد کر سکتے تھے۔ ملاحظہ ہو:

نامۂ شوق:-

کٹی ترے بن محرم جانی نہیں — قدر دان رازِ پنہانی نہیں
خلق میں مشہور ہوں تیرا غلام — مجھ کوں تیرا جانتے ہیں خاص و عام

خطِ بندگی

ماہ رمضاں مجھکوں بھاری ہے — اس کے وعدے کی انتظاری ہے
بندگی کا دیا ہوں خط لکھ کر — روزِ اول سے تجھ کوں اے دلبر

مطلبِ دل

حالِ مرے کی بے خبر یک دم — بن ترے کون ہے محرم

مگر مشکل یہ ہے کہ شاہ سراج کی ولادت ۱۱۲۷-۲۸ھ بتائی جاتی ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ شاہ سراج کی شادی ہوئی تھی تو اس بات بنتی نہیں ہے اس لئے کہ ولی ۱۱۱۹ھ میں پیوندِ خاک ہو چکے تھے۔ اس لئے یہ سراج ان کے معاصر کیسے ہوئے۔ مگر کوئی سراج ان کے معاصر ضرور تھے۔ خود ولی کی ایک مسلسل غزل موجود ہے

ہر طرف ہے جگ میں روشن نام شمس الدین کا
چین میں ہے شور جس کے ابروئے پُرچین کا
مکھ پہ لے رنگِ خجالت چھوڑ کر معدن گیا
لعل نے سُن کر سخن تیرے لبِ رنگین کا
ہے ترے ہر مو سوں روشن جلوہ گر رنگِ وقار
کیا عجب گر تجھ سے لیوے درس نت تمکین کا
دیکھ تجھ پلکاں کوں بولیا عاشق جانباز یوں
مرغِ دل کے صید کوں چنگل ہے یو شاہین کا
صورتِ تسکیں نہیں دستی مگر اس حال میں
اے ولی جب پیو نہ پوچھے حال مجھ مسکین کا

(جناب منظور حسین صاحب علوی) حسینی پیر صاحب کا بیان ہے کہ یہ شمس الدین اسی خاندان (مشائخ گجرات) کے ایک فرد شاہ سراج

کے فرزند تھے۔ شاہ سراج ولی کے ہمعصر تھے۔ ان کا انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا۔" ولی گجراتی ص۳۷ ممکن ہے شمس الدین کے والد کا نام شاہ سراج ہو مگر یہ سراج وہ نہیں ہو سکتے جن کی شادی میں ولی شریک ہوئے تھے۔ اس کی دو معقول وجہیں ہیں ۱۔ ولی کو اگر شاہ سراج پدر شمس الدین سے دوستی تھی تو ان کے بیٹے کے لئے اس طرح کے اشعار لکھنا ولی کے لئے نامناسب ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔

۲۔ مشہور ہے کہ ولی نے سفر دہلی کے بعد ریختہ گوئی کی طرف توجہ کی اگر سراج کی شادی ۱۱۱۲ھ میں ہوتی تو ولی کے انتقال کے وقت شمس الدین کی عمر کل سات سال کی ہوگی۔ سات سال کے بچے کے لئے یہ شعر بد مذاقی کا ثبوت ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ شمس الدین ان کے کسی دوست کے بیٹے ہی نہیں تھے بلکہ خود ان کے دوست ہوں گے۔

یہ امر پھر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ آخر وہ سراج کون تھے؟ تحفۃ الشعراء از افضل بیگ خاں قاقشال کے جو مخطوطے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں سراج کے حالات دو جداگانہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں دو نسخے موجود ہیں۔ لیکن سراج کے حالات دونوں میں مختلف ہیں۔ ایک ہی تذکرہ کے دو مخطوطوں میں اتنا بیّن اختلاف بظاہر ناقابل فہم ہے (کلیات سراج ص۱۸) پروفیسر عبدالقادر سروری نے اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے کچھ قیاس آرائیاں کی ہیں۔ لیکن قیاس آرائیوں سے تحقیق و تفتیش کا حق ادا نہیں ہوتا۔ یہ افتاد و اشکال اس لئے رونما ہوئے کہ ولی کی موت ۱۱۱۹ھ میں صحیح مان لی گئی اور ساتھ ساتھ شاہ سراج کی پیدائش ۲۸-۱۱۲۷ھ میں۔ شاہ سراج کے جو اشعار اس سال پر مشتمل ہیں وہ یہ ہیں:

جب کیا جزو پریشان سخن شیرازہ بند
تھے برس چوبیس میری عمر نے بنیاد کے
سال ہجری تھے ہزار و یکصد و پنجاہ و دو۔
واقف[1] علم لدنی صاحب اسرار کے

شاہ سراج کا یہ بیان کہاں تک قابل اعتبار ہے یہ کہنا مشکل ہے اس لئے کہ منتخب دیوان کی تکمیل ۱۱۶۹ ہجری میں ہوئی اور اس وقت سراج نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انھوں نے سترہ سال سے شاعری ترک کر دی ہے۔ حالانکہ ۱۱۶۰ھ میں انھوں نے مثنوی بوستانِ خیال نظم کی۔ جناب احسن مرحوم نے اس تضاد پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (کلیات سراج ص۲۳) یہ باتیں بھی گرہ میں رکھنے کے لائق ہیں کہ بعض وقت کاتب بھی اپنی طرف سے اصل مسودہ میں اصلاح کر دیا کرتے تھے۔ یا ممکن ہے شاہ سراج کے کسی معتقد نے از رہِ عقیدت لفظ چونتیس کو چوبیس لکھ دیا، شاہ سراج کی کوئی اولاد نہ تھی اور وہ تنہائی کو رفیق تنہائی بناتے ہوئے زندگی بسر کرتے رہے۔ اس سے لازمی طور پر یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ان کی شادی ہی نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ کم سنی میں غلبۂ شوق اور جذب و فنون کے آثار محو کرنے کی خاطر بیاہ کر دیا گیا ہو۔ مگر ان کی بڑھتی ہوئی خود فراموشی اور عزلت پسندی کے باعث اہلیہ محترمہ کے ساتھ نباہ نہ ہو سکا۔ ہاں قطعہ مذکورہ کے چوتھے مصرع کے حروف کو صوتی لحاظ سے شمار کر کے بہ حساب ابجد تاریخ نکالیں تو سال ۱۱۲۹ ہجری حاصل ہوتا ہے۔ وہ مصرع اب اس طرح پڑھا جائے گا

ع بادِ پنا ہے ولی ساقی کوثر علی

اس طرح ولی کو ہم پچاس سال کی عمر دے دیتے ہیں اور شاید تضاد ایک حد تک کم ہو جاتا ہے۔

میں نے ابھی چند قیاسات سے کام لیا ہے۔ گرچہ قیاس تحقیق کے منافی ہے۔ مگر کیا کروں کہ پھر بھی قیاس آرائیاں ادب و نقد اور تحقیق کی آبرو ہیں۔

المختصر مولوی احسن مفتی کا قطعہ قابلِ اعتنا نہیں اور سر دست ہم ولی کی رحلت کا سال ۱۱۳۹ھ ہی ماننے پر مجبور ہیں اس لئے کہ ثناء اللہ فانی نے جس دیوانِ ولی کی کتابت سنہ جلوس محمد شاہ میں کی اس سے یہی سال نکلتا ہے (۲+۱۱۳۱)

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

[1] مصرع ناموزوں ہے

غلام احمد فرقت کاکوروی

ہندوستان کا ایک قدیم شہر — کھمبات

کھمبات کا شہر کئی اعتبار سے ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے اوّل یوں کہ ۴۵ بعد مسیح روم کے مشہور سیّاح ہیپالن نے اسے اور اس کے آس پاس کے علاقہ کو دریافت کیا تھا اور غالباً وہ پہلا شخص تھا جس نے اس سمندری راستہ کو رومی ملاحوں اور بحری سوداگروں سے روشناس کرایا۔ ورنہ اس سے پہلے عرب تاجروں کا اس سمندر پر قبضہ تھا اور وہی ہندوستان اور مغربی ممالک کے درمیان بحری تجارت پر قابض تھے۔ اس سے قبل یا تو عرب تاجر مغربی ممالک سے بحری تجارت کرتے تھے یا پھر خشکی کی راہ میسوپٹامیہ سے ہو کر فلسطین اور شام کے ساحلی علاقوں تک اونٹ پر لاد کر تجارتی مال لایا اور لے جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں خلیج کھمبات کو بریگزا کہتے تھے کیونکہ مشہور مؤرخ پلینی نے بھی کھمبات کے قریب ساحلی بستیوں اور شہروں کو اسی نام سے یاد کیا ہے۔

کھمبات کی تاریخ اگرچہ بہت ہی دلچسپ ہے مگر سردست ہم کو اس کی تفصیلات میں نہیں پڑنا ہے۔ البتہ جب پارسیوں کو ۷۱۶ بعد مسیح ایران سے نکال باہر کیا گیا تو انھوں نے سنجاہ میں آکر پناہ لی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ انھوں نے تجارت کا سلسلہ شروع کرکے نیسری اور بروچ پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اس وقت یہ سارے کا سارا علاقہ برگزی کہلایا۔ کھمبات کا شہر اس زمانہ میں کوارکا خوشستر کہلاتا تھا۔ یہاں کے مقدس مندر کے گرد بہت بڑی بستی تھی۔ اس کے بعد پارسی اتنی زیادہ تعداد میں ہو گئے کہ انھوں نے وہاں کے اصل باشندوں پر جو ہندوستان کے رہنے والے ہندو تھے اتنے مظالم کئے کہ انھیں وہاں سے بھاگتے بن پڑا اور تمام جگہوں پر پارسی قابض ہو گئے۔

ان ہندوؤں میں ایک شخص جس کا نام کلیان رائے تھا سورت بھاگ آیا اور اس نے سورت میں زر کثیر جمع کر کے راجپوتوں اور کولی قبیلہ کے لوگوں کی مدد سے پارسیوں پر حملہ کر دیا اور انھیں کوارکا خوشستر چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ کلیان رائے نے پارسیوں کے بنوائے ہوئے شہر کو جس کی بیشتر عمارتوں کو منہدم کر دیا گیا تھا دوبارہ درست کرایا اور اس نے نئے شہر کا نام کھمبات رکھا جس کے معنے "بنیاد پر قائم کرنا" ہیں اس نے قلعہ کی دیواریں تعمیر کرائیں اور اس میں سات پھاٹک لگوائے اور ساحل کے کنارے ایک بندرگاہ بھی تعمیر کرائی جس سے کھمبات ایک پر رونق شہر بن گیا۔

اسی زمانہ میں ایک رقاصہ جس کا نام نگینہ تھا اور جس نے رقص و سرود سے بڑی دولت جمع کر لی تھی کھمبات آئی۔ اور اس نے اپنے نام و نمود اور بدنامی کو نیک نامی سے بدلنے کی غرض سے پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ چونکہ وہ رقاصہ رہی تھی اور اُسے لوگ بہت ہی بدکردار اور بداعمال سمجھتے تھے لہٰذا اس کے ضمیر نے اُسے ملامت کی اور اپنے گناہوں کی عفو کی خاطر خیرات زکوٰۃ پر اتر آئی۔ اس نے شہر کے اندر اور اس کے

نواح میں تالاب بنوائے ۔ ان تالابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر تالاب کا نام "ن" سے شروع ہوتا ہے ۔ ایک نارنگیر ۔ دوسرا نیرا ، تیسرہ نیزہ اور چوتھا نتوا کہلاتا تھا ۔ مگر بعد میں نتوا نامی تالاب کو پاٹ کر اس پر ایک باغ نصب کر دیا گیا جو اسی نام سے اب تک موسوم ہے ۔ نارنگیر تالاب اب بھی وہاں کا سب سے بڑا اور حسین تالاب ہے ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ نگینہ کے مرنے کے بعد اس تالاب کی مسلسل نگہداشت جاری رہی جس کے سبب وہ جوں کا توں اب بھی قائم ہے اور آج کل ہندو اسے نگر سیٹھ تالاب کہتے ہیں ۔ جس تالاب کا نام نیرا ہے وہ ساحل کے قریب واقع تھا مگر اب اس نے ایک نہایت خوبصورت کنوئیں کی شکل اختیار کر لی ہے ۔ اس تالاب کی دل آویزی کا اندازہ اس کنوئیں سے کیا جا سکتا ہے جو بے حد خوب صورت ہے ۔ کھمبات کی اصل شہرت اس کے کنوؤں سے وابستہ ہے ۔ اس کے پاس ہی خواجہ خضر کی ایک مسجد ہے جہاں وہ مسافر جو بحری طوفانوں سے تباہ ہونے والے جہازوں سے بچ جاتے ہیں شکرانے کی نمازیں ادا کرتے ہیں اور سربسجود ہو کر بارگاہِ ایزدی میں اپنے گناہوں سے توبہ اور استغفار کرتے ہیں ۔ اسی جگہ سمندر پر ایک قدیم لائٹ ہاؤس واقع ہے ۔

موجودہ کھمبات کے شہر کے قریب ایک گاؤں شکر پور ہے جہاں ایک قبر کا شکستہ کتبہ ہے جسے شکر پاتر کہتے ہیں ۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس جگہ نگینہ کو دفن کیا گیا تھا ۔ اس خاتون نے اگرچہ آنے والی نسلوں کے لئے اتنا سب کچھ کیا ۔ مگر افسوس ہے کہ اب اگر کوئی اس کا نام لیتا ہے تو وہاں کے گاؤں والے اُسے گالی سمجھتے ہیں ۔ اور یہ ایک مقامی محاورہ بن گیا ہے کہ اگر کوئی بدترین خلائق انسان ہوتا ہے تو اسے یہاں کے لوگ 'شکر پاتر' کہتے ہیں ۔ گاؤں والوں نے مارے غصّہ کے اس کے مقبرہ کو منہدم کر دیا اور اس غصّہ کا اظہار اب تک اس ضرب المثل سے ہوتا ہے جو یہاں زبان زد خاص و عام ہے کہ "بدذات کی قدر بدذات جانے" سلاطین گجرات کے دسویں بادشاہ سلطان بہادر کے زمانہ میں کھمبات کا بندرگاہ ایک بڑی شان و شوکت کی جگہ تھی ۔ اور اسی بادشاہ کے دور

میں پُرتگالیوں نے کھمبات اور ڈیو میں اپنی پہلی کمپنی قائم کی تھی مگر اس کے فوراً ہی بعد انہیں وہاں سے نکال باہر کر دیا گیا ۔

جب مغل بادشاہ ہمایوں سلطان بہادر شاہ پر حملہ آور ہوا تو بہادر شاہ نے اپنا خزانہ مع زر و جواہر کھمبات منتقل کر دیا اور خود ڈیو میں پناہ گزین ہو کر پُرتگالیوں سے مدد کا طالب ہوا ۔ لیکن جب حملہ کے بعد ہی ہمایوں واپس چلا گیا تو بہادر شاہ کو افسوس ہوا کہ اس نے ناحق پرتگالیوں سے مدد مانگی ۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کے سوا اس کے پاس دوسرا چارہ ہی کیا تھا ۔ کہتے ہیں کہ جب سلطان بہادر نے اُن سے مدد طلب کی تو پرتگالی کمانڈر نے اُسے اپنے جہاز پر بلایا لیکن سلطان کو اس کے جہاز پر بلوانے سے یہ شک ہوا کہ شاید پرتگالیوں کی نیت نہ خراب ہو گئی ہو لہذا جب وہ پرتگالیوں کے کمانڈر سے ملنے گیا تو اپنے ہمراہ کچھ محافظ لے گیا ۔ سلطان کا خیال ٹھیک نکلا ۔ جب وہ جہاز سے اتر کر ایک کشتی پر چڑھنے لگا تو اس کشتی کی ڈوریوں کو جو جہاز میں بندھی تھیں پرتگالیوں نے کھینچ لیا اور کشتی کو اس زور کا ہچکولا دیا کہ بادشاہ سمندر میں گر پڑا ۔ ایک بار پھر وہ سطح سمندر پر ابھرا مگر ایک پرتگالی نے اس پر اتنی زور سے لٹھ مارا کہ پھر اس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سمندر کی تہہ میں غرق ہو گیا ۔ اس کے بعد پرتگالیوں نے ۱۵۳۶ء میں ڈیو پر باقاعدہ طور پر قبضہ کر لیا ۔

اس واقعہ کے تقریباً چھتیس سال بعد شہنشاہ اکبر نے بغیر لڑے بھڑے گجرات کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا ۔ وہ کھمبات بھی گیا اور اس نے نواح کے دو علاقوں کو اس میں شامل کر کے اس کی آبادی میں اضافہ کر دیا ۔ تقریباً ایک سو اسی برس تک گجرات پر مغلوں کا قبضہ رہا ۔ اس کے بعد مرہٹوں نے مغلوں سے چھین کر اس پر قبضہ کر لیا ۔ بہرحال کھمبات میں گیارہ مضافات شامل تھے مگر اب ان میں صرف ایک لیلو دیا دگار باقی ہے ۔

کھمبات میں ڈچوں اور انگریزوں دونوں کی کمپنیاں قائم ہوئیں لیکن کھمبات ہمیشہ سورت کے ماتحت رہا ۔ آزادی سے

قبل تک کمپنی کے انگریزی دفاتر یہاں رہے۔ یہاں ۱۹۳۱ء تک نواب کا اقتدار رہا۔

کھمبات ہی کے بندرگاہ کی وجہ سے بروچ اسورت اور بمبئی کے بندرگاہ وجود میں آئے۔ اور ان کے وجود میں آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ کھمبات میں ایسا زبردست جوار بھاٹا آتا ہے کہ سمندر کی لہریں تیس تیس فٹ بلند ہو جاتی ہیں اور ان کی رفتار چھ سات ناٹ فی گھنٹہ ہوتی ہے جب تک کھمبات میں بندرگاہ نہیں بنا تھا اس وقت تک یہ حالت تھی کہ جب جوار بھاٹا ختم ہو جاتا تو ہر طرف دو تین میل تک کیچڑ ہی کیچڑ نظر پڑتی۔ اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوتا کہ جوار بھاٹے کی وجہ سے بحری جہاز کھمبات کے شہر کے پاس پہنچ جاتے۔ کھمبات ہمیشہ ہی سے بندرگاہ رہا ہے۔ بندرگاہ کی شکل میں نہ سہی مگر بیرونی تجارت کا مرکز ضرور رہا۔ اور اب تو یہ باقاعدہ بندرگاہ بن گیا ہے اور اس کا شمار ہندوستان کے مشہور بندرگاہوں میں کیا جاتا ہے۔

پہلی صدی عیسوی میں پیریلس کے زمانہ سے یہاں سے معمولی اور قیمتی سے قیمتی جواہر باہر کے ملکوں کو بھیجے جاتے تھے۔ ہیرے جواہر کے علاوہ یہاں کی ململ بھی شہرۂ آفاق ہے اور ایک زمانہ سے باہر کے ملکوں میں بھیجی جاتی ہے۔ ایک زمانہ میں یہاں کے گلدان اور دوسرے ظروف بھی بڑی شہرت رکھتے تھے اور بحر روم کی راہ سے جو ممالک غیر سے ان کی تجارت ہوتی تھی اس میں یہ بڑے بڑے داموں پر فروخت ہوتے تھے۔ کھمبات میں ظروف کا بھی بہت بڑا بازار ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں کا بنا ہوا ایک پیالہ کئی کئی سو روپے میں فروخت ہوتا تھا۔ دو سو برس قبل یہاں کے بنے ہوئے ململ کے تھانوں کا یہ عالم تھا کہ ۵ گز لمبا اور ایک گز چوڑا تھان دو۔ اونس وزن کا ہوتا تھا۔ اس ایک تھان کے بنانے میں پورے آٹھ مہینے لگتے تھے اور یہ تھان بھری برسات میں بنائے جاتے تھے تاکہ ہوا کی رطوبت سے ان کا تار ٹوٹنے نہ پائے۔ تمام ہندوستان کی بنی ہوئی ململ کھمبات بھیجی جاتی تھی۔ ایک زمانہ میں یہاں بڑے قیمتی اور حسین قالین بھی بُنے جاتے تھے۔ ململ اور جواہر کا یہاں کی خاص چیزوں میں شمار ہے۔ کھمبات جواہر تراشی کے لئے بھی مشہور رہا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں یہ فن پورے عروج پر تھا۔ اس دور میں بڑے بڑے سیّاح کھمبات آئے چنانچہ ۱۴۱۹ء میں نکولوڈی کانٹی وہاں پہنچا اور وہ کھمبات کی دو چیزوں سے بے حد متاثر ہوا۔ اوّل وہاں کے لعلوں سے جو رتن کہلاتے ہیں، دوسرے وہاں کی ستی کی رسم سے۔ کھمبات کی ہندو بیواؤں کو اپنے شوہر سے جو روحانی لگاؤ ہوتا ہے اور جس کے جذبہ سے متاثر ہو کر وہ اپنے شوہروں کی چتا کے ساتھ بہ رضا و رغبت اپنے آپ کو بھی نذرِ آتش کر دیتی تھیں۔ یہ جذبہ کھمبات کی ہندو عورتوں میں شدّت سے پایا جاتا تھا۔

۱۴۶۸ء میں مشہور سیاح اتھاسیس نکیٹن کھمبات گیا تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی میں ایک اور سیاح جینوئس ہائی رونائی موڈی سانٹو اسٹی فیو عدن سے کالی کٹ اور سماترا گیا۔ اور واپسی پر جب اس کا جہاز جزائر مالدیپ کے قریب تباہ ہو گیا اور وہ مجروح ہو کر مفلوج ہو گیا اور اس کو کھمبات اسی حالت میں لایا گیا تو کھمبات کے ایک سوداگر نے از راہ مہربانی اُسے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ اس کے بعد اسے تری پولی بھجوا دیا۔

ایک اور سیّاح جسے دنیا بھر کی سیر کا شوق تھا اور جس کا نام لوڈو وکوڈی وتھما تھا بلونا کا باشندہ تھا۔ وہ بھی کھمبات گیا تھا۔ اس نے کھمبات کے بارے میں لکھا ہے کہ کھمبات کے چہار طرف ایک فصیل کھنچی ہے اور یہ ایک حسین شہر ہے۔ یہاں بہت ہی اعلیٰ درجہ کے پھل ہوتے ہیں اور کثیر مقدار میں غلّہ ہوتا ہے۔ اس نے سلطان محمود بگاڑا کے بارے میں بڑی دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ اس کی مونچھیں اتنی بڑی تھیں کہ جس طرح عورتیں اپنی چوٹی کا جوڑا باندھتی ہیں اسی طرح وہ اپنی مونچھیں اپنے سر کے چاروں

طرف باندھ لیتا تھا اور یہی حالت اس کی سفید داڑھی کی تھی جو اس کے ٹخنوں تک گئی ہوئی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ

"سلطان زہر خور ہے۔ اگر وہ اپنی سلطنت یا دربار کے کسی عہدیدار یا امیر کو سزائے موت دینا چاہتا تھا تو اسے بلوا کر پہلے اپنے سامنے ننگا کراتا تھا اس کے بعد اس کے کوڑے لگواتا تھا۔ پھر کچھ پھل اور جڑی بوٹیاں پان کی طرح منہ سے چبا کر اور گھونگھوں کا عرق منہ میں لے کر اس شخص پر تھوک دیتا تھا جس کے آدھ گھنٹے کے بعد ہی وہ شخص مر جاتا تھا۔"

محمود کے مرنے کے کچھ ہی دن بعد جب باربوسا نامی سیّاح کھمبات پہنچا تو اس نے بھی سلطان کی زہر خوری کی عادت کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سلطان اس قدر زہریلا تھا کہ اگر اس کے ہاتھ پر کوئی مکھی بیٹھ جاتی تھی تو وہ پھول جاتی تھی اور چشم زدن میں مر جاتی تھی۔

بہر صورت کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگوں کو سلطان سے محض اس بنا پر نفرت تھی کہ وہ بے حد کھاؤ قسم کا انسان تھا۔ کیونکہ دوسری جگہ اسی سلطان کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ بہت ہی طاقتور، شجاع اور بہادر کسان تھا اور زہر خوری کی داستان کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ شاہ بلوط کا پھل استعمال کرتا تھا اور شاہ بلوط کے پھل کے بارے میں مشہور ہے کہ جو لوگ اس کے پھل کو کھاتے ہیں ان کے جسم میں زہر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ زہر کے اثر سے نہیں مرتے۔

سولھویں صدی کے اوائل میں ایک سیاح باربوسا نامی کا لکھا ہوا ایک سفر نامہ بیرو۔لونا کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا تھا جس میں کھمبات کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ گجرات اور کھمبات میں لوگ کن کن کھیلوں سے دلچسپی لیتے ہیں۔ انھیں کھیلوں میں ایک کھیل چوگا کہلاتا ہے جو گھوڑے پر بیٹھ کر کھیلا جاتا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ فارسی میں جسے چوگان اور انگریزی میں پولو کہتے ہیں۔ یہ وہی کھیل ہوگا۔

جہاں تک کھمبات کی صنعت و حرفت کا تعلق ہے وہاں ہاتھی دانت کا بھی نہایت نفیس کام ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سونے چاندی کے زیورات پر اور تلوار اور چاقو کے دستوں پر ہیرے جواہر جڑنے کا کام بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا تھا۔ یہاں رنگ برنگی دانوں کی تسبیحیں بھی کثیر مقدار میں بنتی ہیں اور دوسرے ملکوں کو بھیجی جاتی ہیں۔ یہاں سے چھوٹے پتھروں کو بھی نہایت نفاست سے تراش کر غیر ملکوں میں بھیجا جاتا ہے۔ یہاں جو چھوٹے موتی ہوتے ہیں ان میں اور سچے موتیوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

شہر کھمبات کے علاوہ ایک اور شہر ہے جو نموودرا یا نمودرا کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں ایک اعلیٰ قسم کا پتھر پایا جاتا ہے جس سے عقیق تیار کرتے ہیں۔ اس کی تسبیحیں بھی بہت مشہور ہیں۔ یہ ایک دودھیا پتھر ہوتا ہے جس میں کچھ سرخی ہوتی ہے اور آگ کے سامنے رکھ کر اس کی سرخی کو نکھار کر اور شوخ بنایا جاتا ہے۔ یہ پتھر کثیر مقدار میں سمندر سے برآمد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ایک پتھر اور دستیاب ہوتا ہے جسے وہاں کی اصطلاح میں سبگور کہتے ہیں۔ اس پتھر کو عقیدتاً ناموس کی حفاظت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص اسے پہن لے اور وہ جسم کی کھال سے مس ہوتا ہے تو کوئی شخص اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ آج کل چھوٹے پتھروں کی تراش خراش کا وہ زور نہیں رہا جو اب سے ایک دو صدی قبل تھا بلکہ اب نقلی پتھر سوئٹزرلینڈ، جرمنی اور فرانس سے منگوائے جاتے ہیں اور انھیں نہایت خوبصورتی اور نفاست سے تراش کر غیر ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ عقیق، لعل، پنّا اور سفیدہ کا شمار اب بھی یہاں کے مشہور پتھروں میں ہے۔

کھمبات میں بہت سی خوبصورت اور قدیم عمارتیں بھی ہیں۔ یہاں کی جامع مسجد پندرھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس مسجد کی ساخت بالکل ویسی ہے جیسی کہ التمش کی بنوائی ہوئی مسجد اجمیر شریف میں ہے مگر اس مسجد میں

بعض چیزیں اس مسجد سے مختلف ہیں۔ اس میں جو ستون ہیں وہ اندر سے کھوکھلے ہیں۔ یہاں کی دوسری مشہور عمارتوں میں امرادین احمد گہرانی کا مقبرہ ہے۔ اس مقبرے کو اس نے خود اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرایا تھا اور مقبرہ کے علاوہ اس نے ایک مسجد بھی بنوائی تھی جو ایک دو منزلہ عمارت ہے۔ اس میں صرف ایک ہی گنبد تھا۔ یہ گنبد بے جوڑ تھا اس لئے تین سو برس بعد یہ منہدم ہو گیا۔ اس گنبد کا قطرہ ۲ فٹ تھا۔ جس جگہ یہ مسجد واقع ہے اس کے گرد و پیش کا منظر بھی بہت ہی دل کش ہے۔

آمر سورتی

پیغامبرِ امن

تھے بصد شوق اُدھر لوگ جدھر تھے نہرو
اہلِ دل، اہلِ وفا، اہلِ نظر تھے نہرو

جس سے ہر شخص ہو خوش سب کو یقیں ہو جس پر
ایسا رہبر ہے کہاں کوئی، مگر تھے نہرو

باغِ انسانیت و باغِ رواداری کے
یہ حقیقت ہے شگفتہ گلِ تر تھے نہرو

جس طرح اپنے مقاصد پہ اٹل رہتے تھے
یونہیں اظہارِ مقاصد میں نڈر تھے نہرو

یاد ہوگا تجھے اے گردشِ حالات ابھی
سامنے تیرے فقط سینہ سپر تھے نہرو

عام ہو امن و اماں ملک میں" اس جملے کے
مبتدا گاندھی اگر تھے تو خبر تھے نہرو

کتنے موڑ آئے مگر قافلہ گم ہو نہ سکا
واقعی واقفِ ہر راہ گزر تھے نہرو

با اثر شخصیتوں پر بھی اثر تھا ان کا
رونقِ محفلِ اربابِ اثر تھے نہرو

شاق کیوں گزرے جدائی نہ دلِ عالم پر
خیر خواہِ ہمہ تن نوعِ بشر تھے نہرو

لوگ کہنے لگے پیغامبرِ امن آمرؔ
کوششِ امن میں یوں شام و سحر تھے نہرو

غزل

بھر گئی تیری نظر اور کوئی بات نہیں
لُٹ گئے شام و سحر اور کوئی بات نہیں
تیرے ابرو پہ پڑے بل، تو نظامِ عالم
ہو گیا زیر و زبر اور کوئی بات نہیں
تو نے کچھ ایسے کیا، دل میں مگر گھر اے دوست!
بھول بیٹھا ہوں میں گھر اور کوئی بات نہیں
تم نے اُلٹا جو سرِ بزم نقابِ رُخ کو
بجھ گئے شمس و قمر اور کوئی بات نہیں
آج تک وجد میں ہیں آٹھ پہر ماہ و نجوم
تم نے دیکھا تھا ادھر اور کوئی بات نہیں
بن گئے راہ کے کانٹے بھی گُلِ تر ساقی
اک تری میٹھی نظر اور کوئی بات نہیں
تیرا جینا بھی مرے شیخ! کوئی جینا ہے
رات دن نفع و ضرر اور کوئی بات نہیں

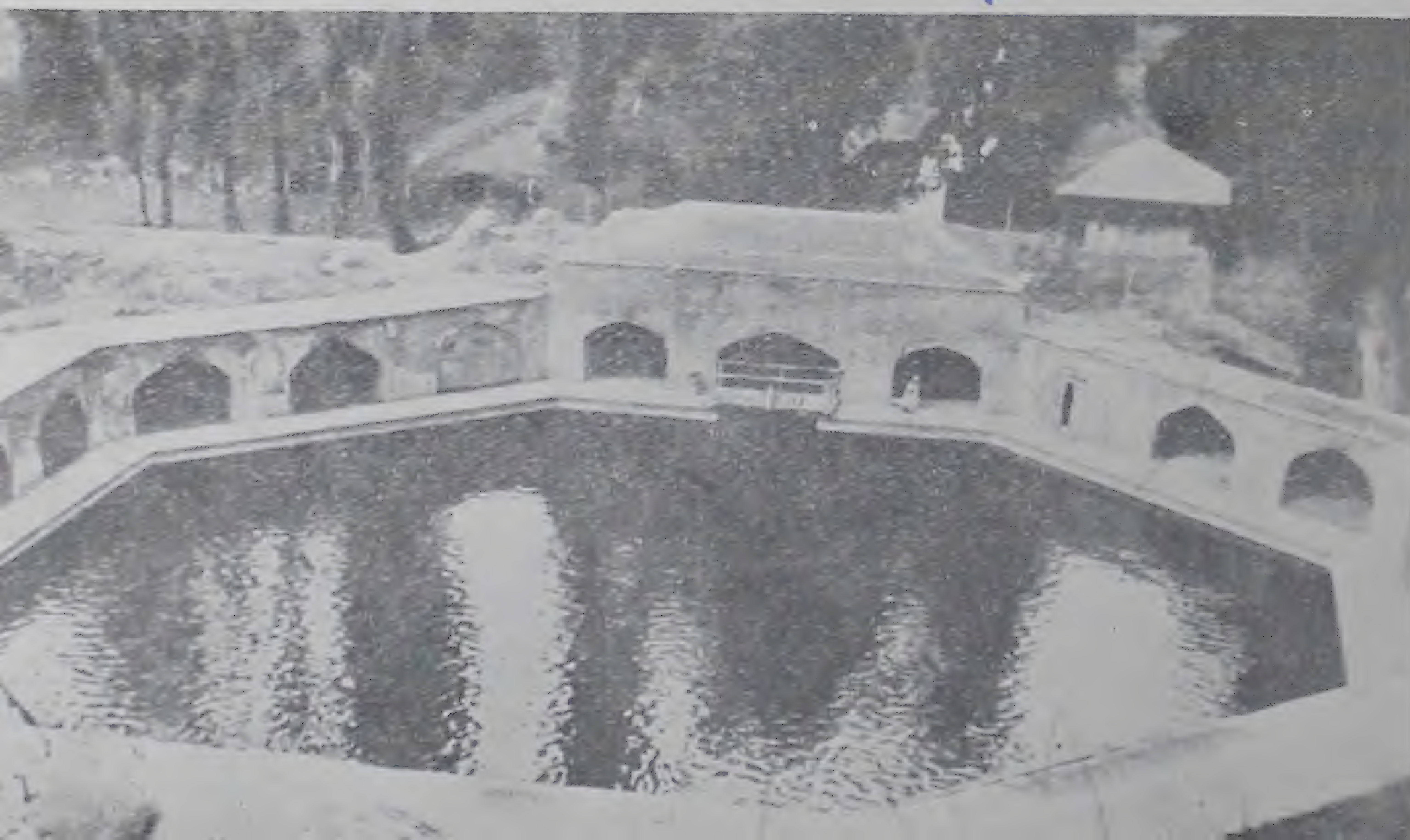
غزل

سنبھالے اپنے دامن میں نئے پندار کے بستے
سب اپنی اپنی رَو میں جا رہے ہیں دوڑتے کتے
وہ گلشن ہو کہ صحرا ہو کہیں پہنچا تو دیتے ہیں
تری آرام گاہوں سے تو بہتر ہیں مرے رستے
کبھی گرتے ہیں دامن میں کبھی ملتے ہیں مٹی میں
انھیں آنکھوں کے موتی ہیں کبھی مہنگے کبھی سستے
حیاتِ شوق خاک و خوں ہوئی ہے یوں کہ اب پیہم
مہکتے ہیں مرے دل میں تری یادوں کے گلدستے
دلِ خود دار کو کچھ دُوریوں کی لاج رکھنی تھی
وگرنہ ہم تو مدت سے تری بستی میں آ بستے
خس و خاشاک جلتے جا رہے ہیں صحنِ گلشن کے
یہ سچ ہوتا تو پھر یہ زیست کے لمحات کیوں ڈستے
کبھی احساسِ ناکامی، کبھی احساسِ رسوائی
ہم اس غم ناک عالم میں اگر ہنستے تو کیا ہنستے



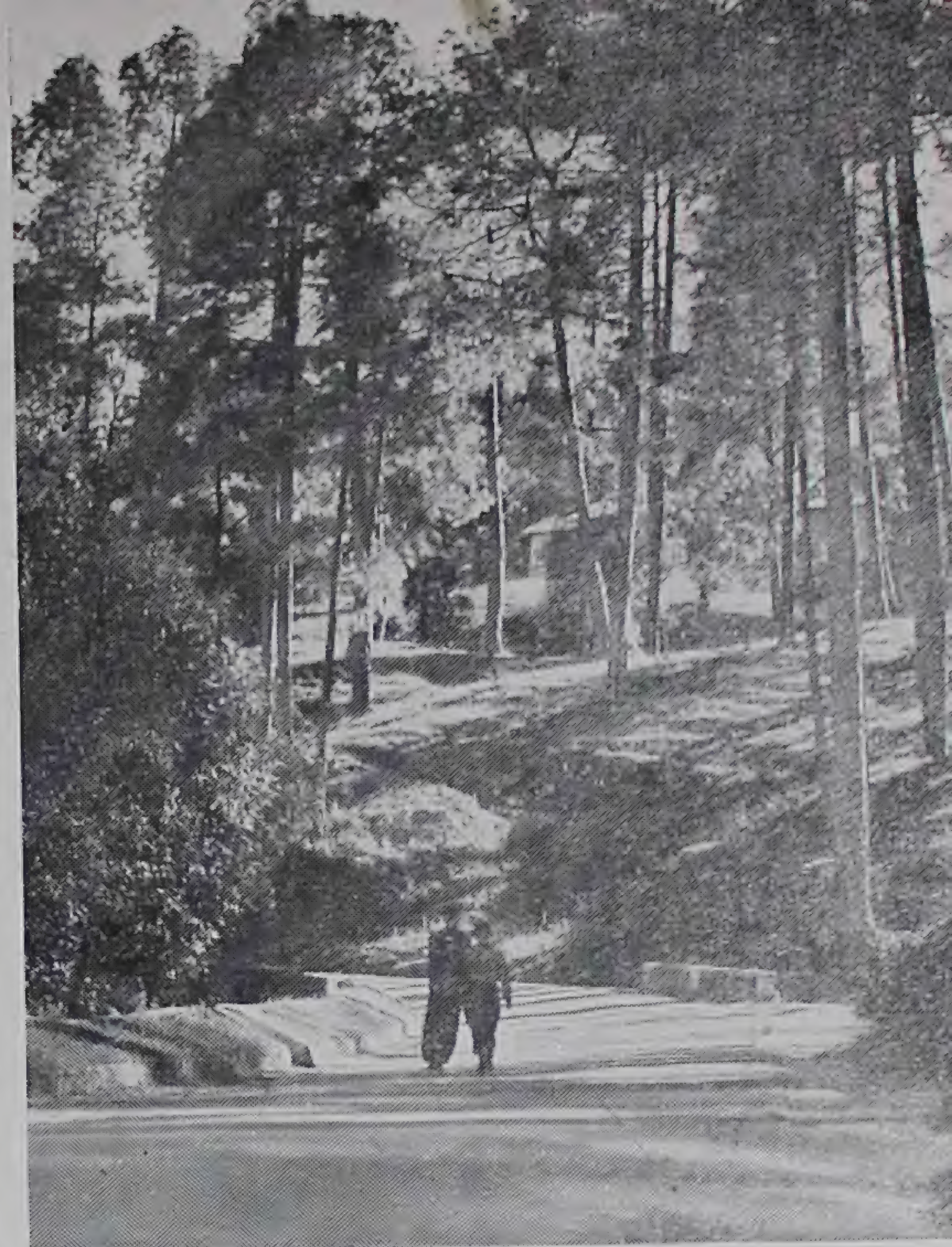
اچھابل (کشمیر)

ویری ناگ (کشمیر)





نینی تال



رانی کھیت

گرمیوں کی سیرگاہیں

مسوری

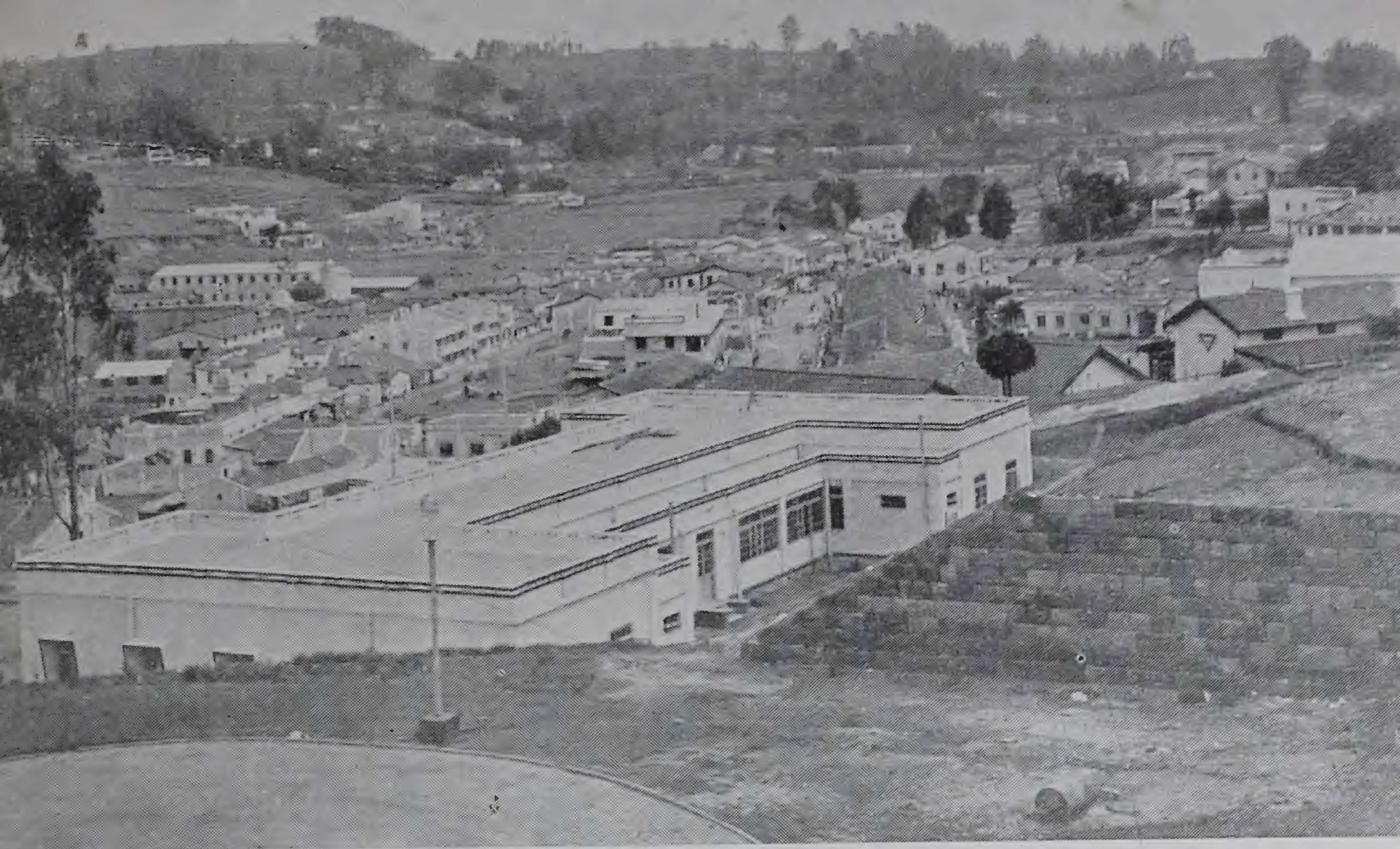




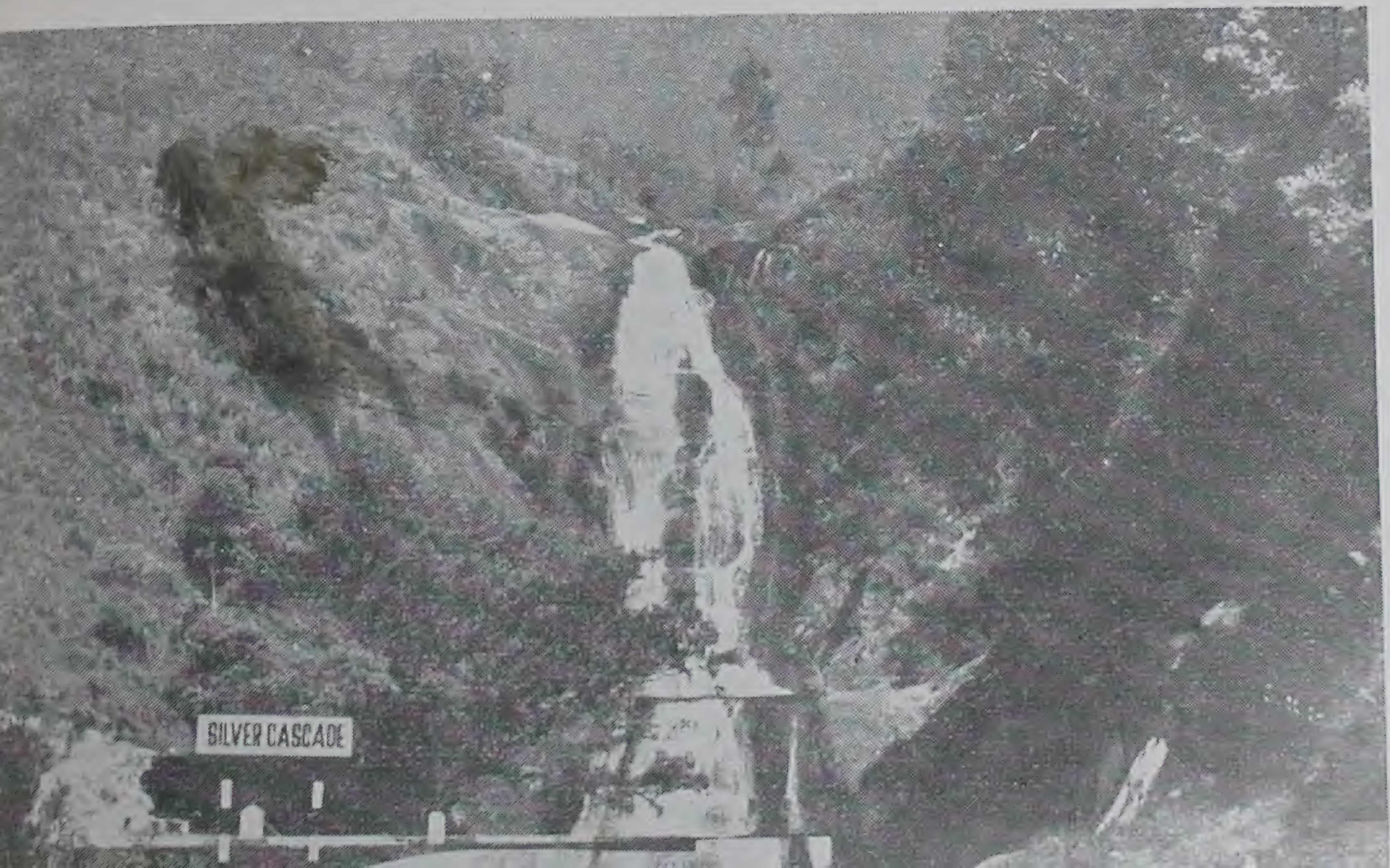
دارجلنگ



شملہ



اوٹاکمنڈ



ئی کنال کا آبشار

ست پرکاش سنگر

فون پھر آیا دلِ زار....

بیا لکھی رام کا مشورہ قبول کرنا ایک مصیبت ہے، نہ قبول کرنا اس سے بڑی مصیبت۔ ان کے دماغ میں جب کوئی لہر آتی ہے، فوراً بھاگے بھاگے آتے ہیں اور سب سے پہلے مجھے ہی نشانہ بناتے ہیں۔ سردی کے دنوں میں پانچ بجے صبح سیر کرتے جاتے ہیں اور اپنے خصوصی دوستوں پر احسان بانٹتے ہوئے انھیں دروازوں پر دستک دے کر جگاتے ہیں۔ ایک دن میری شامت آئی تو صبح آدھمکے۔ مجھے جگا کر تقریر جھاڑنے لگے۔

"رات بارہ بجے تم سے ضروری باتیں کرنا تھیں۔"

"تو آجاتے۔"

"کہنا آسان ہے۔"

"اب بتلا دیجئے۔"

"اس بات میں اب وہ لطف کہاں؟"

"پھر بھی؟"

"یکے بعد دیگرے منشی رام سے دو بازیاں جیتی تھیں۔"

"پھر تو اہم بات تھی۔" میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"اس سے مجھے ایک تجویز سوجھی۔"

"خدا خیر کرے۔ کیا؟"

"کہ ہم دونوں ٹیلی فون لگوائیں۔"

ارے یار۔ چھوڑو بھی۔"

"میں آج ہی اس کے لئے ضروری اقدام اٹھاؤں گا۔ ایس ڈی او اپنے شطرنج کے دوست ہیں۔ ٹیلی فون لگنے میں دیر نہیں لگے گی۔"

"کتنا خرچ ہوگا؟"

"یہی چار پانچ سو سالانہ۔"

"دونوں کے۔"

"ایک کے۔"

"مجھے ٹیلیفون نہیں چاہیئے۔" میں نے قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور مجھے ضرور چاہیئے۔" انھوں نے میرے فیصلہ کو رد کرتے ہوئے کہا۔

"بلا وجہ کا خرچ۔"

"آدمی کو پیسے کے منہ نہیں لگنا چاہیئے۔ عزت ہے تو پیسے کی بھی قدر ہے۔ عزت ہی سے شہرت ملتی ہے۔ روپیہ آدمی کے ساتھ نہیں جاتا۔"

"عزت اور شہرت بھی ساتھ نہیں جاتی۔"

"یہی تو آپ کی غلطی ہے۔" وہ میری بات کا مذاق اڑاتے ہوئے بولے۔ "عزت اور دھن کو ایک سا درجہ نہیں دینا چاہیئے۔ میری بات کو اہمیت نہیں دیتے نہ دو۔ شاعروں اور سنتوں کی تو سنو۔"

"شاعر اور سنت؟"

"جی ہاں، کبیر، نانک، دادو، تلسی اور سور داس...."

"ٹیلیفون کے بارے میں انھوں نے کیا کہا ہے؟"

"پوچھئے کیا نہیں کہا؟ مثلاً کبیر جی فرماتے ہیں"۔

کبیرا تیری جھونپڑی گل کٹین کے پاس
جو کرن گے سو بھرن گے تو کیوں بھیو اداس

"اس میں آپ والی بات کہاں ہے؟"

"یہی تو آپ کی غلطی ہے۔" بیساکھی رام بولے۔ "کبیر کو سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ کہتے ہیں۔

'کبیرا سنگت سادھو کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔'

کبیر جی سادھوؤں کی سنگت کا ایڈوائس کرتے ہیں، ٹیلی فون کی نہیں۔" میں نے ان کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

"یہی تو آپ کی غلطی ہے دھیان سے پڑھنے پر پتہ چلتا ہے کہ ہمارے سنت اور شاعر اچھی صحبت کا ایڈوائس کرتے ہیں اور آج کے زمانے میں ٹیلی فون سے بڑھ کر اچھا ساتھی کوئی نہیں۔ جب جی اداس ہوا، رسیور اٹھایا اور بات شروع کر دی۔ دوسرے اس بات کو مت بھولئے کہ فی زمانہ سوشل پوزیشن حاصل کرنا اشد ضروری ہے۔ اور ٹیلی فون کے بغیر سوشل پوزیشن بنانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا بلاٹکٹ گاڑی میں سفر کرنا۔"

"بلاٹکٹ گاڑی میں سفر کرنے والوں کی کم تعداد نہیں ہوتی۔"

"یہی تو آپ کی غلطی ہے۔" وہ قدرے خفگی سے کہنے لگے "آپ پروفیسر راج گوروہی کو لیجئے۔ جب سے انھوں نے ٹیلی فون لگوایا ہے، ان کی سوشل پوزیشن کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ جب چاہیں اخبار والوں، سٹہ بازوں اور سینما گھروں سے بات کر سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے۔" وہ مجھ پر راز انکشاف کرنے کے انداز سے کہنے لگے۔ "آپ کی شہرت بڑھ جاتی ہے۔"

"شہرت! وہ کیسے؟"

"ڈائرکٹری دیوی میں آپ کا نام چھپ جانے سے۔"

"اس میں تو ہر قماش اور معاش کے لوگوں کے نام ہیں۔"

"اس سے کیا؟ آپ کا بھی تو ہوگا۔ دوسرے، محلے والوں کو ٹیلی فون کرنے کی اجازت دے کر آپ ان کی خوشنودی حاصل کر سکیں گے۔ انھیں فائدہ پہنچائیں گے۔ ان سے فائدے کی امید رکھیں گے۔ لوگ تو مورکھ ہیں جو اس زمانے کو کلجگ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ کرجگ ہے۔ اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے۔"

"یعنی ایک ہاتھ سے ہم رسیور پکڑیں، دوسرے سے وہ۔"

"یہی تو آپ کی غلطی ہے۔ غلطی نہیں، مصیبت ہے۔ آپ بات سمجھتے نہیں، سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ٹیلی فون لگنے سے آپ کا ٹیکسی اور سکوٹر کا کرایہ بچے گا۔ دوسروں کے پاس جاکر وقت ضائع کرنے کی بجائے دو منٹ میں بات چیت کر سکیں گے۔ دونوں ہی کو اس سے فائدہ ہوگا۔"

"وہ تو تبھی ہوگا اگر دوسروں کے پاس بھی ٹیلی فون ہو۔"

"یہی تو آپ کی غلطی ہے۔ آپ کی تقلید کرتے ہوئے وہ بھی لگا لیں گے۔"

ان کے اصرار پر مجھے ٹیلی فون لگوانا پڑا۔ افتتاحی تقریب پر ہم نے ہری جن نیتا اور سابق سیکرٹری ہندو سبھا، سابق پریزیڈنٹ ضلع سوشلسٹ پارٹی، سابق خزانچی کانگریس منڈل اور سابق سٹوڈنٹ لیڈر شری مانک رام کو بلایا۔ شام کے دھندلکے میں ان کی دھواں دھار تقریر کتنی مؤثر تھی۔ چائے کی پیالیوں میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا اور میرے دل کی گہرائیوں سے آہوں کا دھواں نکل رہا تھا۔ چھ ماہ کی لگاتار کاوش کے بعد ہم موجودہ ٹیلی فون کے اور مستقبل کی شہرت کے مالک بننے کے اہل ہوئے تھے۔

خطبۂ صدارت کے بعد بیساکھی رام کے مشورے پر ٹیلی فون کا ادگھاٹن چرم ادیوگ کے آنریری اسسٹنٹ سیکرٹری کے کر کملوں دوارا کرایا گیا۔ انھوں نے رسیور اٹھایا اور اسے ہاتھ میں لے کر بولے۔

"ہیلو!"

جواب میں کسی نے کہا

"ہیلو!"

انھوں نے پھر کہا

"ہیلو!"

جواب میں بھی کسی نے کہا

"ہیلو!"

وہ بولے۔ "ٹیلیفون خراب ہے۔ اس میں گنبد کی آواز آرہی ہے۔"

بیساکھی رام کے مشورے پر محلے والوں کو اس دن فری ٹیلیفون کرنے کی اجازت تھی۔ اس خبر کو سنتے ہی لوگ ایسے آنے لگے جیسے ٹیلی فون نہیں، مفت چلنے والی آئس کریم کی فیکٹری لگی ہو۔ محلے کے لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ تہذیب و تمدن کے پروردہ ہونے کے سبب وہ کیو میں کھڑے ہو گئے۔ دیر تک کھڑے ہونے کے کارن اُن کے لئے چائے کا انتظام کرنا پڑا۔ کچھ صاحب تشریف لانے سے پیشتر پوری طرح ناشتہ نہیں کر پائے تھے۔ اُن کے لئے بھوجن کا پربندھ کیا گیا۔

اس تقریب کے سلسلے میں مجھے تین دن کی رخصت لینی پڑی۔ ایک دن تیاری اور ایک دن آرام کے لئے۔

لیکن یہ کوئی کم نہیں تھا کہ ہم ٹیلی فون کے مالک ہو گئے اور ڈائرکٹری میں ہمارا نام درج ہو گیا۔

بیساکھی رام کا مشورہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ ٹیلی فون لگنے سے ہماری پوزیشن پر ایک دم فرق پڑ گیا۔ محلے میں ہمارا رسوخ کئی گنا بڑھ گیا۔ شہر میں ہمارا نام خاص و عام کی زبان پر آگیا۔ گھر کی اداسی کافور ہو کر رونق میں اضافہ آگیا۔ جہاں پہلے ہر وقت خاموشی چھائی رہتی، وہاں اب گھنٹیوں کا پہرہ مسلط ہو گیا۔ دیر تک گھنٹی بجتی۔ گھنٹی سن کر ہم پڑوسیوں کو بلاتے۔ وہ گھنٹی سننے اور اس کا جواب دینے کے لئے آتے۔ دور تک گھنٹی کی آواز پہنچانے کے لئے دوسرے پڑوسی تشریف لاتے۔ ہم فخریہ کہتے:

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

سردی کی بھیگی راتیں ہوں یا گرمیوں کے لمبے دن۔ گھنٹی کو کبھی آرام کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ کھانے سے فارغ ہو کر سخت لُو اور گرمی سے بچنے کے لئے کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے کمروں کے اندر سو جاتے یا سونے کا بہانہ کر کے لیٹ جاتے۔

ٹن۔ن۔ن۔ن۔ن.....

فضا گھنٹی کی آواز سے معمور ہو جاتی۔

ٹن۔ن....ن....ن.....

آواز رکنے کا نام ہی نہ لیتی۔

ہر کوئی نیند کا بہانہ کئے آنکھیں موندے لیٹا رہتا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ ایسی تیکھی آواز تو فرشتوں کی نیند بھی حرام کر سکتی ہے، لیکن سب جیسے کانوں میں تیل ڈالے لیٹے رہتے۔ لاچار و مجبور مجھے اٹھنا ہوتا۔

"ہیلو، کون ہے بھائی؟"

"آپ ٹو۔ ٹو۔ ٹو۔ تھری۔ ٹو۔ فور سے بول رہے ہیں؟"

ہاں ہاں، ٹو۔ ٹو۔ ٹو تھری۔ ٹو فور سے بول رہا ہوں۔ تم کون ہو؟"

"تلسی جی۔"

"مہاتما تلسی داس جی؟"

"تلسی جمعدار جی۔ ڈاکٹر بھارگو کا کلاس فور سرونٹ جی۔"

"اوہ کلاس فور جی! دوپہر کے بارہ بجے کیا مصیبت آن پڑی"

"بی بی جی نے دو جھاڑو منگوائے تھے۔"

"ہم سے؟ بی بی جی سے کس نے کہا ہم جھاڑو رکھتے ہیں؟"

"نہیں صاحب بازار سے منگوائے ہیں۔"

"ہم نے کب منع کیا ہے؟"

"نہیں جی۔ بھاؤ چڑھ گیا ہے۔"

"تو میں کیسے اتار سکتا ہوں؟ "کتنا چڑھ گیا ہے بھاؤ؟"

"دو پیسے فی جھاڑو۔ اور بی بی جی ایک پیسہ سستا لانے کے لئے کہہ رہی تھیں۔"

"تم لے آؤ۔"

"صاحب۔ بی بی جی....."

"بی بی جی سے نپٹ لیں گے۔"

ریسیور اٹھا کر میں سوئے بستر روانہ ہوا، لیکن قسمت بھی ساتھ ہی تھی۔ وہاں پہنچنے سے قبل ہی گھنٹی کی آواز نے پھر متوجہ کیا۔

"صاحب! میں تلسی ہوں۔"

"ارے کیا ہے ؟ جھاڑو لایا نہیں ؟"

"صاحب۔ یہ دھن سنگھ بھی آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

"ہاں دھن سنگھ کہو، نوکری کی بات ہے ؟"

"نہیں صاحب! مجھے بھی بی بی جی نے تلسی کے ساتھ بازار بھیجا تھا۔ دو گھنٹے سے گھوم رہا ہوں۔ بھنڈی دو آنے سیر سے کم نہیں ملتی، بینگن کا بھاؤ دو پیسے سیر چڑھا ہوا ہے۔ توری کو تو جیسے آگ لگ گئی۔ پورے چھ پیسے کی آدھ سیر ہے اور کوئی سبزی فروش دھنیا اور مرچ مفت دینے کو تیار نہیں اور۔۔"

"تو پیسے دے کے لے لے۔"

"صاحب۔ بی بی جی ناراض ہوتی ہیں۔"

"تو بتلاؤ مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟"

"صاحب۔ بی بی جی سے مل کر ان کی اجازت لے دیجئے۔"

"اس وقت تو سو رہی ہوں گی۔ تم ایسا کرو۔ جو بھاؤ ملے لے آؤ۔ باقی پیسے مجھ سے لے لینا۔"

"صاحب۔۔۔۔۔"

اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"کس سونے والی کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں ؟" شریمتی جی پوچھنے لگیں۔

"آپ ہی تو سو رہی تھیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔"

اور ابھی ابتدائے عشق ہے

ٹن۔۔۔ن۔۔۔۔ن۔۔۔۔ن

"ہیلو!"

"صاحب میں ہوں۔۔۔۔"

"شبھ نام ؟"

"کالی داس۔"

"شگفتلا کے مصنف۔"

"نہیں صاحب بستی کا گھر والا اور نائی سماج کا اپ منتری۔"

"لیکن ہمارے تو منڈن ہو چکے۔"

"صاحب منڈن کی نہیں، دوسری بات ہے۔"

"فرمائیے۔"

"آپ کا گھر ہے نا۔۔۔۔"

"ابھی تک تو ہے۔"

"اس کے سرے پر ایک مکان ہے۔"

"صحیح تو تھا۔"

"اس سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر ایک پنواڑی کی دکان ہے۔"

"وہ بھی ہے۔"

"اس سے پانچ دکانیں چھوڑ کر بابو لال نائی کی دکان ہے۔"

"ارے یہ بات پہلے ہی کیوں نہ کہہ دی۔ اسے کون نہیں جانتا۔ وہ تو ہمارا اپنا نائی ہے۔" میں نے فخریہ انداز سے کہا۔

"صاحب اسے اشد ضروری سندیس دینا ہے۔"

"کہو۔"

"وہ یہ کہ پولیس کو اس کے جوا کھیلنے کے اڈے کا پتہ چل گیا ہے۔ دوسرے، جو عورت وہ بھگا کر لایا تھا اسے بانکے بہاری نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے، تیسرے جو اس کے پاس ناجائز شراب۔۔۔۔۔"

"بس۔ بس۔ بس۔ میں سمجھ گیا۔ اسے ابھی اطلاع بھیج دیتا ہوں۔"

نیند نے اس قدر غلبہ ڈالا کہ ہوش نہ رہا۔ خواب میں گھنٹیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں ایک ایسے دیس میں پہنچ گیا ہوں جہاں گھنٹیاں ہی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ ہر زن و مرد کے گلے میں گھنٹیاں بندھی ہیں۔ پرندے اور چوپائے گھنٹیاں لٹکائے پھرتے ہیں۔ جیسے خواب میں مجھے کوئی کہہ رہا ہے۔

"گھنٹی بج رہی ہے۔"

"بج رہی ہے۔"

"ٹیلیفون کی گھنٹی ہے۔"

"ہاں ہے۔"
"بج رہی ہے۔"
"سائیکل کی ہوگی۔"
"شاید الارم ہے۔"
گھنٹی کیا ہے۔ مصیبت ہے۔"
"مصیبت کی گھنٹی؟"
نہیں ٹیلیفون کی۔"
"بتلایا کیوں نہیں؟" میں بڑبڑا کے اُٹھا۔
ہیلو!"
"کہیے کیا حال ہے؟"
"پہلے سے زیادہ اچھا نہیں۔" میں نے کہا۔
مجھے پہچانا نہیں؟"
"پہچان لیا۔"
"بتلائیے کون ہوں؟"
"نند لال سے گوت کنالی۔"
"اجی صاحب میں تو کرشن مرادی گوڈ کناری بزاز ہوں۔"
"میرا مطلب وہی تھا، کہیے۔"
"آپ کے پڑوس میں پروفیسر دیال ہیں نا۔"
"جی۔"
"اُن کی ماں...."
"کیا کہا؟.... منہ سنبھال کر بات کہیے۔"
"ابھی تو رسیور سنبھالے ہوں۔ ہاں۔ ان کی ماں ہماری دوکان پر کپڑا لینے آئی ہیں۔"
"تب ہی۔ میں نے سمجھا.... تب دے دیجئے...."
"ماں جی کے سوا پانچ آنے نالی میں گر گئے۔"
"بڑا افسوس ہے۔"
"جمعدار انھیں نکالنے کے پانچ پیسے مانگ رہا ہے۔ ذرا ان کی بہو سے اجازت لے دیجئے۔ یہ اونچی دکان ہے۔"
"اور پھیکا پکوان!" میرے منہ سے نکل گیا۔

"نہیں صاحب۔ اس وقت نہیں چلے گا۔ اجازت چاہیئے۔"
دیال صاحب کو جگایا گیا۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو جگایا۔ لڑکے نے بیوی کو۔ اجازت نامہ لے کر کرشن مرادی گوڈکناری اونچی دکان والے کو بذریعہ ٹیلی فون بھجوایا گیا۔
تین سے چار بجے تک ٹیلی فون لڑکیوں کے لئے ریزرو رہتا۔
"ہیلو سرلش۔ گڈ ڈے۔ اچھا گڈ آفٹرنون سہی...... آئے کیوں نہیں؟..... تم بہت خراب ہو.....کل دو گھنٹے گاندھی بھون کے پیچھے لان میں تمھارا انتظار کرتی رہی...... کہاں چلے گئے تھے؟...... بھاڑ جھونکنے؟...... دن کے وقت جھونکا کرو...... کیا کہا؟ پکچر دیکھنے؟ ...... کس کے ساتھ؟..... کیلاش؟........ کون کیلاش؟ کیلاش وتی گماشتہ؟..... کیا کہا؟ کیلاش چندر...... ہی ہی ہی..... تب سہی.... پابندی؟ ہاسٹل میں؟..... کچھ بھی نہیں، سات سے سات تک کی آزادی ہے۔...... رات نہیں۔ دن کے.... یہی تو مزے ہیں...... میلہ..... ہاں جناب ہاسٹل کے باہر میلہ لگا رہتا ہے...... رشتہ دار ملنے آتے ہیں۔ نہ جانے نت نئے رشتے کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں..... تو شام کو آؤ گے؟ ہاسٹل کے گیٹ پر..... ہاں، وہیں سے سیر کرنے چلیں گے.... ٹاٹا.....!
کبھی کبھی مسز پروفیسر رستوگی، سیکرٹری مجلس خواتین اپنی چیئرمین مسز ماجد سے بات کرنے آتیں۔
"ہیلو مسز ماجد...... ہاں..... کل۔ کل کا پروگرام طے ہوا ہے...... منیکا گاؤں میں.... بازار سے کھانے پینے کا سامان لے چلیں گے...... چکن سینڈوچ..... ہاں، پیرا ماؤنٹ سے لے لیں گے..... لیکچر!.... ہاں لکھوا لیا ہے.... میں نے ان سے کہا تھا.... انھوں نے اپنے ریسرچ اسکالر سے کہہ دیا تھا..... سب باتیں آگئی ہیں..... گاندھی جی.... ونوبا..... جے پرکاش.... کرٹ.... چرخہ..... گرام ادیوگ..... چینی حملہ.... پاکستان....

صادق.... عبداللہ... ڈانگے کے خطوط کا ذکر نہیں ......
باقی سبھی باتوں کا ہے....... آپ دو تین بار پڑھ لیجئے گا
...... آج بھجوا دوں گی...... ہار؟ ...... خرید لئے ہیں۔
سیٹھ بلاقی رام کی بیوی آپ کے گلے میں ڈال دیں گی......
پریس؟ ...... وہ سب انتظام ہو گیا ہے...... 'نیا پیپر'
کا ایڈیٹر خود ساتھ جا رہا ہے..... پرانی دمڑی کے ایڈیٹر کو
مت منہ لگائیے۔ کمینہ ہے...... نام بھی کیا ہے......
جوہر کریدی!...... کیمرہ مین بھی ہوگا۔ وہی نوجوان لڑکا.....
جمیل..... وردیاں؟ ...... ان کا انتظام ہو گیا ہے....
جلسے کے بعد وردیاں واپس لے لیں گے۔ ان کی جگہ لڈو دیں گے
یہی نا..... بچے وردی نہیں لڈو پسند کرتے ہیں.......
ہیں؟ ..... آپ تو جانتی ہیں میری پسند؟" آہ بھرتی ہیں
...... کون یہ پروفیسر لوگ؟ یہ چندہ وندہ نہیں دیتے..
...... ان کی بیویاں؟ ...... ان سے بھی گئی گزری۔ سماج
سیوا کے کام کا مذاق اڑاتی ہیں۔ گھر کے کام ہی کو سماج مانتی
ہیں....... یہ لوگ بھی بیویوں کو باہر جانے سے روکتے
ہیں...... سنتے ہیں تو سن لیں۔ میرا کیا بگاڑ لیں گے؟
...... آج کل کے زمانے میں بھی یہ لوگ نوکروں سے نہیں
بیویوں سے کام کراتے ہیں..... نوکر رکھ سکتے ہی نہیں۔
...... دھیرے...... سن رہے ہیں...."

"نہیں سن رہا۔"...... میں نے ازراہِ پروٹسٹ کہا۔

بسنت سنگھ صابن ساز کو بھی فون کی ضرورت پڑتی ہے۔
"ست سری اکال جی - گورمیت امتحان میں نقل کرتا
پکڑا گیا تھا۔ سپروائزر کو بھی مزہ چکھا دیا ہے.......
اور..... سب ٹھیک کرا لیا ہے...... آپ نے کہا تھا
پرچوں کا پتہ کریں گے..... کر لیا؟ ..... کہاں......؟
رانچی...... کوئی بات نہیں...... اپنا ہوٹل ہے وہاں
...... کل ہی سنتوکھ سنگھ کو وہاں بھیجتا ہوں.........
بلاٹکٹ سفر کرنے میں وہ ماہر ہے......... سب ٹھیک
ہو جائے گا...."

یونیورسٹی کے طلبا تک بھی ٹیلی فون لگنے کی بات پہنچ چکی ہے۔
یہاں سے اپنے ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنا انھیں آسان معلوم
دے رہا ہے۔ رنبیر سنگھ چہرے پر ایک مخصوص مسکراہٹ لے کر
ٹیلی فون کرنے کی اجازت مانگتے ہیں۔

"سنتوش ہے.... ہیلو.... سنتوش سے بات
کروں گا...... رنبیر سنگھ..... سیکرٹری سٹوڈنٹ یونین..
..... کون سنتوش...؟ تم ہو نا؟ ..... کوڈ ورڈ....
رانگل..... ٹھیک..... سن لی نئی ڈی ویلپ منٹ....؟
کیا کہا؟ نہیں سنی؟ ...... پروفیسر بھلّہ نے دو لڑکوں
کا داخلہ روک لیا...... ہا۔ ہا۔ ہا..... تو آپ اپنے دام
میں صیاد آ گیا...... رات کو میٹنگ ہے..... سٹرائیک
کا ریزولیوشن پاس کرنا ہے...... پولیس کو اطلاع کر دی
ہے۔ کل نعرے تم لگاؤ گے..... ششی رستگی توڑے گا...
..... بھوک ہڑتال کا اعلان راجیش کرے گا.... دیال سنگھ
نعرے لگانے میں تمھاری مدد کرے گا..... 'ہاسٹل کی فیس
کم کرو'..... 'ہاؤس ایگزامینیشن بند کرو'.........
'تعطیلات کی تعداد بڑھاؤ'...... 'نتیجے کی کمیٹی میں لڑکوں
کے چنے ہوئے نمائندے رکھو'...... اور ہر نعرے کے
بعد 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ ضرور ہوگا......"

نئی پود کے کوئی بھی دوسروں سے کیوں پیچھے رہیں۔
وہ 'نئی پود' ششماہی کے ایڈیٹر شری گیانند سے آدھ گھنٹہ
تک بات کرتے ہیں۔ لب لباب کچھ یوں ہوتا ہے.......
'صاب! 'نئی پود' کے تازہ شمارے میں سنگر کی کہانی چھاپ
دی۔ ساتھ ہی جگدیش راہی کی نظم چھاپ دی۔ فیصلہ تو یہ
ہوا تھا کہ کسی پرانے لیکھک کی کوئی چیز نہیں چھپے گی۔ اگر
گٹ بندی کے ریزولیوشن پر سختی سے عمل نہیں ہوگا تو ہماری
تحریک ختم ہو جائے گی۔ دوسرے یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ہر شمارے
میں دو پرانے لیکھکوں کی دھجیاں اڑائی جائیں گی۔ تیسرے یہ کہ

نئے کویوں میں سے دو کے بارے میں تعریفی مضامین لکھے جائیں گے۔ میں نے اپنے اوپر خود ہی مضمون لکھ کر 'بیکل' کے نام سے بھجوایا تھا۔ وہ چھپا نہیں .... آخر یوں کام کیسے چلے گا ...... وغیرہ وغیرہ۔

دھن سنگھ چپڑاسی رن سنگھ چپڑاسی سے قسمت کا شکوہ کرتا ہے۔ "رام اوتار چپڑاسی دیوان کرشن کمار کے تلوؤں کی دو گھنٹے مالش کرتا تھا۔ جاتے وقت اسے کلرک بنا گئے۔ اس وقت وہ بھتے سمیت دو سو پچانوے روپے سوا نو آنے پا رہا ہے مجھے نئے صاحب کے تلوے 'جھتے' ہوئے دو سال ہو گئے اور دو روپیہ ترقی بھی نہیں ہوئی ...."

ٹیلی فون لگوانے کے بہت فائدے ہیں۔ گھر والوں کے اندر سماج سیوا اور محلہ سیوا کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ دن کے وقت سونے کی بری عادت سے محفوظ رہتے ہیں جتنی ان کے اندر خوب بھر جاتی ہے۔ گھنٹی بجتے ہی محلے والوں کو مطلع کرنے بھاگتے ہیں تو اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔ ورزش ہونے سے بھوک تیز ہو جاتی ہے۔ بھوک لگنے سے صحت اچھی ہو سکتی ہے، لیکن ظالم مہنگائی راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔

لیجئے پھر گھنٹی بجی۔

"آپ کو تکلیف ضرور ہوگی، لیکن کوڑامل جی سے کہہ دیجئے کہ فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان کی ساس کے بچنے کی اب کوئی امید نہیں۔ وید جی کی دوائی کے کارگر ہونے کی وجہ سے کل ان کی تشویش بڑھ گئی تھی۔ آج وید بدل دیا گیا ہے ...."

کھانے کی میز پر سب کھانے میں مشغول ہیں۔ کانوں کے پردے چیرتی ہوئی گھنٹی کی آواز ماحول کا سکون توڑ رہی ہے۔ کوئی سننے کو تیار نہیں۔ بحث اس بات پر ہے کہ یہ فون نہیں سائیکل کی گھنٹی ہے۔ پرمود کنہیا لال کپور کی شاعری کی مدح سرائی کرتا ہوا کہتا ہے

فون پھر آیا دلِ زار نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگی، کہیں اور چلی جائے گی

راجیو کہتا ہے ہو گی نہیں، ہو گا۔ جائے گی نہیں، جائے گا۔ اس پہ بحث چل نکلتی ہے۔ وجے کے قول کے مطابق پنجاب میں مذکر رہ کر، سائیکل یہاں کی سرحد پار کر کے مؤنث کیوں بن جاتا ہے۔ بحث کا گھنٹی کی آواز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مجھے اٹھنا ہوتا ہے۔

" ٹوٹو - ٹوتھی - ٹوفو ؟"

" ہاں - ہاں ، میں ٹوٹو - ٹوتھری، ٹو فور سے بول رہا ہوں۔"

" تاؤ جی! میں ہوں بانکے کی لڑکی مزاجو۔ دادی سے کہنا کہ وید جی نے جلیبی کھانے سے منع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں بلغم کرتی ہے ماں سے کہہ دینا۔ میں اپنی سہیلی میتو کے گھر کھیلنے جا رہی ہوں۔ شام کو لوٹوں گی۔"

"کل ہی لوٹنا۔" میں ریسیور رکھتے ہوئے کہتا ہوں۔

"یہ مؤا ٹیلی فون بھی ایک مصیبت ہے۔" کھانے کی میز پہ سے آواز آتی ہے۔

" مؤا ٹیلی فون یا بسیا کھی رام ؟"

ٹن - ن - ن - ن - ن

بسیا کھی رام اپنے گھر سے بول رہے تھے۔

" میں نے کہا تھا نا کہ ٹیلی فون کے بہت فائدے ہیں۔"

" لیکن بل ان سے بھی بڑا ہے ؟" میں نے کہا۔

" کتنا ؟"

" تین سو پینتالیس"۔

" کوئی مضائقہ نہیں۔"

" محلے والے ٹرنک کال کرتے رہے، اب کوئی حامی نہیں بھرتا۔"

" ارے بھائی! چھوڑو ان باتوں کو۔ دان کرو۔ دان کرنے سے دھن کبھی نہیں گھٹتا۔"

" دل ؟"

" دلِ نادان ....."

میں ریسیور رکھ دیتا ہوں۔ گھنٹی بجنے پر بھی اسے نہیں اٹھاتا۔ ضرور بسیا کھی رام ہوں گے۔ ڈر اس بات کا ہے۔ کوئی

اور مشورہ نہ دے دیں۔
ان کے ایک مشورہ سے ہی زندگی کی رونق دو بالا ہو گئی ہے۔ زندگی میں گھنٹی نے کتنی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ الارم کی گھنٹی بجتی ہے تو ٹیلی فون کی گھنٹی معلوم دیتی ہے۔ کال بیل بھی ویسے ہی لگتی ہے۔ دودھ والا یا اخبار والا گھنٹی بجاتا ہے تو ریسیور اٹھانا پڑتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ چاروں طرف گھنٹیاں ہی گھنٹیاں ہیں۔ اندر گھنٹیاں ہیں باہر گھنٹیاں ہیں۔ زندگی ایک گھنٹی ہے لمبی اور نہ ختم ہونے والی، یہ سدا ہی بجتی رہے گی جب تک.... ....جب تک ٹیلیفون ہے...... بیساکھی رام ہے.... اس کا مشورہ ہے.....

آج کل اردو کا جواہر لال نہرو نمبر

ماہ نومبر ۱۹۶۴ء کا شمارہ 'جواہر لال نہرو نمبر' ہوگا

صفحات ۷۲ - آرٹ پیپر پر تصاویر کے ۸ صفحے اس کے علاوہ - قیمت ایک روپیہ

جواہر لال نہرو سے متعلق مقتدر ہستیوں اور ادیبوں کے مضامین، موصوف کی زندگی کے اہم واقعات، اکابر عالم کا ان کی وفات پر خراج تحسین اور خود ان کے ارشادات واقوال اور ان کی تحریروں کے اقتباسات۔ شعراء کا خراج عقیدت اس شمارے میں شامل ہوں گے
ہمارے خاص نمبروں کی بعد میں بہت مانگ ہوتی ہے جسے ہم پورا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لہٰذا ایجنٹ حضرات اپنی زائد ضروریات سے بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی کو مطلع کریں

دیش چترکار

یہ رشتے یہ ناتے

پہلی تاریخ -!

آج مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ متوسط درجے کے لوگوں، سرکاری دفاتر کے ملازموں بلکہ ملک کی آبادی کے بیشتر حصہ کے لوگوں کے لیے ہر مہینے یہ دن ان کی زندگی میں کچھ دیر کے لیے تازگی بھر دیتا ہے۔ اگرچہ یہ خوشی یہ مسرت، اس کے لیے چند دنوں کی مہمان بن کر آتی ہے۔ کیونکہ گاڑھے پسینے کی کمائی گھر پہنچتے ہی گھریلو اخراجات میں اس طرح منقسم ہو جاتی ہے کہ اکثر کمانے والے کو آہٹ تک نہیں ہوتی کہ تنخواہ کب آئی اور کب ہوا ہو گئی۔

جیوتی بھی جب آج صبح نیند سے بیدار ہوئی تو معاً یہ خیال کہ آج پہلی تاریخ ہے، ہوا کے ایک خوش گوار جھونکے کی طرح اس کے جسم کو جھنجھوڑ سا گیا۔ وہ کوئی نوکری نہ کرتی تھی اور نہ ہی اس کا کوئی ایسا نزدیکی رشتہ دار تھا جس سے کچھ ماہانہ پانے کی امید ہو سکتی تھی۔ قدرت نے نہ جانے اس سے کب کا بدلہ لیا تھا کہ بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ غریب ماں باپ کی چہیتی لڑکی کا فقط ایک سہارا اس کا خاوند ہی تھا جس کی یاد اب اس کے لیے زمانۂ ماضی کا ایک کرب ناک خواب بن کر رہ گیا تھا۔

اپنے مرحوم خاوند کی یاد آتے ہی اکثر اس کی خزاں رسیدہ زندگی میں چند لمحات کے لیے موسم بہار کی سی تازگی آجاتی۔ کتنی اچھی صحت، اور فراخ دلانہ طبیعت پائی تھی دیپک نے! کندن سا رنگ ایسا کہ یورپین لوگوں کی رنگت بھی شرما جائے، اور جسم کے ہر عضو کی بناوٹ ایسی کہ جو بھی دیکھے رشک کرنے لگے۔ اور جس دن وہ اسے بیاہ کر لایا تھا تو دنیا دنگ رہ گئی تھی، جیوتی کی خوش قسمتی پر! ہر کسی کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ اگر قسمت ہو تو جیوتی جیسی، جسے دیپک جیسا خاوند نصیب ہوا ہے۔ معقول تنخواہ، بامذاق طبیعت اور برتاؤ میں ایسی جاذبیت کہ جس کسی سے سامنا ہو، وہ اسی کا ہو کر رہ جائے۔

لیکن جیوتی کی زندگی کا یہ سنہرا دور دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ ایک دن دیپک سکوٹر پر دفتر کے لیے ایسا نکلا کہ جب شام کو دفتر سے اس کے واپس آنے کا وقت ہوا، تو جس دیپک کو لوگ گھر پہنچانے آئے وہ دیپک پہلے جیسا دیپک نہ تھا۔ گھر لوٹتے ہوئے ایک شدید حادثے نے دیپک کے جیون دیپک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھا دیا تھا۔

اور اس جہانِ فانی سے دیپک کیا اُٹھ گیا، جیوتی کی زندگی اندھیر ہو گئی۔ اس گھور اندھیرے میں اگر جیوتی کے لیے روشنی کی کوئی کرن باقی تھی، تو وہ تھی دیپک کی فقط ایک نشانی — کم سن پپّو، جسے جیوتی آج بھی کسی غریب کی پونجی کی طرح سینے سے لگائے ہوئے تھی۔

جیوتی کی بدبختی کی انتہا یہی نہ تھی۔ سسرال والوں نے اس بیچاری پر منحوس ہونے کی تہمت لگا کر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ دیپک کے والدین کے ذہن میں یہ بات ایک زہر بن کر سما گئی تھی کہ وہ جیوتی کو کیا بیاہ کر لائے ہیں، کہیں سے کسی چڑیل کو پکڑ لائے ہیں۔ ڈائن آتے ہی ان کے ہونہار لڑکے کو نگل گئی!

دیپک کی موت کے بعد جب جیوتی دنیا میں بالکل اکیلی اور بے یار و مددگار رہ گئی تھی سے وہ اسی گلی میں کرایے کے پرانے مکان

میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہ رہی تھی، چپ چاپ، دنیا کے شور و ہنگامے سے الگ، اگر کوئی سہارا تھا تو وہ تھا فقط نیلی چھت والے کا اور اس کی بھیجی ہوئی غیبی امداد کا۔ نہ جانے کون سخی یا داتا ایسا تھا جو کہ بڑے کمرے کی گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی میز کی دراز میں ہر ماہ پہلی تاریخ کو ایک لفافے میں بند اڑھائی سو روپے کے کرنسی نوٹ نہایت ہی پُراسرار ڈھنگ سے رکھ جاتا تھا۔ یہ عمل بلا ناغہ پچھلے پانچ برس سے جاری تھا۔ اور یہی تھی اس کی ماہانہ آمدنی جس پر دونوں ماں بیٹے کی بسر اوقات کا انحصار تھا۔

نہ معلوم کتنی ہی بار جیوتی کے دل میں یہ تجسس پیدا ہوتا کہ جیسے بھی ہو، وہ اپنے اس محسن کا پتہ لگائے اور یہ بات وہ ناممکن بھی نہیں سمجھتی تھی، لیکن پھر جانے کیوں، وہ اس بات کو راز ہی رہنے دینے کے لیے اپنے دل کو رضامند کر لیتی اور من ہی من میں اپنے محسن کے قدموں پر عقیدت کے چند پھول چڑھا کر مطمئن ہو جاتی۔ اسے اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں اپنے محسن سے سامنا ہوتے پر وہ اپنی بے بسی کے خلاف بغاوت کر دینے پر آمادہ نہ ہو جائے اور محسن کے پاک جذبات کا شیشہ چکنا چور نہ ہو جائے۔ آخر کوئی بات ایسی ہے، کوئی ایسا راز ہے جس کے زیر اثر وہ فرشتہ سیرت انسان اپنے آپ کو چھپا کر بھی ان ماں بیٹے کی جیون ڈور کو سنبھالے ہوئے ہے۔

انھیں خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ آج پھر اس بڑے کمرے میں پہونچ گئی۔ مشین کے پُرزے کی طرح خود بخود اس کے ہاتھوں نے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس بڑی میز کے دراز کو کھولا۔ حسبِ معمول سامنے پڑے قدرے وزنی لفافے کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ آج پہلی تاریخ تھی اور اڑھائی سو روپے کی رقم اس لفافے میں آج بھی موجود تھی۔

جیوتی نے لفافے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ خود بخود اس کی آنکھیں بند ہو گئیں، اپنے محسن کے تئیں۔ چاہے وہ کوئی بھی تھا —— شکر گزاری کے بوجھ سے بوجھل اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے بہہ نکلے۔

جیوتی پر یہ کیفیت نہ جانے کتنی دیر تک طاری رہی کہ اچانک باہر کھڑکی کے پاس کھڑے ننھے پپّو کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"ممّی! — ممّی!!" بچّے کی آواز میں استعجاب آمیز سرگوشی تھی۔

"دیکھو تو رامو دادا کے مکان کے سامنے بہت سے لوگ کھڑے کچھ باتیں کر رہے ہیں۔"

اور جیسے ہی جیوتی نے کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے سے جھانک کر گلی کی نکڑ کی طرف دیکھا تو سچ مچ رامو دادا کے مکان کے سامنے بھیڑ لگی تھی۔ پھر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ سامنے گلی میں کھڑے دو چار پڑوسی کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ اور جیوتی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ان میں سے لگ بھگ سبھی کی نگاہیں اس کے مکان کی جانب اُٹھ کر رامو دادا کے مکان پر جا رکتی ہیں۔ اور جب اس نے اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو کی طرف دھیان دیا تو کچھ اس طرح کے الفاظ سنائی دئیے۔

"واقعی ہم اسے سچّی انسانی ہمدردی یا ایک انوکھے قسم کا اُنس کہہ سکتے ہیں۔"

"اجی صاحب! کون جانتا تھا کہ دین و دنیا سے بالکل الگ رہنے والے اس بزرگ کے دل میں ایک عظیم جذبۂ ایثار پرورش پا رہا ہے!"

عین اسی وقت جیوتی کو اس کا استعجاب اپنی محفوظ حدود کو پار کرتا ہوا محسوس ہوا جبکہ اس نے دیکھا کہ رامو دادا کے مکان کے سامنے کھڑے لوگوں کے ہجوم کا بیشتر حصہ خود اسی کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ ہجوم کی پیش قدمی ایک تھانیدار کر رہا ہے۔

کچھ ہی منٹوں کے بعد وہ ہجوم جیوتی کے مکان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی دروازے پر ایک ہلکی سی دستک ہوئی۔ جیوتی نے دروازہ کھولا تو سامنے تھانیدار کو دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے!

"معاف کیجئے گا محترمہ!" تھانیدار نے نہایت ہی مؤدبانہ انداز سے کہا۔ "ہم آپ کے لیے ایک نہایت ہی منحوس خبر لے کر آئے ہیں۔"

جیوتی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ دہشت کے مارے زبان گنگ ہو چکی تھی۔

"کیا آپ گلی کے نکڑ پر رہنے والے رامو دادا کو جانتی ہیں؟"

تھانیدار نے پوچھا۔

"گھبراؤ نہیں، جیوتی بہن!" تب اچانک ہی ایک پڑوسی نے آگے بڑھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں...."

اس پڑوسی کے الفاظ نے جیسے جیوتی کی ہمت بندھا دی۔ بولی۔ "جی جی.... نہیں تو...."

"عجیب بات ہے!" تھانیدار بولا۔

"ہاں، ہاں، تھانیدار صاحب!" ایک دوسرے پڑوسی نے کہا۔ "ہم نے مرحوم رامو دادا کو محلے میں کبھی کسی سے بات تک کرتے نہیں دیکھا۔"

اور اس کے ساتھ ہی سامنے کھڑے دوسرے سبھی پڑوسیوں نے گردن ہلا ہلا کر اس بات کی تائید کر دی۔

اور جیسے ہی جیوتی نے رامو دادا کے نام کے ساتھ لفظ 'مرحوم' کو سنا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ لیکن نہ جانے کیوں، شاید اس کی معصومیت نے اُسے اور زیادہ دلیر بنا دیا تھا، وہ دوسرے لمحہ ہی سنبھل گئی اور بیشتر اس کے کہ تھانیدار کچھ کہتا، وہ اپنے آپ پر پوری طرح قابو پا چکی تھی۔

"آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ رامو دادا آج صبح اپنے مکان میں مردہ پائے گیے۔" تھانیدار نے اپنی آمد کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ان کی جیب اور لکھنے کی میز سے ہم نے دو خط برآمد کیے ہیں۔ ایک خط سے ان کی موت قدرتی واقع ہوئی ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی موت کی آمد کی شاید پہلے سے ہی اطلاع ہو چکی تھی۔ اور اسی خط میں رامو دادا نے اپنی تمام جائیداد آپ کے نام کر دینے کی وصیت کی ہے اور آخر میں ایک دوسرے خط کو، جو آپ کے نام ہے اُسے آپ تک پہنچا دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ لیجیے۔"

جیوتی نے جھجکتے اور کانپتے ہاتھوں سے لفافہ لے لیا۔ پھر جی نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سبھی کی موجودگی میں لفافہ چاک کر دیا۔ پڑھا تو لکھا تھا ——

"پیاری بہن، جیوتی!

کتنی عجیب بات ہے کہ ایک عرصہ سے تمھارے ساتھ اپنے جس رشتے کا اظہار کرنے سے گریز کرتا رہا ہوں، ایسا کرنے کی آج میں اس وقت جسارت کر رہا ہوں جبکہ اس جہانِ فانی سے کوچ کرنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس وقت میرا یہ خط تمھارے ہاتھوں میں ہو گا، میری روح اس قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہو گی ۔۔!

بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے، اور وہ اس لیے کہ جب سے میں نے یہاں سکونت اختیار کی تھی، لوگوں سے الگ تھلگ ہی رہا۔ میرے جیسے بظاہر ہر لحاظ سے پُر قناعت زندگی بسر کرنے والے انسان کا دل ہمیشہ بدنصیبی کی آگ میں جلتا رہا۔ ایک اچھے گھرانے کے چشم و چراغ کو سب سے پہلے جس صدمے کا سامنا کرنا پڑا، وہ تھا زندگی میں جوانی کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی ماں باپ کا سایہ اُٹھ جانا! اب میری دنیا فقط اپنی چھوٹی بہن شاردا تک ہی محدود رہ گئی۔ شاردا، جو عمر میں مجھ سے کافی چھوٹی تھی اور جانے کیوں مجھے جان سے بھی عزیز تھی۔ انھیں دنوں میری زندگی کو ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ میں دل کے دورے کی نامراد مرض کے چنگل میں پھنس گیا۔ بہترا علاج کرنے کے باوجود بھی اس موذی مرض نے میرا دامن نہ چھوڑا۔ یہ صدمہ میرے لیے پہلے صدمہ سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ مجھے یہ خدشہ ستانے لگا کہ اس مرض کے ہاتھوں اگر میرا چراغ زندگی کہیں وقت سے پہلے بجھ گیا تو میرے بعد میری بہن شاردا کا کیا ہو گا؟ اس امکانی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے میں اپنی صحت کے بارے میں نہایت محتاط رہنے لگا۔ یہاں تک کہ میں نے اس وقت تک ازدواجی زندگی کو نہ اپنانے کی قسم کھالی جب تک کہ شاردا کے ہاتھ پیلے نہ کر لوں اور اُسے سکھی سکھی اپنا گھر بساتے نہ دیکھ لوں۔ لیکن قدرت کو شاید یہ سب کچھ منظور نہ تھا۔

ایک دن میری تمام تر کوششوں کے باوجود اس بدبخت بھائی کے ہاتھوں سے بے رحم موت اس کی جان سے بھی پیاری بہن کو چھین لے گئی۔ میری جذباتی زندگی پر یہ سب سے زیادہ کاری چوٹ تھی۔ میری تاریک زندگی میں فقط روشنی کی ایک کرن تھی جو بجھ گئی، ایک تمنا تھی جو مٹ گئی، ایک آرزو تھی جو ختم ہو گئی! انھیں صدموں سے بیزار

میں وہ شہر چھوڑکر یہاں چلا آیا - مایوس، غم زدہ اور خود زندگی سے بے زار!

پھر ایک دن اچانک نہ جانے کہاں سے ایک بار پھر میری تاریک زندگی میں امید کی کرن پھوٹ نکلی محلے میں دیپک تمھیں بیاہ کر کیا لایا مانو میری بہن شاردا کو دوبارہ زندگی مل گئی ہو - وہی ناک نقشہ، وہی رنگ روپ، وہی قد و قامت، وہی چال ڈھال اور وہی جسم کی بناوٹ - غرضیکہ تمھیں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے شاردا پھر سے زندہ ہو گئی ہو، جیسے مجھے پھر سے زندگی کا مقصد مل گیا ہو — تمھاری صورت میں مجھے شاردا کی صورت نظر آئی، تمھاری سیرت میں مجھے شاردا کی سیرت نظر آئی - یا یوں کہو کہ دنیا کے لیے جہاں تم جیوتی تھیں میرے لیے میری ننھّی بہن شاردا ہی تو تھیں - میری کھوئی ہوئی مسرت مجھے پھر سے مل گئی -

لیکن جیسا کہ میرے ساتھ ہوتا آیا ہے - میری یہ خوشی، یہ مسرت بھی دیرپا ثابت نہ ہوئی — دیپک کی اچانک موت نے میرے دل پر جو اثر کیا، وہ میں ہی جانتا ہوں - کیونکہ فطری طور پر اگر دنیا میں مجھے کسی سے اُنس رہا ہے تو وہ تھی میری چھوٹی بہن شاردا — اور شاردا کا عکس پھر تم! مجھے دنیا میں سب سے مقدّس چیز کی قسم، اگر اس دن موت کا فرشتہ دیپک کے بدلے مجھے اس دنیا سے لے جانے کو کہتا تو میں بخوشی اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتا - کیونکہ مجھے اپنی چھوٹی بہن کا دُکھ کسی بھی اور کسی حالت میں بھی قابلِ برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔

دیپک کی موت کے بعد میں نے تمھارے رشتہ داروں کے ناروا سلوک اور تمھاری - نہیں، نہیں، اپنی چھوٹی بہن کی اقتصادی حالت کا بڑے قریب سے جائزہ لیا اور تبھی سے تمھارے لیے اڑھائی سو روپے ماہانہ کی مدد دینا میرا ایک مقدّس فرض بن گیا - یہ فرض میں نے کس طرح پورا کیا یہ ایک راز ہے جو میرے سینے میں محفوظ ہے اور اسے اپنے سینے میں چھپا کر لے جاؤں گا - دنیا مجھے تمھارا محسن تصوّر کرے یہ مجھے کسی حالت میں بھی منظور نہیں تھا - میرے لیے یہ کیفیت بھی ناقابلِ برداشت ہوتی کہ تم خود مجھے اپنا محسن خیال کرو - اس کے علاوہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم دونوں بہن بھائی ایک چھت کے نیچے رہیں اور میری دل کی دیرینہ بیماری تمھارے لیے پریشانی کا باعث بنے -

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ میری خواہشات اور میرے تمام تر اصول اب زیادہ تر میرا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہے - اب عمر اور بیماری کا مجھ سے ہر دم یہی تقاضا رہتا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے زندگی کے سفر کو جلد از جلد ختم کر دوں - مجھے اپنا انت اب صاف اور قریب نظر آ رہا ہے — ! اسی لیے چاہتا ہوں کہ تم پر جن امور کا اظہار جیتے جی نہ کر سکا، انھیں موت کے بعد اس خط کے ذریعے سے واضح کر دوں - بیشتر اس کے کہ موت کے آہنی پنجے مجھے آکر دبوچ لیں، میں نے اپنی تمام تر جائداد اور جو کچھ بھی میری ملکیت میں شامل ہے، اسے میں نے ایک وصیت کے ذریعہ اپنی چھوٹی بہن شاردا — نہیں نہیں، جیوتی کو ایک حقیر تحفہ کے روپ میں ارپن کر دیا ہے - اس وقف سے متعلق تمام قانونی دستاویزات میرے وکیل کے پاس محفوظ ہیں - میری موت کی خبر پاتے ہی وہ تمام قانونی کاروائی مکمّل کر دے گا - اس کام کے لیے اسے خاطر خواہ رقم بطور فیس پیشگی ادا کی جا چکی ہے -

اب اجازت دو، بہن! موت کا فرشتہ مجھے اس آخری تحریر کو ختم کر دینے کے لیے مجبور کر رہا ہے - موت کی آخری گھڑی میں بھی میرے منہ سے بہن اور اس کے ننھّے بچّے کی درازئ عمر کے لیے دعائیں نکل رہی ہیں بھگوان کرے، تم دونوں خوش و خرم رہو!

تمھارا بدنصیب بھائی

ہری رام "

خط پڑھ لینے کے بعد جیسے ہی جیوتی نے اپنی آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں اوپر اٹھائیں تو دیکھا سامنے تھانیدار کے ہمراہ پڑوسیوں کا ہجوم بالکل ساکت کھڑا ہے -

عین اسی وقت ہجوم میں سے کسی کی دھیمی آواز سنائی دی —

" میری رائے میں مرحوم کے انتم سنسکار میں اب زیادہ تاخیر نہیں ہونی چاہیئے - "

" جی، میرا بھی یہی خیال ہے —" اس سے آگے جیوتی کچھ نہ بول سکی - اس کے الفاظ شدّتِ غم اور آنسوؤں کی طغیانی میں ڈوب کر رہ گئے -

---

ظفر احمد نظامی

مالوہ اور اُس کی تہذیبی روایات

مؤرخین کا بیان ہے کہ ہند بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں مالچند عرف مالو نامی ایک مشہور سردار تھا، اسی کی شجاعت و دلیری نے مالوہ کو جنم دیا۔ تاریخ فرشتہ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ مال چند موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اس نے اپنے دور میں مشہور موسیقاروں کو دکن سے بلوا کر مالوہ میں آباد کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مالوے کی سرزمین سے نغمہ و موسیقی کے چشمے ابلنے لگے اور اس نے تان سین اور روپ متی ایسے موسیقاروں کو اپنا لیا۔ گوالیار اور بیانہ کے قلعے مال چند ہی کی یادگار ہیں۔

مالوہ اکبر کے عہدِ حکومت میں بارہ سرکاروں کا صوبہ رہا ہے اور محمد شاہ بادشاہ کے دور تک دس سرکاروں سے متعلق رہا۔ مگر اس کے بعد مرہٹہ حکومتوں کے قیام کے بعد اس کا زوال شروع ہو گیا اور قدیم تہذیبوں کی قدریں محروم ہونے لگیں۔ مالوہ کی تفصیلی تاریخ کرم علی نے "تاریخِ مالوہ" کے نام سے تصنیف کی ہے جو اب تقریباً نایاب ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے اور وسیع مطالعہ، مشاہدے اور تجربہ و تحقیقات کے بعد تصنیف کی گئی ہے۔ مگر اس کے مطالعے کے بعد یہ جان لینا کچھ دشوار نہیں کہ مصنف نے انتہائی تنگ نظری سے کام لیا ہے اور نہ جانے کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں جنھوں نے مالوہ کی قدیم تہذیب کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اب ریسرچ جاری ہے اور یقین ہے کہ مالوہ سے متعلق تمام معلومات مستقبل قریب میں پایۂ تکمیل کو پہنچ کر ہمارے علم میں آجائیں گی۔ یوں مالوہ کے بارے میں غیر ملکی سیاحوں اور دیگر مشہور مؤرخین نے کچھ نہ کچھ لکھا ضرور ہے۔

اگر ابتدائی تاریخ کو نظر انداز کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ۴۰۰ء سے ۴۶۵ء تک گپت خاندان مالوہ پر حکمران رہا۔ نماڑ کے علاقے میں اکیس طلائی سکے دستیاب ہوئے ہیں جو سمدر گپت چندر گپت دوم اور کمار گپت اوّل کے عہدِ حکومت سے متعلق ہیں۔ یہ حکومت چندر گپت دوم سے شروع ہو کر اسکند گپت تک قائم رہی۔ بالاگھاٹ کے تاریخی کتبوں سے ظاہر ہے کہ ۴۵۰ء سے ۴۷۰ء تک مالوہ کے حکمران راجاؤں نے راجا نریندر سین کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ ۵۵۰ء میں دیو گپت یہاں کا راجا رہا۔ ایہول کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ چالوکیہ راجا نے مالوہ اور گجرات کے راجاؤں کو ۶۳۴ء میں شکست فاش دے کر اس پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ رادھانگر کے کتبے شاہد ہیں کہ نویں صدی میں راشٹر کٹ راجا گوبند سوئم نے مالوہ پر حملہ کر کے ۸۰۸ء میں اسے فتح کر لیا۔ مگر بعد ازاں سبھی شکست خوردہ علاقے آزاد ہو گئے۔ چالوکیہ راجاؤں کے زوال کے ساتھ ساتھ پرمار راجاؤں کو عروج حاصل ہوا جو بعد ازاں مسلم شہنشاہوں کے مطیع ہو گئے۔

۱۳۰۵ء میں علاؤالدین خلجی نے مالوہ فتح کر لیا۔ گجرات اور مالوہ کے سلاطین میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہی اور ۱۵۳۱ء میں بہادر شاہ سلطان گجرات نے مالوہ کے سلطان کو شکست دے دی۔ مگر

۱۵۳۵ء میں مغل شہنشاہ ہمایوں نے اسے فتح کر لیا اور پھر شیر شاہ سوری نے ۱۵۴۲ء میں بادشاہ ہمایوں کو شکست دے کر اس پر اپنا قبضہ کر لیا اور شجاعت خاں کو اس کی نگرانی کے لئے مقرر کر دیا۔ مگر اس کے بعد شجاعت خاں کا بیٹا ولی عہد باز بہادر اکبر اعظم کی فوجوں سے شکست کھا گیا۔ یہ فوجیں ادھم خاں کی سرکردگی میں مالوے پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ بعد میں ادھم خاں کی غلطیوں سے پیدا شدہ اثرات کو دور کرنے کے لئے خود شہنشاہ اکبر نے مالوے کا رُخ کیا۔ چنانچہ مہیشور کے قریب دستیاب ہونے والے کتبوں میں اکبر کے نظام سلطنت و عہدِ حکومت کی جا بجا تعریفیں کی گئی ہیں۔ دکن سے واپسی پر آگرہ جاتے ہوئے بھی اپریل ۱۶۰۱ء سے مئی ۱۶۰۱ء کے درمیان کسی وقت اکبر کا گزر مالوہ سے ہوا تھا۔ مہیشور کا قلعہ بھی اسی کی تعمیر ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے کھرگون کو بہت اپنایا اور سراہا اور اسے اپنے فوجی کوارٹر کے لئے منتخب کیا۔ ۱۷۱۵ء سے مرہٹوں کے حملوں کا سلسلہ جاری ہوا اور ۱۷۳۱ء میں پیشوا نے مالوہ کے خطے کو سندھیا، ہولکر اور پوار میں تقسیم کر دیا۔ اور ۱۷۳۲ء میں مالوہ کے اٹھائیس پرگنے ملہار راؤ ہولکر کو دے دئے گئے تاکہ وہ اپنی افواج کو برقرار رکھ سکے۔

اہلیا بائی نے اندور کو اپنا دارالحکومت بنایا اور اسے فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ اکثر دریائے نربدا کے مقدس ساحل پر مقیم رہیں، انھوں نے دکن سے عالموں اور دانشوروں کو بلوا کر اپنے دربار کی زینت بنایا تاکہ وہ شمع علم و ادب کی روشنی سے تاریکیوں کا اختتام کر دیں۔ تجارت کے فروغ کی خاطر بہت سی سہولتیں مہیا کی گئیں۔ آج تک اندور اور اس کے قرب و جوار میں اس پاکیزہ دیوی کی یاد میں 'اہلیا تسو' منایا جاتا ہے۔

مالوے کی سرزمین نے اتنے راجا، مہاراجہ اور شہنشاہ دیکھے کہ اس کی تہذیبی روایات کروٹیں بدلتی رہیں۔ راجا آئے اور چلے گئے۔ شہنشاہوں نے حکمرانی کی اور خود محکوم ہو گئے اور اپنے پیچھے اپنی یادگاریں چھوڑتے گئے جو زمانے میں اگلی نسلوں کے لئے افسانہ بن کر رہ گئیں۔ مالوے کی حسین اور زرخیز سرزمین کو مادرِ ہندوستان کے دل کا اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں یہ ریزیڈنسی رہی ہے جس کا تعلق براہ راست پولٹیکل ایجنٹ سے تھا۔ جنگِ آزادی میں مالوہ کا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔ حالانکہ ریاستوں میں سے اکثر نے سرکارِ انگلشیہ کی موافقت بھی کی مگر بالآخر آزادی حاصل ہوتے ہی ریاستیں بھی عظیم ہندوستان میں جذب ہو گئیں اور اب انھیں سمندر کا ایک قطرہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

مالوہ میں اجین، گوالیار، دھار، مانڈو، فتح آباد، بھوپال، باگھ، مہیشور، سانچی اور سارنگ پور جیسے مشہور مقامات تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ اجین وکرمادتیہ کا پایۂ تخت رہا ہے۔ جہاں کالی داس نے سنسکرت ڈرامے کو نئی زندگی بخشی۔ وکرمادتیہ نے اجین کی اس قدیم نگری کو اپنے نورتنوں سے سجا کر دلہن بنا رکھا تھا۔ سنسکرت کو یہیں فروغ حاصل ہوا۔ سپرا سی مقدس ندی کے ساحل پر ہر بارھویں سال سنگت کا میلہ لگتا ہے جہاں ہندوستان کے گوشے گوشے سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ آکر اپنی نجات و مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔ راجا بھرتری کی قدیم یادگاریں اور انتہائی قدیم مندر پھر ایک بار یادِ ماضی کے ان چراغوں کو جلا دیتے ہیں جو صدیوں تک دنیا کو اپنے اجالوں سے محمور کرتے رہے۔ یہاں کا جنتر منتر راجا مان سنگھ کی مشہور یادگار ہے اور کالیدیہ محل بھی عظیم ہندوستان کی عظمتوں کا شاہد ہے۔

قلعہ گوالیار کے کھنڈر بتا رہے ہیں کہ عمارت بلند تھی۔ تان سین کی موسیقی کو یہیں فروغ حاصل ہوا۔ مانڈو کے نام سے باز بہادر اور روپ متی کے عشق کی حسین و لطیف داستان منسوب ہے جو مدتوں شادی آباد کے نام سے موسوم رہا۔ بزمانہ سابق تخت گاہ سلاطین نامدار رہا۔ یہاں حکماء و فضلا و علماء کا دور دورہ رہا جو اپنے اپنے فن میں ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یہ قلعہ سمت ۷۴۳ میں تعمیر ہوا تھا جو انیس میل

کے گھیرے میں آباد تھا۔ اس کے بارہ دروازوں میں سے دلی دروازہ شہنشاہ اورنگ زیب نے از سرِ نو تعمیر کرایا تھا جس کی شہادت دروازے پر تحریر شدہ ان اشعار سے ملتی ہے ؎

درزمانِ شاہِ عالم گیر خاقانِ جہاں
از سرِ نو گشت برپا ایں درگردوں نشاں
درہزار افتاد و نہ آغاز و ہم انجام یافت
اہتمامِ خانِ عالی شاہ محمد بیگ خاں
در جلوسِ ایں شہنشاہِ جہاں اورنگ زیب
بود سال یازدہ از روئے تحریر و بیاں

اس قلعے نے نہ جانے کتنے سلاطین کی حکومتیں دیکھیں اور خود کو عروج کی اخیر منزلوں تک پہنچایا۔ تان سین اور دیگر کئی عالموں نے یہاں اپنے علمی و فنی کمالات کے مظاہرے کئے۔ سارنگ پور مالوہ کا ایک اہم شہر ہے۔ اکبر کے سپہ سالار ادھم خاں نے باز بہادر کو شکست دے کر یہاں کے خزائن وغیرہ پر تصرف کر لیا تھا اور ان عورتوں پر بھی متصرف ہوا تھا جو گانے بجانے میں ممتاز تھیں۔ ۹۶۸ھ میں اکبر نے آگرے سے مالوے کی سمت حرکت کی اور سارنگ پور پہنچ کر وہ ادھم خاں کے مکان ہی میں مقیم ہوا تھا۔

رتلام اور اندور کے درمیان فتح آباد واقع ہے۔ یہیں کے وسیع میدان میں مغلیہ تخت و تاج کے لئے آخری اور فیصلہ کن جنگ اورنگ زیب اور اس کے بھائی ولی عہد دارا کے درمیان ہوئی تھی جس میں ہندوستان کی تقدیر اور مستقبل کا فیصلہ شہنشاہ عالم گیر کے حق میں ہوا۔ سیانچی کے استوپ بدھ مذہب کی حسین یادگار ہیں جہاں اشوک اعظم کے عہد کے کتبے موجود ہیں۔ مہیشور کا شمار بنارس، پٹنہ اور ایودھیا کے مقدس تذکروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں کی تہذیب موہن جوداڑو اور ہڑپا کی تہذیبوں سے بھی قدیم تر بتائی جاتی ہے۔ مہیشور دریائے نربدا کے کنارے آباد ہے اور قدیم عمارات و محلات کو خود میں سموئے ہوئے ہے۔ اہلیا بائی نے اپنی پاک زندگی کا بیشتر حصہ اسی کی پُرسکوت فضاؤں میں گزارا تھا۔

بھوپال اور جاورہ مشہور مسلم ریاستوں میں تھیں جہاں مسلم تہذیب اور کلچر کے رنگین و دل چسپ نقوش آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں ریاستوں میں سرکاری زبان اردو رہی ہے۔ پہلے فارسی کا دور دورہ تھا۔ یہاں کی تہذیب اب تک قدیم ترین یادگاروں اور روایات سے منسلک ہے۔ یہاں کی تہذیب اور طرزِ معاشرت زندگی کا آئینہ ہیں۔ شرافت، اخلاق، ملنساری، جذبات خلوص ہمدردی وراثت میں ملے ہیں۔ گفتگو، لہجہ اور تکلم کی حلاوت خصوصیات میں شامل ہیں۔ ترنم اور طرزِ بیان بے مثال ہیں۔ شعر و شاعری نثر و نظم یہاں کی جان ہیں۔ اسی سرزمین نے مشہور عالموں کو جنم دیا ہے۔ بھوپال کا نام تاریخ و دنیائے ادب میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ علمی جلسے، بحث و مباحث، مشاعرے اور مسالمے اپنا جواب آپ ہیں۔ زندگی کی قدروں کو پہچاننا اور ان پر ناقدانہ نگاہیں دوڑانا یہاں کے عالموں میں عام ہے۔ رجائیت کو اپنا کر قنوطیت کو خیرباد کہنا یہاں کا شیوہ رہا ہے اور شاید یہی باعث ہے کہ اسے آزادیٔ وطن کے بعد عظیم مدھیہ پردیش کی دلہن راجدھانی بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

غرض یہ کہ مالوہ کو بادشاہوں، راجاؤں اور نوابوں کے زمانے میں بہت عروج حاصل ہوا۔ مدتوں تک یہ علوم و فنون کا مرکز رہا۔ مگر اس کے زوال کے ساتھ ساتھ اس کی تمام خصوصیات معدوم ہو کر رہ گئیں۔ اس کے مشہور دریاؤں میں نربدا، سپرا اور چمبل خاص ہیں جو ہندو مذہب کے اعتبار سے انتہائی مقدس و متبرک ہیں اور جن کے طفیل اب بھی کئی شہروں میں اُجالا ہے۔ یہاں کے ہندوؤں پر برہمنوں اور چھتریوں کا کافی اثر رہا۔ تعلیم کا معیار ابتداء میں کم تھا مگر اب کافی اونچا ہو چلا ہے۔ سماج میں خواتین کی عظمت ہمیشہ برقرار رہی ہے۔ ان کا احترام فرض منصبی و مذہبی تصور کیا جاتا رہا ہے۔ مگر تعلیم نسواں کی جانب توجہ بہت کم رہی۔ مگر اب تعلیم نسواں بہت اثر انداز ہے۔ کالج اور اسکول کھول دئے گئے ہیں جہاں ہر قسم کی تعلیم کا بہت معقول انتظام ہے۔ دورِ ماضی میں بہو و داہ اور بال و داہ کی رسمیں عام رہیں۔ ستی کی رسم بھی رائج تھی۔ پردہ اور گھونگھٹ کا رواج تو اب تک کافی

ہے۔ مالوے کے لوگوں کا خلوص بہت مشہور رہا ہے۔ ہر شخص ملنسار مخلص اور با اخلاق ہے۔

بول چال کے لئے مالوی ہندی عام رہی ہے مغلیہ عہد میں اردو کو بھی فروغ حاصل ہوا اور اب اندور، گوالیار، دھار، دیواس وغیرہ مقامات پر مراٹھی زبان کو بہت ترقی ہوئی ہے۔ یہاں کے لوگ بہت محنتی ہیں۔ اکثر علاقوں میں بھیل اور پست اقوام کے لوگ آباد ہیں جن کا خاص پیشہ زراعت اور شکار ہے۔ مالوے کی اکثر آبادی گاؤں میں آباد ہے جس کا انحصار زراعت پر ہے۔ ماضی میں یہاں چھوت چھات اور مذہبی تعصب و امتیاز کافی رہا، مگر اتحاد کی جڑیں پھر بھی نہ ہل سکیں۔ مالوہ کے رہنے والے سیدھے سادے رہے۔ سلاطین اور راجاؤں کی اطاعت و فرماں برداری اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ قدیم رسوم کو ماننا اور ان پر عمل پیرا ہونا بھی اپنے لئے ازبس ضروری سمجھتے تھے۔ جہیز اور اسی قسم کی کھوکھلی رسمیں مالوے میں عام طور سے رائج ہیں۔ جین اور وشنو مذہب کے پیروکار اکثریت میں رہے ہے عیسائی مشنریوں نے بھی یہاں کی پست اقوام کی خستہ حالی اور سادگی سے فائدہ اٹھایا اور آریہ سماج نے بھی کافی ترقی کی۔

مالوے کی آب و ہوا معتدل ہے، چاہے دن کتنے ہی گرم ہوں مگر راتیں انتہائی خوش گوار اور سہانی ہوتی ہیں مغل شہنشاہ نے یہاں کی رنگین راتوں کے حسین مزاج سے متاثر ہو کر 'شب مالوہ' کا سلسلہ 'صبح بنارس' اور 'شام اودھ' سے ملایا ہے۔ مشہور چینی سیاح ہیوان سانگ نے جاج ہوتی سے

ہیشور پور تک سفر کیا تھا جو مالوہ کے علاقوں میں ہیں۔ اس نے اجین اور دیگر مقامات کے لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے گجرات کو مالوہ کے مقابلے میں ایک 'پست خطہ' بتایا ہے مشہور فلسفی شنکر آچاریہ شمال سے جنوب کی جانب جاتے ہوئے مالوہ سے گزرے تھے اور اسی علاقے میں انھوں نے مشاہیر علماء سے بحث کر کے انھیں نیچا دکھایا تھا۔ مشہور مؤرخ البرونی گیارھویں صدی عیسوی میں دھار، مہیشور، کھنڈوہ اور غاور کے مقامات سے نربدا کے حسین ساحل کے قریب سے گزرا تھا مگر اس نے اس زمانے کی سیاسی ہلچل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ ابن بطوطہ کے سفرنامے اور تزک بابری کے علاوہ ہر مشہور عالم مورخ سے مالوہ کے حسین خطہ کے بارے میں ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہیں جو ان دنوں کے تفصیلی حالات پر روشنی ڈالتی ہیں۔

غرض یہ کہ مالوہ کے حسین روپ نے سبھی شہنشاہوں اور راجاؤں کو متاثر کیا اور اکثر نے اسے مسخر کرنے کی کوششیں کیں۔ شاعروں اور ادیبوں نے اس کی تہذیبی روایات سے اکتساب کرتے ہوئے اپنی بہترین تخلیقات ادب کی نذر کیں اور اسے مادر ہندوستان کا دل تسلیم کیا۔ اب بھی یہاں کی جوان راتیں اہل سخن کے لئے وجہ تخلیق ثابت ہوتی ہیں جن کی رومان پرور چاشنی کسی کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ مالوہ کے سینے میں اب بھی کتنے ہی ان گنت روایات کے دفینے مدفون ہیں جو وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ منظر عام تک آتے جائیں گے اور دنیائے ادب و تاریخ کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

مضمون نگار حضرات سے!

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوشخط لکھئے۔
۲۔ اپنا ایڈریس نہایت صاف اور خوشخط لکھئے
۳۔ غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ ڈاک کے ٹکٹ اور مناسب سائز کا لفافہ ہوگا۔

ع - م

نئی کتابیں اور رسالے

میری حدیثِ عمرِ گریزاں

پنڈت آنند نرائن مُلّا کا یہ تیسرا مجموعۂ کلام نہایت آب و تاب سے چھپا ہے۔ قیمت دس روپے پچاس پیسے علاوہ محصول ڈاک۔ یہ کتاب مصنّف سے ۲ چائنا بازار گیٹ لکھنؤ کے پتے سے مل سکتی ہے۔ کتاب بڑی تقطیع کے ۶۰۳ صفحوں پر مشتمل ہے۔ کاغذ، کتابت، جلد، جلد پوش نہایت عمدہ۔ اس کتاب میں مُلّا کے پہلے دو مجموعوں 'جوئے شیر' اور 'کچھ ذرّے کچھ تارے' کا انتخاب درج ہے۔ اور آخر میں تازہ کلام۔ مُلّا انسانیت دوست شاعر ہیں اور ان کی یہ انسانیت دوستی اُن کی شاعری میں آوازِ حق بن کر گونجتی ہے۔ انھوں نے نئی اور پرانی قدروں کو اپنی شاعری میں سمویا ہے اور اسے اپنے نیک کردار اور حسنِ عمل کا آئینہ بنایا ہے۔ وہ ۱۹۶۱ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کی ججی سے ریٹائر ہوئے۔ 'ایوانِ عدالت سے رخصت ہوتے' غالباً اسی وقت کی یادگار ہے

یہ ہمتِ مردانہ پھر آئے کہ نہ آئے
مجھ سا کوئی پروانہ پھر آئے کہ نہ آئے

طاقت کی رعونت کے مقابل بہ لبِ عدل
یوں حرفِ حریفانہ پھر آئے کہ نہ آئے

ساقی سے سوا تشنہ لبوں سے تھا جسے انس
محفل میں وہ پیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے

مُلّا کی شاعری بقول آلِ احمد سرور کسی ازم کی قائل نہیں البتہ وہ ہیومن ازم کے پرستار ہیں اور جمہوریت پر ان کا ایمان ہے۔

احتشام حسین نے لکھا ہے "مُلّا کے صاف اور شفاف اور ذکی الحس ذہن اور انسانی دکھ درد کے تصوّر سے خون ہو جانے والے دل، دونوں نے مل کر ایک مخصوص شاعرانہ انداز سے زندگی کو فن کی گرفت میں لیا ہے۔"

یہ مجموعۂ سخن اردو کی ان نادر کتابوں میں سے ہے جو عہدِ نو کی تخلیقات میں اوّلیت کا درجہ رکھتی ہیں۔

سفینۂ خوش گو

دفترِ ثالث بندرابن داس خوش گو کا یہ تذکرہ شعرائے فارسی سید شاہ محمد عطا الرحمٰن عطا کاکوی نے ایڈٹ کیا ہے اور یہ ادارہ تحقیقاتِ عربی و فارسی پٹنہ سے شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۴۰۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد ۵ روپے۔ غیر مجلد ۴ روپے ۷۵ پیسے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ خوش گو کا یہ تذکرہ تحقیق کرنے والوں کے لئے بہت مفید ہے۔ بہت اچھا ہوا کہ یہ شائع ہو گیا۔

ترکی / عراق

یہ دو کتابیں ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع ہوئی ہیں۔ پہلی کتاب کے مصنّف اکمل ایوبی اور دوسری کے محمود الحق ہیں۔ پہلی کتاب کی ضخامت ۴۴۳ صفحے اور دوسری کی ۲۵۶ صفحے۔ کتابیں ٹائپ میں نہایت صاف چھپی ہیں۔

دونوں ملکوں کی تاریخی، جغرافیائی اور سیاسی صورت حال کے باب میں پوری واقفیت ان کتابوں سے ملتی ہے۔ قیمت درج نہیں۔

مطلع وطن (حصہ اول)

سید علی مہدی رضوی ایڈوکیٹ بلرام پور نے ہندوستان کی تاریخ کو نظم میں لکھا ہے۔ یہ کتاب اس کا پہلا حصہ ہے اور مسلمانوں کے دورِ حکومت سے پہلے کی تاریخ کو منظوم کیا گیا ہے۔ رضوی صاحب کے کلام میں زور اور روانی ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب جلد مکمل ہوگی اور منظوم تاریخوں میں ایک اچھا مقام حاصل کرے گی۔

آپ سے ملئے

مصنف علی جواد زیدی۔ ناشر مکتبہ شاہراہ دہلی۔ ضخامت ۱۷۶ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ قیمت تین روپے۔ کتابت طباعت اوسط۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پوش کی حامل۔ اس کتاب میں زیدی صاحب کے لکھے ہوئے ۳۱ تصوراتی مضمون یا ادبی خاکے شامل ہیں۔ یہ خاکے بڑے دل چسپ ہیں اور زیدی صاحب کے بھر پور مشاہدے پر دال۔ جوش ملیح آبادی، اقبال سہیل اور جگر مراد آبادی کے خاکے بہت دل چسپ ہیں۔ زیدی نے اپنے ہر موضوع سے انصاف کیا ہے۔ وہ اپنے ہر موضوع سے اچھی طرح شناسا ہیں اور ان کے عادات واقوال، ان کے کردار اور ان کے فن سے واقف ہیں۔

جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری

مرتبہ حمیدہ سلطان۔ ناشر مکتبہ شاہراہ دہلی۔ قیمت دو روپے۔ ضخامت ۲۷۲ صفحے۔ کتابت، طباعت اوسط۔ آزاد کی شاعری پر اب تک جن لوگوں نے مضامین لکھے۔ وہ سب اس کتاب میں جمع ہوگئے ہیں۔

الف

رئیس امروہوی کے کلام کا مجموعہ۔ کتابت طباعت جلد عمدہ۔ قیمت پانچ روپے۔ ناشر ادارۂ ذہنِ جدید مانک جی اسٹریٹ گارڈن ایسٹ کراچی۔

رئیس امروہوی ہر رنگ میں کہنے والے ایک پُر زور شاعر ہیں۔ وہ غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی۔ طنز ومزاح پر بھی انھیں قدرت ہے۔

جگر کی غزلیہ شاعری

مصنف اشفاق علی خاں۔ ناشر مجلس ادب و ثقافت علی گڑھ۔ ملنے کا پتہ۔ اشفاق منزل ہانیہ خیل شاہجہان پور۔ یہ کتاب جگر کی شاعری پر ایک تنقید ہے جس میں زیادہ تر ان کے کلام کے نقائص بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب دل چسپ ہے اور پڑھنے کے قابل۔ ضخامت ۱۳۴ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ کاغذ کتابت، طباعت، جلد گوارا۔ کتاب جلد پوش کی حامل ہے۔

زمزمہ

جناب صفدر آہ کی رباعیوں کا مجموعہ۔ قیمت دو روپے۔ ناشر پنچ بھون پبلیکیشنز۔ جہانگیر آباد۔ بھوپال۔ ملنے کا پتہ۔ کتابستان محمد علی روڈ بمبئی ۳۔

جناب صفدر آہ بڑے مشاق سخن سنج ہیں۔ ان کی رباعیوں میں ان کے فن کی پختگی اور فکر کی بلندی دونوں شامل ہیں۔ مزاج فلسفیانہ ہے۔ اس لئے ان کی ہر رباعی فلسفۂ حیات کی کسی نہ کسی گرہ کو کھولتی ہے۔

رقصِ طاؤس

سید صفدر حسین کراچی کی نظموں کا مجموعہ۔ قیمت ۴ روپے۔ ناشرین مکتبۂ دانش لاہور۔ ملنے کا پتہ:۔ شردھانند اسکوائر۔ ارجن روڈ کرشن نگر لاہور۔ تقطیع ۲۲×۳۶/۱۶ صفحات ۱۰۴۔ کاغذ، کتابت، طباعت نہایت عمدہ۔ جلد سادہ۔ جلد پوش خوب صورت۔

اس کتاب کی نظمیں نظم پابند اور نظم آزاد کے درمیان کا خلا پُر کرتی ہیں۔ شاعر نفسیاتی تجزیے کا ماہر ہوتا ہے اور آپ کسی نظم کو کہیں سے بھی پڑھیں تو بیان اور تاثر کا تسلسل ٹوٹتا دکھائی نہیں دیتا۔ کسی نظم میں بھی غنایت کو قائم رکھنے

کے لئے بحر نہیں بدلتی اور قافیہ اور ردیف کی فرسودہ پابندی نہیں ہے۔ نیاز فتح پوری کے قول کے مطابق ڈاکٹر سید صفدر حسین شاعری کی دنیا میں ایک نئی دریافت ہیں۔ اس مجموعے میں ۱۴ نہایت پیاری اور دل آویز نظمیں شامل ہیں۔

بنت عم کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے

سب سے پہلے تری معصوم نگاہوں کا پیام
جن اداؤں نے سنا ان کے تقدس کی قسم
میں نہ وارفتہ الفت تھا نہ سرگشتہ شوق
ہمہ تن پاک دل و پاک نگہہ پاک جہاد
کتنی پاکیزگیاں کتنے شرافت کے خیال
مری معصومی فطرت کی قسم کھاتے تھے
جب گریبان ہلالی سے دمکتا تھا وہ حسن
افق روح پہ اک برق سی لہراتی تھی
ایک بے نام ضیا دل کی فضاؤں میں کہیں
اپنے احساس پہ محبوب سی رہ جاتی تھی

نسیم مغرب

پروفیسر امیر چند بہار گورنمنٹ کالج لدھیانہ نے ۹۰ منتخب انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ ناشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ہر نظم سے متعلق شروع میں اس نظم کا تعارف بھی نثر میں دیا ہے۔ ترجمہ بڑا کامیاب ہے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے اس کتاب کو سراہا ہے۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے ضخامت ۱۱۲ صفحے تقطیع ۲۲×۳۶/۱۶ کاغذ، کتابت جلد اور جلد پوش اوسط سے اچھے۔

ملاقاتیں

الطاف حسن قریشی نے اس کتاب میں پاکستان کی ۹ شخصیتوں سے ملاقاتوں کی تفصیل درج کی ہے۔ ناشر اردو ڈائجسٹ پبلیکیشنز لاہور۔ قیمت پانچ روپے۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ کتاب اچھی ہے۔ جن شخصیتوں سے ملاقاتوں کا ذکر اس کتاب میں درج ہے، ان میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی تمیزالدین خاں، مولانا صلاح الدین احمد، پروفیسر حمید احمد خاں اور دیگر اصحاب ہیں۔ طرز تحریر میں احتیاط اور سنجیدگی ہے۔

سرشار ۔ ایک مطالعہ

مرتبہ:- پریم پال اشک۔ ناشر آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی۔ قیمت پانچ روپے۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد اوسط۔ جلد پوش صاف ستھرا۔ رتن ناتھ سرشار جتنے بڑے مصنف ہوئے ہیں اتنا ہی کم کام ان پہ ہوا۔ اشک صاحب نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے مندرجہ ذیل ابواب ہیں پس منظر، شخصیت، فسانۂ آزاد، تخلیقات، سرشار کا ادب، سرشار کا فن، سرشار کا اردو ادب میں مرتبہ، آخر میں ضمیمہ ہے جس میں مثنوی تحفۂ سرشار، قصیدۂ طوفان سرشار درج ہیں۔

ساز معنی

بسمل کپور تھلوی کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی۔ کتاب مصنف سے ۱۶/۲ بت شکتی نگر دہلی کے پتے سے مل سکتی ہے۔ قیمت تین روپے ضخامت ۱۸۴ صفحے۔ کتابت، طباعت، جلد اوسط۔ جلد پوش خوبصورت

اس مجموعۂ سخن میں بسمل صاحب کی غزلیں نظمیں قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے کلام میں روانی ہے اور بیان میں پختگی۔ غزلوں میں اچھے اچھے شعر نکالے ہیں۔

مستقل غم کا مجھ کو غم ہی نہیں — خلش عارضی سے ڈرتا ہوں
برق کوندی تھی آشیاں پہ کبھی — آج تک روشنی سے ڈرتا ہوں

موصولات

سوارگ کی کھوج - ایک ناٹک۔ مصنف وینو بھائی پنت قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:- ڈوگری سنستھا پکا ڈنگا جموں

آسان اردو لکھاوٹ مصنف۔ ڈاکٹر جافر حسن۔

ناشر - کتابی ایجنسی، بنجارا ہل - حیدرآباد - قیمت بیس روپے

حوالا مکھی - چینی جارحانہ حملہ کے خلاف نظموں کا انتخاب۔ مرتبہ محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ، حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد۔

رسالے

دلی کالج میگزین، اردو - میر نمبر ۴۰۴ صفحوں پر مشتمل دلی کالج میگزین کا یہ ضخیم نمبر میر کے سلسلے میں بڑی معلومات کا حامل ہے۔ اسے نثار احمد فاروقی نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ یہ نمبر چار ابواب میں بٹا ہوا ہے۔ باب اول حیاتِ میر، دوم میر کا فن سوم تصانیفِ میر، چہارم خراجِ عقیدت - ناشر شعبۂ اردو، دلی کالج ایوننگ کلاسز، دلی

نگار (پاکستان) سال نامہ ۱۹۶۴ء یہ سال نامہ تذکروں کا تذکرہ نمبر ہے۔ قیمت چار روپے۔ تحقیق کا کام کرنے والوں کے لئے بہت مفید ہے۔

تلاش - خاص نمبر - قیمت چار روپے - ایڈیٹر وشوا ناتھ درد - ملنے کا پتہ: تلاش پوسٹ بکس نمبر ۲۵۶۸ نئی دہلی ۵ - یہ شمارہ ۲۰۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں اردو کے ممتاز شعراء و ادباء کی تخلیقات شامل ہیں۔

نخلستان اودے پور - ساہتیہ اکیڈمی راجستھان اودے پور کا یہ سہ ماہی رسالہ ابھی ابھی شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ پروفیسر پریم شنکر سری واستوا اس کے مدیر ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں راجستھان کے بہت سے ادیب اور شاعر شامل ہیں۔ راجستھان سے باہر کے ادیبوں کی تخلیقات بھی ہیں۔ لیکن مقامِ مسرت ہے کہ راجستھان میں اردو ادباء اور شعراء کی کمی نہیں۔ اس شمارے کی قیمت دو روپے ہے۔

نواب علی گوہر

غزل

چہرہ اترا ہوا شرمندہ نظر ہے کہ نہیں
ان پہ یہ میری تباہی کا اثر ہے کہ نہیں

اوس کی بوند نقابِ گلِ تر ہے کہ نہیں
تیرے عارض پہ مرا عکسِ نظر ہے کہ نہیں

سرد خاکسترِ پروانہ ہے، پھر کیا اس سے
چھیڑ کر دیکھ ذرا رقصِ شرر ہے کہ نہیں

ہوس سجدہ سے پہلے یہ سمجھ لینا تھا
درِ محبوب کے شایاں ترا سر ہے کہ نہیں

زندگی کو مری آسودہ بتاتے والے
دیکھ اس نرم توجہ میں بھنور ہے کہ نہیں

پھیرے ہستی و عدم کے یونہیں آخر کب تک
تو مسافر سہی، ترا کہیں گھر ہے کہ نہیں

ہو گیا تجھ میں شعورِ حق و باطل پیدا
میری صاحب نظری کا یہ اثر ہے کہ نہیں

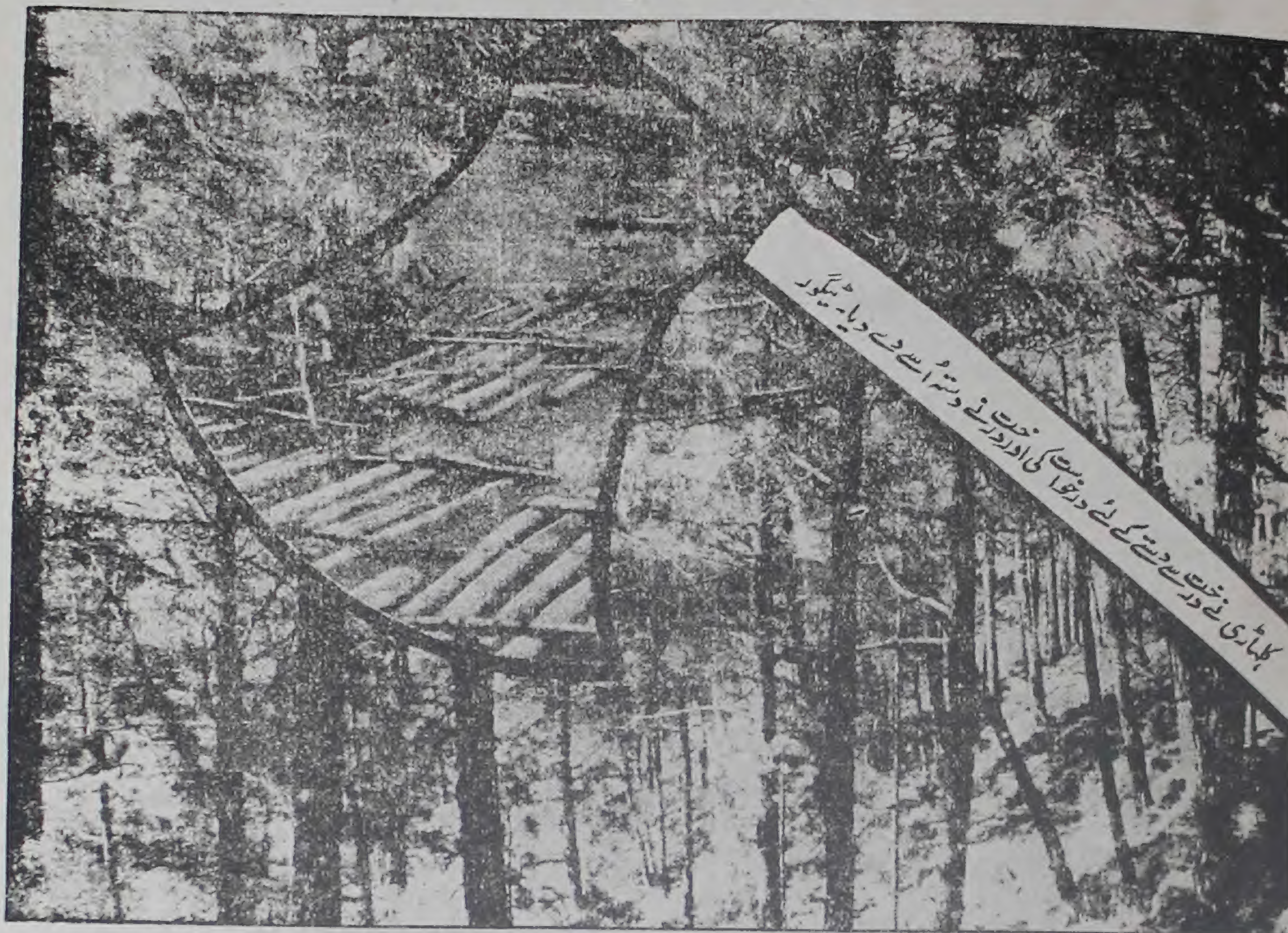
قافلہ سست خرام اور وہی جادہ پامال
رسمِ پارینہ یہ اندازِ سفر ہے کہ نہیں

چھپ گیا چاند تو مایوس ہے کیوں اے ہمدم
دیکھ، وہ نور فشاں نجمِ سحر ہے کہ نہیں

بے خبر آنکھ کو شائستۂ دیدار بنا
وہ پسِ پردہ بھی محسوس نظر ہے کہ نہیں

سوئے مشرق ابھی چھایا ہے دھندلکا گوہر
یہ شبِ تار گزشتہ کا اثر ہے کہ نہیں

کاش درخت بول سکتے ......



اے ۔ بے لحاظ کلہاڑے ۔ کیا تجھے معلوم ہے ؟

زیادہ درخت اُگاؤ

کہ ہمیں گرا کر تم اپنے مالک کی جو خدمت کرتے ہو ہیں اور میرے بھائی اس کی اس سے زیادہ خدمت کرتے ہیں۔
ہم پانی کو بچاتے ہیں ۔ اس کے بہاؤ کو منضبط کرتے ہیں ، طوفانوں کو روکتے ہیں اور بہتر فیصلوں کے لئے زمین کو کٹاؤ سے بچاتے ہیں۔
ہم آندھیوں کی رفتار کو کم کرتے ہیں اور موسم گرما اور سرما کی شدت میں کمی لاتے ہیں ۔
کوئی بھی انسانی کام خواہ وہ آباد کاری ہے ، رسل و رسائل یا آبپاشی درختوں کے بنا تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا ۔

اس لئے ، ہمیں گرانا بند کر دو !

اس وقت تک ملک کا محض ۱۲ فی صدی رقبہ جنگلات پر مشتمل ہے جبکہ قومی جنگلاتی پالیسی کے مطابق نشانہ ۳۳ فی صدی کا ہے۔

جاری کردہ : ۔ محکمہ تعلقات عامہ پنجاب

P.R.D/100

اردو زبان کا ممتاز علمی و ادبی رسالہ

ماہ نامہ

آندھرا پردیش

جو محکمۂ اطلاعات و تعلّقات عامہ، حکومت آندھرا پردیش حیدر آباد
سے ہر ماہ نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتا ہے

ملک کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات، علمی، ادبی اور معلوماتی مضامین، بلند پایہ غزلیں اور نظمیں، دل چسپ افسانے اور ڈرامے، حکومت کے ترقیاتی پروگرام، عوام کی سرگرمیاں، مستند اعداد و شمار، عکسی تصویریں غرض آزادی کے بعد ملک کی نئی زندگی کی ساری جھلکیاں آپ کو اس رسالے میں ملیں گی۔

اس رسالے کے خاص نمبر اور سال نامے بھی غیر معمولی ضخامت اور متعدد صوری و معنوی خوبیوں کے ساتھ شائع ہوتے ہیں جو مستقل خریداروں کو سالانہ چندے ہی میں دئے جاتے ہیں۔

یہ باتصویر رسالہ شروع سے آخر تک آرٹ پیپر پر چھپتا ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب۔ معمولی ضخامت (۵۰ تا ۷۰ صفحے)۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود محض عوام کی سہولت کی خاطر سالانہ چندہ تین (۳) روپے اور قیمت فی پرچہ پچیس (۲۵) پیسے رکھی گئی ہے۔

چندے کی روانگی اور مراسلت کا پتہ

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلّقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

کمرم جاہی روڈ۔ حیدر آباد (۱)، آندھرا پردیش

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل دہلی

ترتیب

مجلسِ ادارت

محمد مجیب — جامعہ ملیہ دہلی
گوپی ناتھ امن — دہلی
خواجہ احمد فاروقی — دہلی
عبدالقادر سروری — سرینگر
یو-ایس موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
شنکر دیال ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی نجنا ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)
بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکرٹری)
مدیر مسؤل

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- شہباز حسین

سرِ ورق :- مہاتما گاندھی

رسالے کی پشت پر :- مہاتما گاندھی ۱۹۳۱ء میں چارلی چپلن سے ایک ہندوستانی دوست کے گھر پر لندن میں ملنے گئے تو وہاں کے باشندوں نے انھیں گھیر لیا۔

جلد ۲۴ — نمبر ۳

اسوج شک سمت ۱۸۸۶

اکتوبر ۱۹۶۴ء

سالانہ چندہ :-
ہندوستان میں :- ساتھ رُپے
پاکستان میں :- سات رُپے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ :-
ہندوستان میں :- ۶۰ پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱-دہلی

مُلاحظات

ڈاکٹر وسویسوریا ہندوستان کے بہت مشہور انجنیر ہوئے ہیں۔ ان کی خدمات کے صلے میں انھیں ۱۹۵۵ء میں بھارت رتن کا اعزاز دیا گیا تھا۔ وہ ایک نہایت ہی قابل، دیانت دار اور باعمل انسان تھے۔ انھوں نے اپنی حیرت انگیز کامیابی کو ان چار باتوں کی مرہونِ منّت گردانا تھا۔

۱- سخت محنت: ہندوستان کے عوام عام طور پر سہل پسند ہیں۔ اور زیادہ محنت کے عادی نہیں۔ اسی وجہ سے ملک کی معاشی طاقت کمزور ہے۔

۲- نظم و ضبط کے تحت کام: اگر کام نظم و ضبط کے تحت کیا جائے اور اس کے لئے ہر روز ایک خاص وقت مقرر کیا جائے تو کوششوں میں بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ اس سے کام کرنے والے کی صحت اچھی رہتی ہے اور عمر بڑھتی ہے۔

۳- اچھی قابلیت: اچھی قابلیت کے یہ معنی ہیں کہ خوب محنت کی جائے۔ کام درست طور پر نظم و ضبط کے تحت عین وقت پر کیا جائے۔

۴- خوش اخلاقی اور خدمت: اپنے ساتھیوں سے ہم آہنگ ہو کر کام کرنا مغربی ممالک میں تعریف کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ یہ احساس ہندوستان میں ابھی کم پایا جاتا ہے۔ ہر شہری کو اپنے ساتھ کام کرنے والوں اور پڑوسیوں سے خوش اخلاقی برتنی چاہیئے۔

مرحوم پنڈت جواہرلال نہرو نے سرکاری ملازمین سے اپیل کرتے ہوئے کہا تھا: "اچھے منصوبے بنانا کوئی آسان کام نہیں لیکن ان کی تکمیل اور بھی مشکل ہے۔ ان کی تکمیل کے لئے ہم سب کی مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے، خاص طور پر سرکاری مشینری کی کوششوں کی۔ اس لئے میں ہندوستان بھر کے تمام سرکاری ملازموں سے اپیل کرتا ہوں کیونکہ انھیں پر حکومت کا بوجھ ہے اور انھیں پر ہر چیز کی کامیابی کا مدار ہے۔ میں ان سے سرکاری ملازمت میں پوری دیانت داری کی اپیل کرتا ہوں۔ اس کو محض ایک خیالی نصب العین ہی نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اس پر عمل ہونا ضروری ہے۔ اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔

سرکاری ملازموں میں بدعنوانی اور رشوت کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر حکومت نے انسدادِ رشوت ستانی کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس نے اپنی سفارشات میں بہت سی تجاویز پیش کیں۔ ان تجاویز پر بڑی سختی سے عمل کیا جا رہا ہے اور ان ملازموں کو جو بدعنوانیوں اور رشوت ستانی کے مجرم ثابت ہوئے ہیں پوری سزا دی جا رہی ہے۔ صوبوں میں سداچار سمیتیاں قائم ہو چکی ہیں یا قائم ہو رہی ہیں۔ مرکز میں بھی ایک سداچار سمتی کام کر رہی ہے۔ یہ سمیتیاں غیر سیاسی اور غیر سرکاری ہیں۔ ان کا مقصد ملک میں اچھے قسم کی سیاسی اور اخلاقی فضا قائم کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ عوام کو اس بات پر آمادہ کریں گی کہ رشوت اور بدعنوانی کا قلع قمع ہو۔ ہمیں امید ہے کہ اس ملک کے سرکاری ملازم بالخصوص اور عوام بالعموم ایسی سازگار فضا اس ملک میں قائم کریں گے جس سے اخلاق اور دیانت کا بول بالا ہو۔

ہندوستانی موسیقی کے بہت بڑے ماہر استاد مشتاق حسین خاں ۱۳- اگست کو دہلی میں انتقال فرما گئے اور اپنے وطن سہسوان میں دفن ہوئے۔ مرحوم نے بڑے باکمال استادوں سے فن کی تکمیل کی تھی۔ آپ کو ۱۹۵۲ء میں صدرِ جمہوریہ کا ایوارڈ ملا اور ۱۹۵۷ء میں پدم بھوشن بنائے گئے۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔ شمعِ موسیقی کا نور تو پھیلتا ہی رہے گا۔ ع گر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

جوشؔ ملسیانی

غزل

یوں ملاقات ہو تو لطفِ ملاقات ہے کیا
آپ تو بات بھی کرتے نہیں یہ بات ہے کیا

وہ یہ کہتے ہیں ذرا صبر سے روداد کہو
کہتے کہتے یہ ہر اک بات پہ ہیہات ہے کیا

دل کے داغوں کی چمک بھی ہے شبِ غم میں فزوں
جس میں تارے نظر آتے نہیں وہ رات ہے کیا

کچھ تو ہے بات کہ چھوڑی ہے خموشی تم نے
ورنہ یہ سلسلۂ حرف و حکایات ہے کیا

اتنی سستی تو نہیں بخششِ حق اے ناداں
آخری وقت یہ توبہ یہ مناجات ہے کیا

اپنے دل اپنے کلیجے میں جگہ دوں ان کو
اس سے بڑھ کر ترے تیروں کی مدارات ہے کیا

آج کیوں چشمِ عنایت ہوئی مجھ پر مبذول
پردۂ لطف و کرم میں بھی کوئی گھات ہے کیا

حسن والوں کا تغافل تو ہے مانی ہوئی بات
آپ کا حسن بھی پابندِ روایات ہے کیا

تو عبادت میں بھی رہتا ہے سوالی اے شیخ
خود ہی انصاف سے کہہ دے تری اوقات ہے کیا

ایک سے ایک کی صورت ہی نہیں جب ملتی
اہلِ دانش کو پھر امیدِ مساوات ہے کیا

زہد و تقوے کے مضامیں نہ سناؤ اے جوشؔ
صحبتِ پیرِ مغاں میں یہ خرافات ہے کیا

سمیع حسن نقوی

قدیم ہندوستان میں مذہب اور فلسفہ

قدیم ہندوستان اپنے مذہبی جوش و خروش اور فلسفیانہ سرگرمیوں کے لئے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ فلسفہ کے میدان میں ہندوستان نے سیکڑوں تجربے کئے، اور ان تجربوں کے نتیجہ میں بہت کچھ حاصل کیا۔ لیکن سب سے زیادہ وقیع و اہم بات یہ تھی کہ اہل ہند نے ہمیشہ اپنی توجہ زندگی کی قدروں کو متعین و مرتب کرنے پر صرف کی، جس کے باعث ان کی کوشش میں مقصدیت اور زندگی میں معنویت پیدا ہو گئی۔

قدیم ہندوستان میں فلسفہ، مذہب ہی کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتا تھا۔ فلسفہ کو مذہب سے علیحدہ کبھی نہیں کیا گیا۔ ہندوستانی فلسفہ کے ہر مکتبۂ فکر نے ایک "موکش شاستر" یا علم نجات مرتب کرنے کی کوشش کی۔ فلسفہ کا تعلق تربیتِ ذہن ہی سے نہیں تھا بلکہ عمل سے بھی تھا۔ فلسفہ نام تھا ایک طریقۂ زندگی کا، ایک خاص طرزِ فکر و عمل کا جس کا بس ایک ہی مقصد تھا —— یعنی حصولِ نجات۔ اگر فلسفہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ محض خیالات و نظریات پیش کرے، اور اس کا تعلق عمل سے بالکل نہ رہے، تو واقعی ہندوستان میں سرے سے کوئی فلسفہ نہیں پایا جاتا تھا، لیکن اس حیثیت سے ہندوستان بہرحال گھاٹے میں نہیں رہا۔

ہندوستان کے مذہب اور فلسفہ کی بنیادیں وادیٔ سندھ ہی کے دور میں رکھی جا چکی تھیں، لیکن وادیٔ سندھ میں بسنے والوں کا حال ہمیں زیادہ نہیں معلوم۔ البتہ ویدوں کے زمانے کے مذہبی رجحانات کا ہم ایک بڑی حد تک اندازہ کر سکتے ہیں۔ رگ وید کی مناجاتی نظموں سے آریائی مذہب کی تین واضح خصوصیات جھلکتی ہیں۔ اولاً یہ کہ ویدوں کے ابتدائی دور میں لوگ ایسے دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے جو مظاہرِ قدرت، مثلاً بادل کی گرج، بجلی کی چمک اور بارش کی نمایندگی کرتے تھے۔ یہ دیوتا ان کے نزدیک لافانی تھے اور جمال، حکمت، شفقت اور عدل وغیرہ صفات سے متصف تھے اور کائنات کے اخلاقی قانون کے نگہبان تھے۔ ان دیوتاؤں میں ورن، اندر اور اگنی سب سے اہم[1] تھے اور رگ وید کے دوسرے دیوتاؤں —— مترا، پُسن، مارُتس، رُدر اور آسوِنس کے مقابلے میں انھیں سب سے زیادہ محترم مانا جاتا تھا۔

ان میں بھی وُرن کا شمار آسمانی دیوتاؤں میں تھا، جسے فضا اور کائنات کا شہنشاہ، سب سے زیادہ طاقت ور، اور اخلاق کا ضامن مانا جاتا تھا۔ وُرن کے بارے میں جو عقیدہ رگ وید میں پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "وہ ہر جگہ موجود ہے، ہر بات کا جاننے والا ہے، زندگی اور موت کا مالک ہے۔ دوسرے تمام دیوتا اس کا حکم مانتے ہیں۔" اور یہی وہ دیوتا ہے جسے آگے

---

[1] ورن، اندر، اگنی، نظام کائنات کی مختلف قوتوں کے نام ہیں جو بالآخر ایک ہی قوت ہے۔ (ادارہ)

چل کر حکمائے ہند نے خدائے واحد مان لیا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ یہ تمام دیوتا قربانیوں سے خوش ہوتے تھے۔ قربانیاں تین قسم کی ہوتی تھیں: دودھ اور اناج کی، سوم[1] کی، اور جانوروں کی۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا رسموں میں باقاعدگی آتی گئی، اور رفتہ رفتہ قربانیوں کے چار واضح پہلو قرار پا گئے۔ وہ رسمیں جو خالص عبادت اور دعا کی خاطر ادا کی جاتی تھیں یا شکر گزاری، کفارے اور سحر کے طور پر بجا لائی جاتی تھیں۔

رگ ویدک مذہب کی تیسری خصوصیت تھی "رت" کا قانون۔ عام طور پر 'رت' کے معنی ہیں نظام، وہ نظام جس کے ذریعہ سے رات کے بعد دن آتا ہے، مقررہ گردش کے ساتھ موسم آتے ہیں اور دریا اپنے رُخ پر بہتے ہیں۔ نظامِ کائنات 'رت' ہی کا دوسرا نام ہے۔ تمام دنیا میں 'رت' ہی کا فرمان چلتا ہے یہاں تک کہ دیوتاؤں پر بھی۔ ہمارے قدیم مفکرین نے نیچر میں یکسانی اور یک رنگی تلاش کرلی، اور اپنے اس عظیم عقیدہ کے ذریعہ نیچر کے کثرتِ وجود کو ایسی وحدت میں تبدیل کر دیا جس سے نظامِ کائنات میں ایک مشیت جھلکتی ہوئی دکھائی دینے لگی جو واحد ہے۔

رگ وید کہتا ہے۔ "اس وقت نہ شے تھی نہ لاشے، نہ ہوا تھی نہ آسمان، ان سب کو اپنے دامن میں کون چھپائے تھا؟ کہاں آرام کر رہے تھے یہ سب؟ اس وقت نہ موت تھی نہ حیات، نہ کثرات لیل و نہار، بس ایک وجودِ مطلق تھا، قائم بالذات، اس کے ماسوا کچھ نہ تھا۔" آگے چل کر سوال ہے۔ "یہ دنیا کیسے وجود میں آئی اور آیا دستِ قدرت نے اُسے ترتیب دیا یا نہیں؟ آسمان میں جو مالک ہے بس وہی بتا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ بتا سکے۔" یہ کوئی معمولی سوال نہ تھا۔ لیکن اس سوال نے تلاشِ حق کے دروازے کھول دئے، اور صدیوں کے غور و فکر کے بعد آخر کار اُس کا حل دریافت کر لیا گیا جس کی تفصیل ذیل میں بیان کی جائے گی۔

ویدک دور کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جس میں براہمن لکھے گئے۔ ویدوں اور براہمنوں کے زمانے میں صدیوں کا فاصلہ ہے۔ براہمن دراصل ویدوں کی شرحیں ہیں۔ وید چار ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا علیحدہ براہمن ہے۔ مثلاً ایتریہ، رگ وید کا براہمن ہے، اسی طرح پنچ وِمسا اتھر وید کا، چھندوگیہ سام وید کا اور ست پاٹھ یجروید کا۔ ویدوں کی زبان بہت صاف، سادہ اور سلجھی ہوئی ہے۔ اس کے خلاف براہمنوں کی زبان اور مواد دونوں بہت بھاری بھرکم ہیں اور ان کو پڑھنا اور سمجھنا آسان نہیں ہے۔ براہمنوں میں دیوتاؤں کو پس پشت ڈال کر رسموں پر زور دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ رسموں سے متعلق مٹی کے گھڑے سے لے کر چمچے اور لکڑی کے ٹکڑوں کی تفصیلات، کون سی چیز کس مقام پر رکھی جائے، اور یہ کہ ان میں کسی قسم کی کمی نہ رہنے پائے۔ ان تمام جزئیات کا بیان بڑی تفصیل کے ساتھ براہمنوں میں موجود ہے۔

تیسرا دور وہ ہے جس میں اُپنشد لکھے گئے۔ اُپنشد کے لغوی معنی ہیں وہ تعلیم جو استاد کے قریب بیٹھ کر حاصل کی جائے، یا وہ تعلیم جو شاگرد اپنے استاد سے بصیغۂ راز حاصل کرے۔ مذہبی ادب کی ان تین شاخوں میں زمانے کے اعتبار سے کافی تفاوت ہے، اور یہ بات ان کے مخصوص اسلوب سے بدرجۂ اتم واضح ہوتی ہے۔ ویدک ادب کی ان تین شاخوں کے زمانے کا تعین اگرچہ ٹھیک ٹھیک نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ بات مسلّمہ ہے کہ اُپنشد سب سے بعد کی چیز ہیں اور ان کے زمانے کا تعین بس اتنا ممکن ہے کہ وہ ۶۰۰ ق۔م یعنی بدھ مذہب سے پہلے کے ہیں۔ فکر کی گہرائی اور منطقی نتائج کے اعتبار سے وہ اتنے بلند ہیں کہ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ "براہمنوں اور اپنشدوں کے طرزِ بیان میں جو فکری تفاوت پایا جاتا ہے وہ ہندوستانی فلسفہ کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے[1]"

---

[1] ایک قسم کا پہاڑی پودا، جس کا رس نشیلا ہوتا ہے اور جسے قربانی کی رسموں میں استعمال کیا جاتا تھا۔

[1] بی۔جی گوکھلے: "قدیم ہندوستان، تاریخ اور سماج"

اپنشدوں میں نہ ورُن، اندر اور اگنی وغیرہ دیوتاؤں کا ذکر ہے اور نہ قربانیوں کا، بلکہ برہما کا ذکر ہے جو دنیا میں چھوٹی سے چھوٹی چیز سے زیادہ چھوٹا اور کائنات کی بڑی سے بڑی چیز سے زیادہ بڑا ہے اور پھر بھی دل کے اندر چھپا رہتا ہے۔ برہما کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔ "ہر شے برہما ہے۔ آتما بھی برہما ہے۔ لیکن آتما کیا ہے؟ آتما وہ ہے جس کے ذریعہ سے انسان شکلوں کو دیکھتا ہے آوازوں کو سنتا ہے، خوشبوئیں سونگھتا ہے، بولتا چالتا ہے اور میٹھے پھیکے کی پہچان کرتا ہے۔" [1]

اپنشدوں میں جگہ جگہ برہما اور آتما کی بحث ملتی ہے جنھیں ہر مقام پر ایک مانا گیا ہے۔ "آتما ہی ذات ہے۔ برہما بھی ذات ہے اور ذات وہی ہے جو ذات ہے۔ آتما وہ حقیقت ہے جو تغیرات میں بھی قائم رہتی ہے، جو خواب و بیداری، رویا، موت، بار بار جنم لینے اور آخر میں، نجات کی مختلف حالتوں میں قدر مشترک ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے کوئی فنا نہیں کر سکتا۔ موت اُسے چھو نہیں سکتی، اور شر اُسے تحلیل نہیں کر سکتا۔ دوام، تسلسل، وحدت، حرکت پیہم، یہ اس کی خصوصیات ہیں۔ یہ بجائے خود ایک دنیا ہے جو مکمل ہے۔ کوئی شے اس سے باہر نہیں ہے۔ بس آتما اصل اصول ہے، انسان کا "انا"۔ [2]

برہما تمام کائنات کا جوہر ہے، فضائے بسیط کی اصل ہے، وہ طاقت ہے جو موجودات عالم میں مادی شکل میں ظہور پذیر ہے؛ جو پیدا کرتی ہے، زندہ رکھتی ہے، صحیح سالم رہتی ہے، جو تمام عالموں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے، ایک لامحدود، لافانی الٰہی طاقت۔ یہی زندگی کا مبداء ہے اور یہی مرجع، یہ وہ ہے جس سے تمام چیزیں پیدا ہوتی ہیں، پیدا ہونے کے بعد اسی کی بدولت زندہ رہتی ہیں، اور مرنے کے بعد اسی کی طرف رجعت کر جاتی ہیں۔ وہ برہما ہے، یعنی "ست" (حق)، "ست" (روح)، اور "آنند" (روحانی مسرت) اس لئے آتما اور برہما، داخلی اور خارجی، روحانی اور کائناتی اصول کے دو مختلف نام ہیں جو ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ "تت توم اسی" یعنی "یہ کہ تو ہے" یہ ترجیحی کلمات اپنشدوں میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔" [1]

دراصل یہ ایک بڑا انقلابی عقیدہ تھا اور ہندوستانی فلسفہ کی ارتقائی منزلوں میں اہم ترین موڑ۔ آندھی کا ایک جھونکا آیا اور رگ وید کے تمام دیوتاؤں کو پیچھے چھوڑ گیا۔ قربانیاں اور رسمیں فرسودہ قرار دے دی گئیں اور ایک نئے عقیدے نے جنم لیا جس نے آگے چل کر ہندوستانی فلسفہ اور قدیم ہندوستان کی مذہبی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ وہ تھا کرم اور آواگون کا عقیدہ۔ اپنشدوں میں انسان اپنی مسرت اور رنج و غم کا خود ہی معمار بن جاتا ہے، چاہے مسرت حاصل کرے چاہے رنج و غم۔ یہ اس کے اپنے کرم (عمل) پر منحصر ہے۔

"جس طرح تتلی ایک پتی سے دوسری پتی پر جا بیٹھتی ہے، جس طرح سُنار ہمیشہ نئے نئے زیور تراشتا رہتا ہے، اسی طرح انسان کا کرم اس کی روح کو ایک قالب سے دوسرے قالب میں ڈھکیل دیتا ہے۔ آخر میں علم و عرفان اور غور و فکر کے ذریعہ وہ معرفت کی اُس منزل میں پہنچ جاتا ہے جس میں وجود کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں، دوئی مٹ جاتی ہے اور وہ برہما میں ضم ہو کر بقائے دوام حاصل کر لیتا ہے۔ اسی کا نام جیون مکتی ہے، یعنی سنسار سے مکمل آزادی، اور یہی "ست"، ""، "ست" اور "آنند" کی آخری منزل ہے۔" [2]

اُپنشدوں کی تعلیمات کا خلاصہ چار تصورات پر مشتمل ہے۔ آتما، برہما، کرم اور آواگون۔ آتما اور برہما کا تعلق جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، روحانیت سے ہے۔ کرم کا تعلق عمل سے ہے، اور آواگون زندگی اور موت کا وہ قدرتی عمل ہے جس کے ذریعہ سے "سنسار" کی بقا ثابت ہوتی ہے۔ یہ نظریات ویدوں اور برہمنوں

---

[1] بی۔ جی۔ گوکھلے: "قدیم ہندوستان، تاریخ اور سماج"
[2] ایضاً

[1] بی۔ جی۔ گوکھلے: "قدیم ہندوستان، تاریخ اور سماج"۔
[2] ایضاً

کے نظریات سے اتنے مختلف اور ترقی یافتہ ہیں کہ انھیں انقلاب آفرین نظریات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

آتما اور برہما کے ایک ہونے کی دریافت نے فلسفیانہ خیالات کے تانے بانے کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ فلسفہ کی بنیاد اب یہ قرار پائی کہ دیوتاؤں کی خلاف ورزی یا قربانی کی رسموں میں کوتاہی کرنا کوئی پاپ نہیں ہے بلکہ مظاہر قدرت کی کثرت کو تسلیم کرنا اور برہما کی وحدت الوجود سے انکار کرنا پاپ ہے۔ اخلاقی شعار حقیقی شعار قرار پایا جس میں نفس سے مراد نفسِ امارہ نہیں جو تمام برائیوں۔ تنگ نظری، خود غرضی، دناءت اور دوسری کمزوریوں کا مجموعہ ہے، بلکہ انسان کی فطرتِ باطنی مراد ہے جو انانیت کے قید و بند سے آزاد ہے۔

اُپنشدوں کے عہد کے ظہور کے بعد وہ دن بیت گئے جب خیالی دیوتا پہاڑوں میں چھپے رہتے، بجلی کے ساتھ چمکتے، اور بادلوں کے ساتھ گرجتے اور برستے تھے۔ اب انسان نے خدا کو پالیا جو اس کے اندر تھا۔ اب اُسے راضی رکھنے کے لئے قربان گاہ تک جانے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ کوئی شخص اپنے نفس کو جو وہ خود ہے راضی رکھنے کی کوشش نہیں کرسکتا۔ انسان خدا کا ادراک کرسکتا ہے اور اس کی معرفت حاصل کرسکتا ہے۔ اس طرح قربانی کی رسموں کی جگہ علم و عرفان اور باطنی فہم و ادراک نے لے لی۔

چھٹی صدی قبل مسیح کو جس میں چند بہت اہم اپنشد تصنیف ہوئے، ذہنی جوش و خروش اور فلسفیانہ سرگرمیوں کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن تمام ماحول پر اس وقت تشکک کی گرد چھائی ہوئی تھی اور لوگوں کے ذہن و دماغ میں انقلابی خیالات نے ہل چل مچا رکھی تھی۔ اُپنشد اس روحانی ہیجان و بغاوت کے صرف ایک پہلو کی ترجمانی کرتے ہیں جس کے ذریعے سے کثرت پرستی کا عقیدہ وحدت پرستی کی منزلیں طے کرتا ہوا وحدت الوجود اور "ہمہ اوست" کی منزل تک پہنچ گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد برہمنی قربانیوں کے خلاف دو[2] اور تحریکیں شروع ہوئیں جن کے رہنما مہاویر "جن" (غالب)، اور گوتم "بدھ" (عارف) تھے۔ یہ دونوں چھتری تھے اور اپنے عقائد کو مرتب کرنے سے پہلے ایک عرصہ تک دونوں غور و فکر، ریاضت اور تپسیا کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہے۔ دونوں نے اپنی تحریک کی ابتداء سنیاسی تنظیم کے طور پر کی اور دونوں بہت جلد دو عظیم مذہبوں کے بانی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے ظاہر ہوئے۔ یہ دونوں عظیم ہستیاں خلوص و انسانیت کا پیکر تھیں۔ ان کا شمار اُن عظیم ہستیوں میں کیا جاتا ہے جن پر قدیم ہندوستان بجا طور پر ناز کرسکتا ہے۔ ذیل میں ان کی تعلیمات اور سرگرمیوں کا مختصراً جائزہ لیا جائے گا۔

جین مت کے بانی مہاویر تھے جو ویشالی کے ایک امیر سدارتھ کے لڑکے تھے۔ اٹھائیس سال کی عمر میں انھوں نے تلاشِ حق کی مہم شروع کی اور بارہ سال تک سخت تپ کیا۔ اس کے بعد وہ "کیولی" (کامل) کہلانے لگے۔ اپنی عمر کے آخری تیس سال انھوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ اور اپنے پیرو سادھوؤں اور راہبوں کی تنظیم کے کام میں صرف کئے[1]۔ انھوں نے اُپری گرہ یعنی ترکِ دنیا، اہنسا، تمام جانداروں پر رحم، اور اخلاقی دیانت داری کا سبق دیا۔ انھوں نے کرم اور آواگون کے رائج الوقت عقائد کو اپنا لیا، لیکن روح کے بارے میں ان کا عقیدہ مختلف تھا۔ اُپنشد کہتے ہیں کہ وجود واحد ہے، دائم و قائم، نہ اس کی ابتداء ہے نہ انتہا نہ تغیر۔ اس کے برخلاف جینیوں کا عقیدہ ہے کہ وجود میں تغیر، تسلسل، تخریب سب پہلو شامل ہیں۔ اس نظریہ کو وہ "اُنے کانت واد" کہتے ہیں یعنی یہ کہ روح لامحدود ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام موجوداتِ عالم میں استقلال و استحکام صرف ان کی اصلیت کی حد تک پایا جاتا ہے، لیکن جہاں تک صفات کا تعلق ہے وہ پیدا بھی ہوتی ہیں

---

[1] ان کا دیہانت ۵۲۸ ق م میں ہوا۔ ان کی عمر ۷۲ سال مانی گئی ہے اس حساب سے پیدائش ۶۰۰ ق م قرار پاتی ہے۔ مجمدار نے پیدائش ۵۴۰ ق م اور موت ۴۶۸ ق م قرار دی ہے۔

ہیں اور فنا بھی۔ مادہ اپنی جگہ مادے کی حیثیت سے باقی رہتا ہے، البتہ اس کی صورت اور سیرت میں تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔

روح اور مادے میں فرق ہے۔ روحیں لاتعداد ہیں اور قدوقامت میں اپنے قالب کے مطابق ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ذکاوت ایسی خصوصیت ہے جو لازوال ہے۔ دنیاوی روحیں جاندار پیکر ہیں اور بار بار جنم لیتی ہیں۔ جسم سے رہائی کے بعد وہ درجۂ کمال حاصل کر لیتی ہیں۔ جَین مذہب میں کرم کی کئی قسمیں ہیں۔ کرم سے چھٹکارا پانا، نیا کرم حاصل نہ کرنا اور آخر میں کیولی بن جانا، ان کی منزلِ مقصود ہے۔

دوسری عظیم تحریک بدھ مت کی تھی جس کے بانی گوتم تھے۔ مہاویر کی طرح گوتم بھی ایک چھتری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد شدھودھن کپل وستو کے شاکیہ سردار تھے۔ وہ راج محل کے عیش و آرام اور اپنے بیوی بچے کو خیرباد کہہ کر جنگلوں میں نکل کھڑے ہوئے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ سادھو بن گئے۔ یہ زندگی سے فرار نہیں تھا۔ وہ اس بات کی کھوج لگانا چاہتے تھے کہ زندگی کیا ہے اور اس کے ماورا کیا ہے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے زمانے کے بڑے بڑے عالموں سے ملاقاتیں کیں، مگر کوئی ان کی تسکین نہ کر سکا۔ پھر انھوں نے سخت تپ کیا۔ لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ جسم کو تکلیف دینا اور نفس کشی کرنا بے کار ہے۔ لیکن انھوں نے تلاشِ حق جاری رکھی۔ اس کے بعد وہ ریاست بہار میں گیا کے قریب ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سخت غور و فکر میں ڈوب گئے اور انسانی تکالیف کے اسباب اور ان کے علاج کے بارے میں سوچ بچار میں محو ہو گئے۔ آخرکار وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسانی خواہشات ہی تمام تکلیفوں کی جڑ ہیں۔ جہل، طمع اور نفسانی خواہشات وہ ایندھن ہیں جس کے ذریعے سے انسانی جذبات کائنات میں آگ لگا دیتے ہیں، اور اس دہکتی ہوئی بھٹی سے جس کا نام دنیا ہے، بچ نکلنے کا نام 'نروان' ہے۔ انھیں روشنی مل گئی اور وہ "بدھ" (عارف) کہلانے لگے۔

اس دور آفریں واقعہ کے بعد گوتم نے اپنا پیغام دنیا تک پہنچانے کا کام شروع کیا۔ ۴۵ سال تک برابر وہ اپنے نئے مذہب کی تبلیغ کرتے رہے۔ اس دوران میں انھوں نے اپنے 'سنگھ' یعنی بھکشوؤں اور بھکشنیوں کی تنظیم کا کام بھی انجام دیا۔ ۸۰ سال کی عمر میں ان کا دیہانت ہو گیا، اور وہ اس منزل میں داخل ہو گئے جسے 'نروان' کہتے ہیں۔ اپنے غم زدہ چیلوں کو جو اُن کے بسترِ مرگ کے قریب تھے ان کا آخری پیغام یہ تھا، "دنیا کی ہر شے میں انحطاط اور زوال راسخ ہے، اپنی نجات کا راستہ تن دہی سے تلاش کرو۔"[1]

گوتم برہمن پروہتوں کے دنیادارانہ رویے پر کڑی تنقید، اور قربانی کی رسموں کے خلاف بے باکی کے ساتھ اظہارِ بیزاری کرتے تھے۔ راج محل کو چھوڑ کر انھوں نے اپنے کو کلیتاً عوام کے لئے وقف کر دیا۔ کسی گوالے کی جھونپڑی ہو یا شراوستی کے مہاجن اناتھ پنڈک کا عالیشان مکان، وہ دونوں جگہ یکساں آرام و آسائش محسوس کرتے تھے۔ وہ عوام کی زبان میں وعظ کیا کرتے تھے۔ ریاکاری سے وہ متنفر تھے، جہالت پر کڑھتے تھے، تعیش پر چوٹ کرتے تھے اور نفس کشی کو فضول سمجھتے تھے۔ ان کے مذہب کے آٹھ پاکیزہ اصول تھے جنھوں نے ہندوستان کی اخلاقی زندگی میں جان ڈال دی۔ ان کے اکثر اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے نظریات کو عقل کی کسوٹی پر کستے تھے اور ان پر پورا پورا اعتماد رکھتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ایک راج کمار مذہبی پیشوا، اور ایک فلسفی معلمِ اخلاق میں تبدیل ہو گیا۔

جس بدھ مت کا پرچار گوتم نے کیا اس میں ایک عظیم فلسفۂ زندگی کی سادگی اور بصیرت کی پاکیزگی جھلکتی ہے۔ وہ کہتے

---

[1] بودھ روایات کے مطابق یہ واقعہ ۵۴۳ ق۔م میں پیش آیا۔ لیکن ان کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ مجمدار نے پیدائش ۵۶۶ ق۔م اور موت ۴۸۶ ق۔م قائم کی ہے۔ اس کے برخلاف آر۔سی، مکرجی نے پیدائش ۶۲۳ ق۔م اور موت ۵۴۴ ق۔م قرار دی ہے۔ ان کی عمر ۸۰ سال ہوئی، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تھے۔ زندگی میں تکلیف ہی تکلیف ہے۔ زندگی کے ماوراء مسرت ہے۔ انھوں نے وجود کے فلسفہ کی وضاحت علت اور اس کے معلول کے ذریعہ کی۔ وہ کہتے ہیں: "کرم جیون کا ایک بندھن ہے جو خواہشات سے پیدا ہوتا ہے، اور خواہشات جہالت کا نتیجہ ہیں۔ جہالت کو ختم کردو تو سمجھ لو تمام تکلیفیں دور ہوگئیں، ان کی جڑ کٹ گئی، ان کا سلسلہ منقطع ہوگیا، اور ان کو ختم کرنے کا گویا راستہ مل گیا۔"[1] ان کے نامی گرامی اشٹانگک مارگ کے آٹھ اصول تھے:۔ راسخ عقیدہ، نیک ارادے، حق گوئی، راست بازی، رزقِ حلال، صحیح کوشش، عمدہ خیالات اور کامل مراقبہ۔ مختصراً تعمیرِ سیرت، تربیتِ ذہن، اور ارتقاءِ عقل انسان کا نصب العین قرار دیا گیا۔ مہاویر کی طرح انھوں نے بھی کرم اور بار بار جنم لینے کے عقیدے کو پوری طرح تسلیم کرلیا، لیکن ان کے نزدیک روح میں عقیدہ رکھنے کی کوئی وجہ جواز نہیں تھی۔ انھوں نے الہام والقا کی بجائے عقل وادراک کو اہمیت دی اور خود انسان کو اپنا معمار بنادیا۔ اگر انسان کے خیالات پاکیزہ ہیں اور اس کی رفتار وگفتار نفسانی خواہشات، عداوت، فریب وغیرہ کی آلودگی سے معرا ہیں تو اُسے دیوتاؤں کے حضور کوئی قربانی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اشنان کے لئے گنگا پر جانے کی ضرورت ہے کیونکہ قریب میں جو کنواں ہے وہ بھی اس مقصد کو پورا کرسکتا ہے۔ انھوں نے اپنے پیرووں کے سامنے جو نصب العین رکھا وہ سادگی، پاکیزگی، اور اخلاقی قدروں کے ایسے امتزاج کا حامل ہے جس کے ذریعہ انسان طمع اور تکلیف کو ختم کرکے 'نروان' کا مستحق ہوجاتا ہے۔

گوتم کے نزدیک انسان کی قدر وقیمت اس کے عمل پر منحصر تھی نہ کہ اس کے اعلیٰ خاندان یا اونچی ذات پر۔ ذات پات کی بندشوں کے وہ قائل نہ تھے اور اسے معیوب سمجھتے تھے۔ ان کے مذہب کے دروازے برہمن اور شودر سب پر یکساں کھلے ہوئے تھے۔ ان کے "سنگھ" کا نظام مکمل طور پر جمہوری تھا۔ یہ برہمنوں کے تشخص، حقوق، اور اجارہ داری کے لئے ایک زبردست چیلنج تھا۔ اس طرح بدھ مت نے عوام کے لئے تربیتِ نفس اور حصولِ علم وفن کے دروازے کھول دیئے۔ بدھ "سنگھ" کے بھکشوؤں اور بھکشنوں کی برادری اس زمانے کی مذہبی زندگی میں ایک عظیم تجربہ تھی، اور اس قسم کی تنظیم غالباً مذہبوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی تنظیم تھی۔ اس تنظیم کی بدولت بدھ مذہب کی خوب ترقی ہوئی اور وہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام ایشیا میں بہت تیزی کے ساتھ پھیل گیا۔

ٹھیک اس زمانے میں جب اُپنشد وحدت پرستی اور وحدت الوجود کی تلقین کررہے تھے، توحید کے ایک جدید عقیدے کے لئے میدان تیار ہورہا تھا جو چند صدیوں کے بعد 'ویشنومت' کے نام سے مشہور ہوا۔ بدھ اور جین مت کی طرح یہ بھی ایک چھتری تحریک تھی اور اس میں جانوروں کی قربانیوں کی سخت ممانعت تھی۔ بھگوت (مالک) سے والہانہ عقیدت اس کا نصب العین تھا۔ اس لئے وہ 'بھگوت مت' کے نام سے بھی موسوم ہے۔ بدھ اور جین مت دونوں وجودِ باری کے سوال پر خاموش ہیں۔ اس کے برخلاف بھگوت مت میں خدائے تعالیٰ کے تصور کو مرکزیت حاصل ہے جس کی خوشنودی اور لطف وکرم ہی سے نجات ممکن ہے۔ نجات کا ذریعہ بھکتی ہے، یعنی اس ذات ارفع واعلیٰ کے حضور انسان کی مکمل سپردگی، نفس کشی اور ایک باضابطہ اخلاقی شعار۔

بھگوت دھرم کے تین خاص اصول ہیں — کرم، روح اور خدا۔ کرم بے لاگ ہونا چاہیئے، روح کو دائمی اور لازوال مانا گیا ہے، خدا کا تصور یہ ہے کہ وہ کریم ہے، قادرِ مطلق ہے، لوگوں کے دکھ درد اور جہالت سے متاثر ہوتا ہے۔ 'واسودیو' روحِ ارفع واعلیٰ ہے، تمام روحوں کی روح۔ وہی خالقِ حقیقی ہے۔ تمام جاندار مخلوق واسودیو ہی کا پرتو ہے۔ اس طرح بھگوت دھرم ایک وحدت پرست مذہب ہے جو خلوص ومحبت کے ساتھ خدائے واحد کی پرستش کی تلقین کرتا ہے۔ دوسری صدی ق۔م تک اس کے عقائد مرتب ہوچکے تھے اور گپت زمانے میں اس کے ماننے والوں

---

[1] بی۔ جی۔ گوکھلے: "قدیم ہندوستان، تاریخ اور سماج۔"

کی تعداد کافی ہو چکی تھی۔

اگر واسودیو کرشنا اس فرقے کے امام ہیں تو بھگوت گیتا اس کی کتابِ شریعت ہے۔ ہندوستان میں جو غیر معمولی مقبولیت تمام زمانوں میں گیتا کو حاصل رہی ہے۔ وہ شاید کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔ ہندوستان کی ان گنت نسلوں نے جو تعظیم و تکریم اور توصیف اس کی ہمیشہ کی ہے، اس کی بجا طور پر وہ مستحق بھی ہے۔ بلندیٔ فکر و نظر کے ساتھ ساتھ اس کے مضامین میں رنگینی اور پیغام میں وثوق و قطعیت پائی جاتی ہے۔ اس کے دامن میں اتنی وسعت ہے کہ ہندوستانی فلسفہ کی تمام اعلیٰ قدروں کو اس نے اپنے اندر سمو لیا ہے، اور مختلف نظریات و عقائد کا جو اس کی تصنیف سے بہت پہلے سے نشو و نما پا رہے تھے، ایک خوش گوار امتزاج پیدا کر دیا ہے۔ پروفیسر بھنڈارکر کہتے ہیں۔ "اپنشدوں میں وحدت پرستی کا تصور موجود تھا لیکن یہ خیالات منتشر حالت میں تھے۔ گیتا نے ان سب کو یکجا کر کے نجات کے ایسے ضابطے میں تبدیل کر دیا جسے ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے اور اس پر عمل کر سکتا ہے۔"[1]

گیتا دراصل مہا بھارت کا ایک جزو ہے اور اس کا ماحول کروکشیتر کا مشہور و معروف میدانِ کارزار ہے۔ کوروؤں اور پانڈوؤں کی فوجیں ایک دوسرے سے اپنی اپنی بات منوانے کی پیچ میں دُو بہ دُو برسرِ پیکار کھڑی ہیں۔ ارجن مخالف فوج پر نظر ڈال کر محسوس کرتے ہیں کہ مخالفین میں بہت سے اُن کے استاد یا گورو ہیں جن کی وہ عزت کرتے ہیں، یا قرابت دار ہیں جن سے وہ محبت کرتے ہیں۔ یک لخت وہ پس و پیش میں پڑ جاتے ہیں، کیونکہ جنگ کا مطلب تباہی و بربادی ہے اور اُن لوگوں کا قتل و غارت ہے جنہیں کل تک وہ نہایت درجہ عزیز رکھتے تھے۔ پھر یہ سب ہونے والا قتلِ عام کس لئے ہے؟ وہ دل ہی دل میں سوال کرتے ہیں۔ اس کا جواب ان کے پاس اس کے

[1] مجمدار: "ہسٹری آف انڈین کلچر"

سوا کچھ نہیں کہ اس جنگ و جدال کا مقصد سلطنت حاصل کرنا ہے جو خود غرضی پر مبنی ہے۔ لیکن چوں کہ اعلانِ جنگ ہو چکا ہے اس لئے چھتری کا فرض ہے کہ وہ جنگ کرے۔ اس طرح ان کے ذہن میں یہ بنیادی کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور ان کا خانۂ دل خود ایک رزم گاہ میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں ذاتی اغراض اور فرض نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ کمان ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور وہ اس اہم مسئلہ میں اپنے فلسفی رتھ بان، شری کرشن سے مشورہ کے لئے رجوع کرتے ہیں۔ شری کرشن ان کے شبہات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور انھیں ان کے فرض سے آگاہ کرتے ہیں۔ ارجن چھتری ہیں اور چھتری کی حیثیت سے انھیں لڑنا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس طرح لوگوں کو قتل کر کے ان کی جان لے لیں گے تو وہ غلطی پر ہیں، کیونکہ روح غیر فانی ہے اور نہ تلوار اسے فنا کر سکتی ہے، نہ آگ، پانی اور ہوا۔ پھر وہ یکے بعد دیگرے مختلف اور متضاد فلسفیانہ نظریات اور ان کے باہمی تعلق پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔ اس کے بعد گیتا کا پیغام آتا ہے، یعنی بے غرض عمل، اور ذاتیات کو پسِ پشت ڈال کر فرض کی انجام دہی کا پیغام۔ گیتا کہتی ہے۔ "تمہارا تعلق عمل سے ہے، عمل کے نتیجہ سے نہیں۔ عمل خود ہی اس کا صلہ ہے اور جزا اور سزا کے تصور کے بغیر عمل کرنا بہترین فعل ہے —" شری کرشن جی کہتے ہیں "بے غرض عمل ہی تمہارا فرض ہے، اور یہی راہِ نجات بھی ہے۔ فرض شناسی سب سے بڑا وصف ہے، اور اسی کے ذریعہ سے انسان ایشور سے وصال حاصل کر لیتا ہے۔"[2]

گیتا محض ایک مذہبی نظم نہیں ہے، بلکہ اس میں زندگی کا ایک مکمل پیغام موجود ہے۔ اس میں جو مسائل حل کئے گئے ہیں ان میں آفاقیت ہے۔ ہر انسان کا دل کسی نہ کسی وقت کروکشیتر بن جاتا ہے جس میں ذاتی اغراض فرض سے ٹکراتی

[2] بی۔ جی گوکھلے: "قدیم ہندوستان، تاریخ اور سماج"

ہیں، اور جب بھی دل میں اس قسم کی ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو گیتا میں اس کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور مل جاتا ہے۔ اسی میں گیتا کی عظمت اور بے پناہ مقبولیت کا راز پوشیدہ ہے۔

بھگوت گیتا فلسفیانہ معلومات کا ایک سمندر ہے جس میں ہندوستانی فلسفہ کے تمام مکاتیبِ فکر — "سانکھیہ" "یوگ"، "نیائے"، "ویشیشکا"، "پوروَمی من سا" اور "ویدانت" اور ان کے نزاعی مسائل کا مفصل بیان موجود ہے۔ ذیل میں ان تمام مکاتیبِ فکر کا علیحدہ علیحدہ ذکر مختصر طور پر کیا جائے گا۔

سانکھیہ فلسفہ اپنشدوں کے مثالی وحدت الوجود کے عقیدے کا ایک ردِّ عمل ہے۔ اس کا بانی کپیلا نامی مفکر تھا جس نے عقلی دلائل سے مظاہر قدرت کی وحدت کی بجائے کثرت کو ثابت کیا۔ اس نے برہما کے تصوّر کو رد کر دیا اور خالص عقلی معیار پر اپنے اصول کو تجزیہ کیا۔ کائینات کی توضیح کے لئے کپیلا کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ دو غیر فانی حقیقتوں، پراکرتی اور پروشا کا وجود لازمی ہے جنھیں کسی نے خلق نہیں کیا۔ پراکرتی جسے ہم آسانی کے لئے مادّے سے تعبیر کر سکتے ہیں، حقیقی ہے، اور پروشا (روح) ایک نہیں بلکہ لاتعداد روحوں کا مجموعہ ہے۔ مادّہ اور روح دونوں قدیم ہیں۔ مادّے کے ذریعہ کائنات کا ارتقاء عمل میں آیا۔ روح بجائے خود غیر متغیر ہے، لیکن مادّے کے ارتقائی عمل کا باعث اسی کا وجود ہوا۔ روح تغیر پذیر نہیں ہے، بخلاف اس کے مادّے میں تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ روح صفات سے مبرا ہے، لازوال ہے، غیر متحرک ہے۔ مادہ تین خصوصیات کا حامل ہے: ستو[1]، رجس[2]، اور تمس[3]۔ یہ تین خصوصیات، گُن (اوصاف)، مسلسل تغیر کے درجات ہیں جس کے دوران گُن بہر حال مستقل اور قائم رہتے ہیں۔ جب کبھی ان تین گنوں کا توازن بگڑتا ہے تو مادّے کا ارتقائی عمل شروع ہو جاتا ہے اور غیر شعوری قدیم مادہ روح کا اثر قبول کرتا ہے اور ارتقا پذیر ہونے لگتا ہے۔ روح کی بالفعل موجودگی مادّے کو حرکت میں لاتی ہے اور اس لئے مادّے اور روح کا امتیاز و ادراک ذریعۂ نجات بھی ہے۔

[1] ہلکا پن، تابانی، بشاشت

[2] تحریک، اشتعال، ایذا

[3] ثقل، مزاحمت اور جمود

سانکھیہ فلسفہ سے بہت قریب یوگ فلسفہ ہے جس کا بانی پتنجلی تھا۔ جس نے اپنے زمانے کے تمام رائج الوقت عقائد کو ایک باقاعدہ مسلک کی صورت میں مدوّن کیا۔ یوگ فلسفہ نے قریب قریب تمام سانکھیہ عقائد کو اپنا لیا ہے لیکن ایک ایشور کا اضافہ کیا ہے جو نہ خلق کرتا ہے، نہ جزا اور سزا دیتا ہے۔ یوگ فلسفہ کا تمام زور اس بات پر ہے کہ خیالات میں یکسوئی پیدا کی جائے اور حواسِ خمسہ کی تمام قوتوں اور ان کے افعال کو آتما کی طرف مرکوز کر دیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ انسان حواس پر قابو پائے اور تارک الدنیا ہو جائے۔

نیائے نام ہے ایک قسم کے طرزِ منطق کا جس کا بانی گوتم نامی فلسفی تھا جو اکش پاد[1] کے نام سے بھی معروف ہے۔ اس نے منطقیانہ استدلال کا ایک ایسا طریقہ مرتّب کیا جو ساتھ ساتھ نجات کے وسائل بھی اپنے دامن میں لئے ہے۔ اس کے نزدیک علم کے ذرائع چار ہیں: ادراک، استنباط، تمثیل، اور عقلی شہادت۔ استنباط کی تین قسمیں ہیں: علت، معلول، نتیجہ۔ نیائے فلسفہ میں قیاس منطقی کے پانچ جزو ہیں: قضیہ، علت، توضیح بالتمثیل، تلخیص علت اور نتیجہ۔ حسب ذیل مثال سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

"پہاڑ پر آگ لگ رہی ہے: اس لئے کہ پہاڑ پر دھواں دکھائی دے رہا ہے: جہاں کہیں دھواں

[1] لغوی معنی ہیں "چشم پا"

ہوتا ہے کہ آگ ضرور ہوتی ہے: پہاڑ پر دھواں ہے: اس لئے پہاڑ میں آگ لگ رہی ہے۔"

نیائے سے ملتی 'ویشیشکا' فلسفہ ہے۔ نیائے کے بیشتر نظریات خصوصاً نظریۂ جوہر اور وجودِ کائنات ایک بڑی حد تک ویشیشکا مکتبۂ فکر سے ماخوذ ہیں۔ ویشیشکا طریقت کا بانی کناڈا[1] کو مانا جاتا ہے جس کے سوتر ۴۰۰ء میں قلم بند ہوئے۔ اس نے مشاہدہ میں آنے والی مختلف چیزوں کو دَروّیہ (عناصر) میں تقسیم کیا، مثلاً — زمین، پانی، آگ، ہوا، ایتھر (اتھیر)، زمانہ، خلا، روح، اور قوتِ متخیلہ۔ عناصر کی یہ تمام خصوصیات کائنات کی تشکیل کا باعث ہوئیں۔ ان سب کے اپنے اپنے علیحدہ خواص ہیں، اور وہ ایک دوسرے سے متضاد رشتے پیدا کر لیتے ہیں۔ زمین، پانی، آگ اور ہوا کے جوہر قدیم ہیں اور انھیں کسی نے خلق نہیں کیا ہے۔ وجودِ کائنات کے بارے میں اس مکتبِ خیال کے مفکرین نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مادے کے مختلف جوہر جب ایک خاص انداز میں مجتمع ہو جاتے ہیں تو ارتقائی عمل شروع ہو جاتا ہے اور کائنات وجود میں آ جاتی ہے، اور جب وہ جوہر منتشر ہو کر کسی دوسرے انداز میں از سرِ نو مجتمع ہو جاتے ہیں تو ارتقائی عمل بند ہو جاتا ہے اور کائنات فنا ہو جاتی ہے، اور ایسے ایسے کئی دَور گزر چکے ہیں۔

پوَرو می من ٗسا کا دعویٰ ہے کہ وید قدیم ہیں اور انھیں کسی نے خلق نہیں کیا ہے۔ ویدوں اور قربانی کی رسموں کا مطلب سمجھنا اور اس کی صحیح صحیح ترجمانی کرنا اس مسلک کا مقصد ہے۔ اس مسلک کی وضاحت مسلک کے بانی، جیمنی کی می من سا درشن میں کی گئی ہے جو ۲۰۰ء اور ۴۵۰ء کے درمیان کی تخلیق ہے۔

ان تمام مسلکوں میں قدیم ہندوستان کے مذہب اور فلسفہ پر جو بے پناہ اثر آترّ می من ٗسا یا ویدانت نے ڈالا ہے وہ کسی دوسرے مسلک نے نہیں ڈالا۔ "تت توَم اسی، اہم برہما اسمی" یعنی "کہ تو ہے، میں برہما ہوں" اس کا بنیادی نظریہ ہے۔ لیکن اگر حقیقت اولیٰ واحد ہے تو ہم دنیا میں کثرت کیوں دیکھتے ہیں؟ اس کا سبب مایا (جہل) ہے جو اصلی حقیقت کو جس پر ظاہری کثرت پردے ڈال دیتی ہے، ہماری نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ جہل کے باعث ہم آتما اور اُپادھی (ظاہری خصوصیات: بدن اور اعضاءِ بدن) میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتے۔ جہل ہمیں بار بار جنم لینے کے جنجال میں پھانستا ہے، اور یہی دنیا کی تمام تکلیفوں اور مصیبتوں کی جڑ ہے۔

مایا کی ضد ودّیا (علم) ہے جو نجات کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ علم ہمیں آتما اور ظاہری خصوصیات میں امتیاز کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اس لئے آتما اور برہما کی اصلی حقیقت کا علم عین نجات ہے، اور یہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے کہ آتما اور برہما ایک ہیں۔

ویدانت فلسفہ کے مشہور و ممتاز شارح شنکر اچاریہ تھے جو آٹھویں صدی عیسوی کی شخصیت ہیں۔ انھوں نے بدھ مذہب کے بڑے بڑے عالموں سے مناظرے کئے اور فلسفہ کے میدان میں انھیں شکست دی۔ اس سلسلہ کے دوسرے ترجمان رامانج اچاریہ تھے جو گیارھویں صدی عیسوی کی شخصیت ہیں۔ انھوں نے بھکتی مسلک کا پرچار کیا۔ بھکتی مسلک دراصل شنکر کے ادویت فلسفہ کا ردِّ عمل تھا جس میں برہما کو صفات سے مبرا مانا گیا ہے اور اس میں بھکتی کی، جس میں برہما کا تصور ضروری ہے، کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ادھر آتما، برہما، بھکتی اور رسموں کے ذریعہ نجات کے نظریات ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، دوسری طرف ایک اور فرقہ آزادی اور استقلال کے ساتھ مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ وہ تھا شیومت، اگر ویشنومت کی ڈانڈیں اپنشدوں کے دَور سے جا ملتی ہیں تو شیومت کی جڑیں بھی آریائی دَور میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

---

[1] لغوی معنی ہیں "جوہر خور"

رُودر، جس کا ذکر رگ وید میں موجود ہے۔ اس فرقہ کا بنیادی تصور ہے۔ رگ وید میں رُودر کو قہار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ رودر تمام مویشیوں کو مارتا ہے، بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ اس کا غیظ و غضب قربانیوں سے فرو ہو جاتا ہے۔ یجرُوید میں قہر و غضب کے ساتھ رُودر میں رحم و کرم کی صفات کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ قربانیوں سے جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو وہ شمبھو (مہربان و شفیق)، شنکر (رحیم و کریم)، اور شیو (مبارک او بھاگوان) بن جاتا ہے۔ اتھروید اسے خدائے تعالیٰ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ "رُودر بس ایک ہے جس کا فرمان اس دنیا میں چلتا ہے۔ تمام جان داروں نے اسی کو خلق کیا اور وہی ان کا محافظ و نگہبان ہے۔"[1] جب تاریکی ہی تاریکی تھی، نہ دن تھا، نہ رات، نہ شے تھی نہ لاشے۔ تو وہ موجود تھا، وہ غیر مرئی ہے، اور صرف باطن کی نگاہوں سے اس کا ادراک ہو سکتا ہے۔ وہ شیو ہے، خالق اور فنا کرنے والا۔ اور اس کی حقیقی معرفت بھاؤ (عشق، عقیدت، اور ریاضت) کے ذریعہ ممکن ہے۔

[1] بھنڈارکر: جسے مجمدار نے اپنی "قدیم ہندوستانی سماج کی تاریخ" میں نقل کیا۔

آخر میں خدا کا جو تصور البیرونی نے ہندوستان میں رائج پایا، اس کا ذکر اس مقام پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ البیرونی کہتا ہے، "ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ خدا واحد ہے، قیوم ہے، نہ اس کی ابتدا ہے نہ انتہا، وہ مختار ہے، قادرِ مطلق ہے، حکیم ہے، حیّ ہے، خالق ہے، حاکم ہے، حفیظ ہے، وہ وہ ہے جس کی بادشاہت ازلی ہے۔ جو مثل و ضد سے ماورا ہے۔ وہ کسی شے سے مشابہ نہیں، نہ کوئی شے اس سے مشابہ ہے۔ خدا کے بارے میں یہ عقیدہ پڑھے لکھے لوگوں کا ہے۔ وہ اسے ایشور کہتے ہیں، یعنی غنی اور کریم، جو بغیر لئے دیتا ہے۔ وہ خدا کی قدرت کو مطلق مانتے ہیں۔ خدا کے علاوہ دنیا کی تمام چیزوں میں اگر وحدت دکھائی بھی دے تو وہ وحدت نہیں کثرت ہے۔ اس کا وجود، وجودِ مطلق ہے، کیونکہ ہر وہ شے جو موجود ہے وہ اس وجودِ مطلق کے باعث وجود میں آئی ہے۔ یہ سوچنا ناممکن نہیں ہے کہ موجوداتِ عالم نہیں ہیں اور "وہ" ہے، لیکن یہ سوچنا ناممکن ہے کہ "وہ" نہیں ہے اور موجوداتِ عالم ہیں۔"[2]

[2] البیرونی: کتاب الہند۔

قاضی عبدالودود کو اعزاز

قاضی عبدالودود بارایٹ لا فارسی اور اردو کے مشہور اور ممتاز عالم ہیں اور بھارت اور بیرونی ملکوں میں ان کی تنقیدوں کو اردو اور فارسی ادب میں بیش بہا اضافہ تسلیم کیا گیا ہے۔ انھوں نے فارسی اور اردو ادب میں عظیم تحقیقی اور تنقیدی کارنامے انجام دئے ہیں۔ ان کی ذات بہت سے علم دوستوں کے لئے مشعلِ راہ بنی ہے اور انھوں نے قاضی صاحب کے مشورہ اور نگرانی میں تحقیقی مقالے تیار کئے ہیں۔ اس کے علاوہ قاضی صاحب 'معیار' اور 'تحقیق' نامی دو ادبی و علمی مجلّوں کے مدیر رہے ہیں اور اب غالب کی اردو اور فارسی تخلیقات کی ترتیب و تدوین کر رہے ہیں۔

آپ کو حال ہی میں صدرِ جمہوریہ کا فارسی کا اعزاز دیا گیا ہے

م م ۔ راجندر

کہکشاں

جس وقت میں نے اسٹیشن سے باہر قدم رکھا، میرا بچپن لوٹ آیا اور میں نے دل میں ایک اَن جانی سی تھرک محسوس کی۔ میں اسی چھوٹے سے شہر میں پیدا ہوا تھا اور اسی کی مٹی، گرد و غبار اور ہواؤں میں میری زندگی کے اٹھارہ سال بیتے تھے۔ تقریباً اتنے ہی برس ہوئے ہم نے اس شہر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا اور اب اس کے بعد میرا یہاں آنے کا پہلا اتفاق تھا۔ برسوں بچپن کے دوست اور اپنے گلی محلے یاد آتے رہے اور وقت کی سرد مہری اور بے پناہ مصروف زندگی نے بھی اس یاد کو نہیں بھلایا۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ یاد آنکھوں میں آنسو لے آتی تھی اور بے اختیار جی چاہتا کہ جاؤں اور دیوانہ وار انہی گلیوں میں گھوموں، ان گھروں اور دیواروں کو دیکھوں جنہیں دل کی آنکھ ابھی تک دیکھتی تھی۔ لیکن جہاں یہ جذباتی لمحے بیت جاتے، مصروف زندگی کی چکی پھر چلنے لگتی اور یہاں آنے کی خواہش اس سے پہلے پوری نہ ہو سکی۔ اس بار بھی مجھے ایک کام سے آگے جانا تھا اور چونکہ یہ راستے میں پڑتا تھا، میں یہاں اُتر پڑا تھا۔

اگرچہ ایک دو دُور پار کے رشتے دار یہاں ابھی تک تھے لیکن میرے لئے ان سے ملنے کی کوئی ایسی کشش نہیں تھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بچپن کے سب ساتھی بھی اِدھر اُدھر چلے گئے تھے اور شاید ہی کسی دوست سے ملاقات ہو مگر میں تو اپنے در و دیوار اور گلی کوچوں سے ملنے آیا تھا۔ میرا یہ عقیدہ تھا کہ ان کی بھی اپنی ایک ہستی، ایک وجود ہے اور یہ بھی ایک دل رکھتے ہیں۔ ابھی کوئی آٹھ بجے تھے اور میں دوپہر کو دو اڑھائی بجے تک لوٹ کر تین بجے کی گاڑی سے آگے چلا جانا چاہتا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر جھانک کر دیکھا، بالکل سب کچھ وہی تھا، سب کچھ ویسا ہی۔ میں اپنے جانے پہچانے راستے پر پیدل ہی چل دیا کیونکہ شہر ہی کتنا بڑا تھا اور تانگے پر بیٹھ کر میں ان لمحوں کو تیزی سے گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک ٹھنڈی خوش گوار ہوا چل رہی تھی اور میں بچپن کے ذہن اور سبک قدموں کے ساتھ دونوں طرف سب کچھ دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ کچھ نئے مکان اور دکانیں بن گئی تھیں مگر راستے اور بازار وہی تھے، لوگوں کی بِھیڑ نئی تھی مگر اس سے کیا، میں تو انہی راستوں سے ملنے آیا تھا۔

بازاروں اور سڑکوں پر سے ہوتا ہوا، ہر چیز کو دیکھتا اور پہچانتا ہوا میں اپنے محلے میں پہنچ گیا اور ایک اَن جانی خوشی اور جوش نے مجھے جکڑ لیا۔ ہاں یہی وہ پُل تھا، اور اب بھی اسی طرح ٹوٹا ہوا جس پر بیٹھ کر اور کھیل کر نہ جانے زندگی کے کتنے پل کتنی گھڑیاں بیت گئی تھیں۔ وہ سامنے نل، اب بھی وہیں تھا اور آج بھی اسی طرح اس پر برتن ایک لمبی قطار میں رکھے ہوئے تھے اور ویسی ہی بھیڑ تھی۔ مگر میں نے غور سے دیکھا اس بھیڑ میں میں کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ میں ایک ان جانے جذبے کے تحت اس پل پر بیٹھ گیا اور میرے تصوّر میں اس پُل پر میرے ساتھ میرے بچپن کے ساتھی رتو، چندر اور مول چند بیٹھ گئے۔ میں چند منٹ اس پُل پر بیٹھا اور

پھر اس کے نیچے نالے میں سے ہوتا ہوا باہر نکل آیا۔ جیسا کہ میں بچپن میں اکثر کیا کرتا تھا۔

اس محلے کی ساری گلیاں، مکان وغیرہ ویسے ہی تھے مگر اس میں بسنے والے بدل گئے تھے۔ کچھ پرانے رہنے والے ابھی تھے مگر انہیں بھی وقت کے بے رحم ہاتھ نے بدل دیا تھا۔ جو چھوٹے تھے وہ بڑے ہو گئے تھے، جو بڑے تھے وہ بوڑھے ہو گئے تھے اور کچھ مجھے پہچانتے تھے اور کچھ نہیں۔ جو جانتے تھے انہوں نے بڑی محبت کا اظہار کیا اور مجھے کھلایا پلایا۔ وقت سب کچھ مٹا دیتا ہے مگر محبت کے جذبے کو فنا نہیں کر سکتا اور یہ بات مجھے اپنے محلے میں گھوم پھر کر اور سب سے مل کر زیادہ شدت سے محسوس ہوئی۔ مجھے سب سے مل کر بے حد مسرت ہو رہی تھی مگر دکھ یہ تھا کہ بچپن کے دوست ملازمت اور کام کے سلسلے میں یہاں سے چلے گئے تھے۔ ایک آدمی سے بات چیت کر کے یہ پتہ لگا کہ ہمارا ایک ساتھی بھولا یہاں ہی ہے، اور اس نے کوتوال کے ہاں چائے کی دکان کر رکھی ہے۔ بھولا بھی ہمارے بچپن کے ساتھیوں میں سے تھا اور میرے دل میں اس سے ملنے کی خواہش بھڑک اٹھی۔

میں اپنی گلی میں گیا اور دیر تک اپنے مکان کے آگے کھڑا رہا۔ اس مکان میں اب کوئی اور رہتا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ بند دروازے پر رکھ دیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بچپن کی بچھڑی دو روحیں مل گئی ہوں۔ میری آنکھیں نمناک سی ہو گئیں اور میں نے مڑ کر اپنے ارد گرد دیکھا۔ ہمارے سامنے اٹھارہ برس پہلے جو ٹوٹے ہوئے مکان کا کھنڈر تھا جس میں ہم آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے چھپا کرتے تھے آج بھی موجود تھا۔ میں اس کھنڈر میں سے ہوتا ہوا دوسری گلی میں نکل آیا اور اس میں سے گزر کر پیچھے کی طرف سڑک پر آ گیا۔ یہاں وہ دو دکانیں تھیں جن پر میں اکثر آیا کرتا تھا۔ ایک برجو حلوائی کی، جس سے میں برفی خریدتا تھا اور ایک بالی پرچون والے کی، جس کے گڑ کے شکر پارے بڑے مزے دار ہوتے تھے۔ برجو کی دکان اب وہاں نہیں تھی اور مجھے پتہ لگا کہ وہ مر گیا تھا۔ بالی جو اب بوڑھا ہو گیا تھا، بدستور بیٹھا تھا اور اس کی دوکان بالکل ویسی ہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دو آنے کے شکر پارے مانگے اور اس نے بغیر مجھے پہچانے اسی کونے میں، اور شاید اسی ڈبے میں سے نکال کر دے دئے۔ میں سوچنے لگا کہ زندگی کہیں جوں کی توں موجود ہے اور کہیں اس طرح مٹ جاتی ہے جیسے برجو کی دکان۔

میں یہاں سے سیدھا کوتوالی کی طرف بھولا سے ملنے چلا گیا۔ بھولا ایک غریب لڑکا تھا اور بچپن میں وہ انگریزوں کی کوٹھیوں میں بوٹ لوائے یعنی بوٹ وغیرہ صاف کرنے اور بہرے کی مدد کرنے کا کام کیا کرتا تھا۔ مگر بچپن میں امیری غریبی اور اونچ نیچ کا تصور کسے ہوتا ہے۔ بھولا ہمارے اچھے دوستوں میں سے تھا۔ مجھے اس کی دکان آسانی سے مل گئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا اور دوڑ کر اور بچپن کا نام لے کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میری مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا اور ہم کچھ لمحوں کے لئے ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ کتنی گرمی اور پیار اس ملاپ میں تھا۔ اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میں دکان میں بیٹھ گیا اور ہم کافی دیر تک ایک دوسرے سے بات کرتے رہے۔ میں نے اسے دہلی آنے کے لئے کہا۔ بچپن کی باتوں اور ساتھیوں کے ذکر نے مجھے ایک اور ہی دنیا میں پہنچا دیا۔

بھولا اپنی دکان بند کرنے لگا اور بضد ہوا کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلوں اور کھانا کھاؤں۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر بھولا کے گھر گیا اور کھانا وغیرہ کھایا تو تین بجے کی گاڑی نہ پکڑ سکوں گا، مگر اس کے گھر جانے کی خواہش کی بھی مزاحمت نہ کر سکا۔

بھولا کی بیوی اور بچوں سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں اس کے گھر کوئی دو گھنٹے رہا اور اس اثنا میں ہم نے اپنے سب دوستوں کی باتیں کیں۔ اب میں چھ بجے کی گاڑی سے ہی جا سکتا تھا، اس لئے کوئی ایسی جلدی بھی نہیں تھی۔ باتوں ہی باتوں میں بھولا نے ایک اور دوست منّا کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ تو اب اس شہر کا ایک بڑا بزنس مین ہے اور بہت امیر ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور بھولا فوراً میرے ساتھ چل پڑا۔ ہم دونوں منّا کے محل کی طرح لمبے چوڑے مکان میں جھجکتے ہوئے داخل ہوئے۔ منّا موجود

تھا اور مجھے دیکھتے ہوئے مجھ سے بغل گیر ہوگیا۔ اس نے بڑی پُر تکلف چائے پلائی اور ہم تینوں نے ہنس ہنس کر بچپن کے بہت سے لمحات ایک دفعہ پھر گزار دئے۔

جس وقت ہم منا کے مکان سے لوٹ رہے تھے تو ایک بڑے پکے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھولا بولا۔

" یہ چندا کا مکان ہے۔ یاد ہے کچھ ؟ "

" کون چندا ؟ "

" وہی جیون کی لڑکی۔"

" ارے وہ چندا۔ شادی ہوگئی تھی اس کی ؟ "

" ہاں اس کے تو اب کئی بچے ہیں اور بر بھی اتنا سندر ملا ہے کہ کسی کو کیا ملیگا۔ یہ مکان انھوں نے ابھی بنوایا ہے۔"

میں وہیں کھڑا ہوگیا۔ چندا ہماری گلی کی لڑکی تھی اور ہم سب اسے جانتے تھے۔ دس برس کی عمر تک تو وہ ہمارے ساتھ ہی کھیلتی رہی تھی۔ پرماتما نے اسے بڑا بدصورت بنایا تھا اور اس کی ایک آنکھ میں بھی نقص تھا۔ اس کے ماں باپ نے اس کی شادی کی بڑی کوشش کی تھی لیکن ہمارے ہوتے ہوئے تو ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ ان دنوں لڑکی کو دیکھنے دکھانے کا بھی کوئی خاص رواج نہیں تھا۔ میری نظروں کے سامنے وہ دن گھوم گیا جب چندا اور اس کی ماں ہمارے گھر آئے ہوئے تھے اور میری ماں نے ایک پنڈت کو بلوا رکھا تھا جسے سب عورتیں اپنا ہاتھ دکھا رہی تھیں۔ چندا کی ماں نے چندا کو آگے دھکیل کر اس کا ہاتھ بھی پنڈت جی کے آگے کر دیا۔ اور پنڈت جی نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہی کہا۔ " اس کی قسمت کا ستارہ تو بہت اونچا ہے۔" اور پنڈت جی کی بات سنتے ہی ساری عورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ چندا جیسی بدصورت لڑکی کا جس کے ساتھ کوئی بھی شادی کرنے کو تیار نہیں تھا، قسمت کا ستارہ کیسے اونچا ہو سکتا تھا ؟ مگر ان ہنسنے والی عورتوں میں چندا کی ماں شامل نہیں تھی جس نے پنڈت جی کی بات پر یقین سا کر لیا تھا۔ میں نے چندا سے ملنا چاہا اور ہم دونوں آگے بڑھے۔ بھولا نے دروازہ کھٹکھٹایا جو چندا نے ہی کھولا۔ وہ مجھے فوراً پہچان گئی اور بڑی خوش ہوئی۔ وہ ہمیں اندر لے گئی اور ہمارے منع کرنے پر بھی اس نے چائے کا پانی چڑھا دیا۔ جب وہ ہمارے پاس بیٹھی تو مجھے یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی زندگی واقعی خوشی سے بھرپور تھی۔ اس نے اپنے الھڑ سے انداز میں میرا نام لے کر پوچھا۔

" تمھاری شادی ہوگئی ؟ "

میں ہنس پڑا اور بولا:

" ہم سب ایک ہی عمر کے ہیں۔ سب کی شادی ہوگئی تو میری کیسے نہ ہوتی۔ میرے تو اب چار بچے ہیں۔"

وہ مسکرادی اور بولی:

" بالکل ویسے ہی لگتے ہو جیسے چھوٹے سے تھے۔ تم بہت کم بدلے ہو۔"

ہم چندا کے یہاں کچھ دیر بیٹھے۔ چندا کے پتی سے میری ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ وہ اپنے کام پر گیا ہوا تھا مگر چندا سے مل کر جو خوشی ہوئی تھی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ پرماتما نے ایک بدصورت لیکن دل کی نیک لڑکی کو اس کی خوشیاں دے دی تھیں۔

بھولا اور اس کا بھائی مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آئے۔ میری ٹرین روانہ ہوئی تو بھولا دیر تک اپنا رومال ہلاتا رہا اور میں کھڑکی میں سے گردن نکال کر اور ہاتھ ہلا کر اپنے بچپن کو الوداع کہہ رہا تھا۔ میری آنکھیں ایک دفعہ پھر نمناک ہوگئی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ زندگی اس ٹرین کی طرح تیزی سے گزرنے اور بہنے والی ہے۔ در و دیوار اور گلی کوچے انسانی زندگی سے زیادہ پائیدار ہیں، لیکن محبت اور خلوص کا جذبہ لافانی ہے۔ یہی جذبہ زندگی کی دھند میں چمکنے والا روشن ستارہ ہے اور ایسے ان گنت ستاروں کی کہکشاں اس دھرتی پر بھی جھلملاتی ہے!



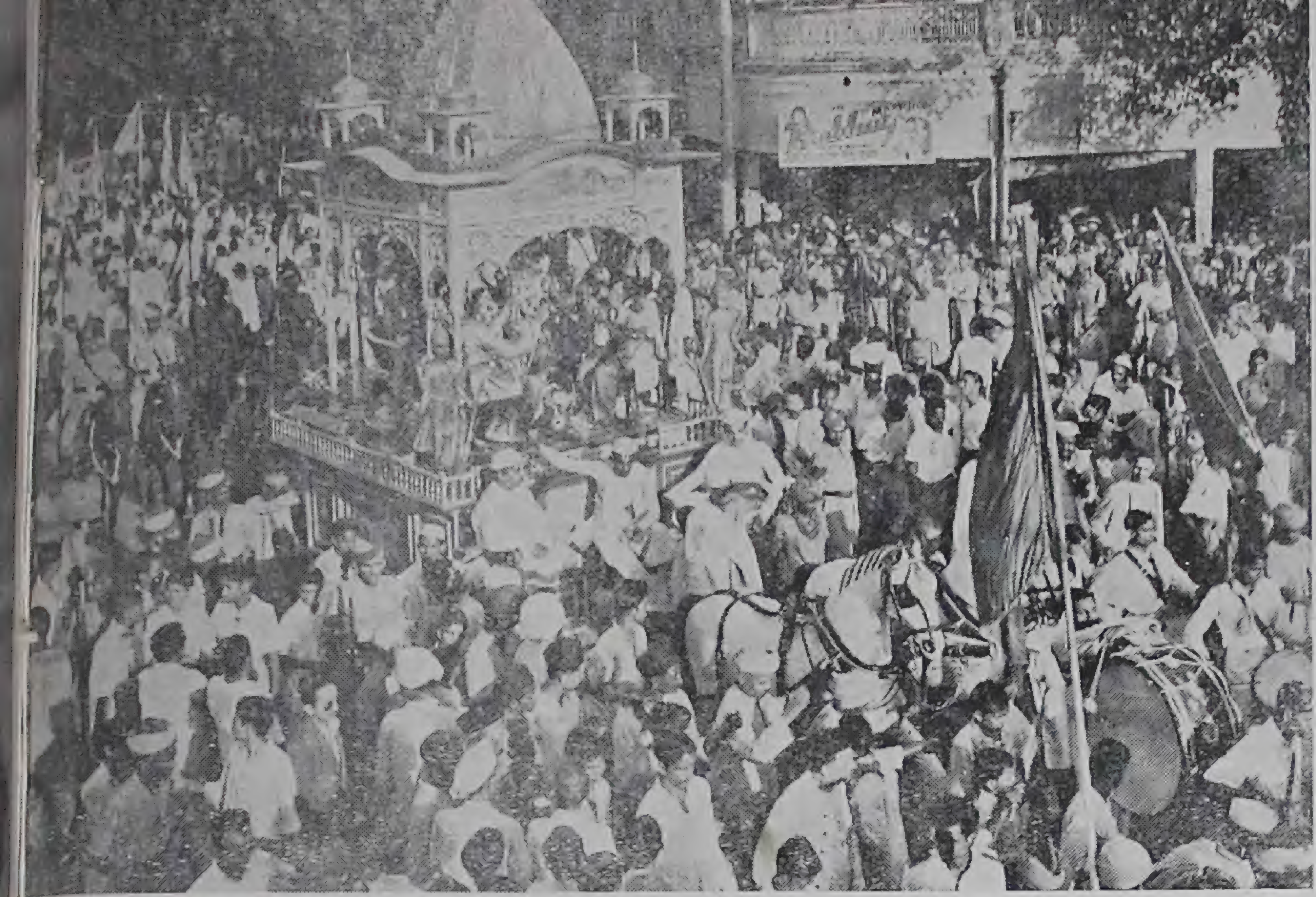
قاضی عبدالودود

آپ اردو اور فارسی کے مشہور محقق ہیں
حال ہی میں آپ کو صدرِ جمہوریہ نے فارسی
زبان کا ایوارڈ دیا ہے۔

پنڈت میلا رام وفا

اردو کے مشہور شاعر اور صحافی
جنھیں حکومت پنجاب نے اردو
کے ادیبِ اعلیٰ کا اعزاز دیا ہے





دھلی میں
رام لیلا کا جلوس

.بھارتیہ کلا کیندر کا رام لیلا بیلے

رام، سیتا اور لچھمن ۔



راون، کنبھ کرن اور میگھ ناد





شری سچن شنکر رام کے روپ میں



شریمتی کمودنی سیتا کے روپ میں

بیلے کی چند تصاویر



گاؤں کی پنہارنیں ایک رقص کے
ذریعے رام کے لوٹ آنے کی خوشی اور
خوش حالی کا مظاہرہ کر رہی ہیں



ہندوستانی موسیقی کے ماہر
اُستاد مشتاق حسین
جن کا حال ہی میں انتقال ہو گیا



مراٹھی زبان کے مشہور مصنف - ہری نارائن آپٹے
متعلقہ مضمون ص ۲۴ پر دیکھئے

اردو شاعری کے عام لہجے نے اور بلند سے بلند اردو شاعری کے نوے فی صدی اشعار نے اردو دنیا کے شعور کو ایک خاص سطح سے بلند نہیں ہونے دیا۔ فراق نے اپنے ہزارہا اشعار اور سیکڑوں غزلوں سے اور متعدد نظموں اور رباعیوں سے اس سطح کو بہت بلند کر دیا ہے۔ یوں تو ان کی شاعری اس دھرتی کی شاعری ہے لیکن اس شاعری میں یہ دھرتی آسمان سے باتیں کرتی نظر آتی ہے۔ فراق کی غزلوں میں کوئے جاناں یا کوئے محبوب اس زمین کی جانی پہچان گلیاں ہیں جن کے سرے دیولوک سے جا ملتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمین کے عناصر ترکیبی روح کے عناصر ترکیبی ہیں۔ بلند سنسکرت ادب اور دورِ حاضر میں ٹیگور کی شاعری جس طرح زمین اور زمین کی زندگی کو جنت نشاں بنا دیتی ہے اسی طرح فراق کی شاعری بھی مادیت کو روحانیت میں بدل دیتی ہے۔ یہ شاعری ایک کیمیاوی اثر رکھتی ہے جو ہماری زندگی کو اندر سے بدل دیتی ہے۔ گوشت و پوست کے جذبات کو روحانی تجربوں اور کیفیتوں میں بدل دینا شاعری کا شاید سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

نذرِ جواہر

منتخابِ شعرائے قدیم بزمِ سخن بھاگل پور

پھیکی ہے روشنائی تو غمگیں قلم ہے آج
ہندوستاں کے رہبرِ اعظم کا غم ہے آج
— کریم اسعدی

چھلنی ہر اک جگر ہے ہر اک آنکھ نم ہے آج
ڈھایا یہ آسماں نے بڑا ہی ستم ہے آج
— انجم برہجوی

جس کو بھلا سکیں نہ کبھی وہ الم ہے آج
گاندھی کے بعد یعنی جواہر کا غم ہے آج
— تزرنی پانی پتی

دل پر عجیب چوٹ ہے اور چشم نم ہے آج
گاندھی سے بھی عظیم جواہر کا غم ہے آج
— عادل غازی پوری

گلہائے گلستاں پہ یہ طرفہ ستم ہے آج
گاندھی کے بعد آہ جواہر کا غم ہے آج
— کامل بھاگلپوری

پرچم ہر ایک قصرِ حکومت کا خم ہے آج
اپنا تو اپنا غیر بھی غم میں بہم ہے آج
— اثر بھاگلپوری

رخصت ہوا جو ہند کے گلشن کا باغباں
مرجھائے گل ہیں آنکھ بھی بلبل کی نم ہے آج
— شاغل قادری

کس جانِ جاں کے سوگ میں دنیا ہے مبتلا
سونا ہر اعتبار سے کوئے صنم ہے آج
— نظر بھاگلپوری

گاندھی و ابوالکلام کے بعد اے مرے ندیم
فخرِ زمانہ یعنی جواہر کا غم ہے آج
— قمر بھاگلپوری

سارا جہاں ہے پیکرِ آلام و رنج و غم
وہ آسمانِ پیر نے توڑا ستم ہے آج
— میکش بھاگلپوری

سکتہ میں شیخ ہے تو برہمن اداس ہے
خاموش آہ مشعلِ دیر و حرم ہے آج
— راہی مجاہد پوری

دنیا سے چل بسے جو وزیرِ عظیم ہند
ہر دل ہے بے قرار ہر اک آنکھ نم ہے آج
— حکیم عبدالباقی

سنتے ہی مرگِ رہبرِ محبوب کی خبر
ہر ایک فرد پیکرِ رنج و الم ہے آج
— اشہر بھاگلپوری

دنیا کے حکمراں بھی تو دب چتا پہ ہیں
قدموں پہ مرنے والے کے جاہ و حشم ہے آج
— عرفان بمنڈیہی

ماتم کدہ ہے آج بنا صحنِ گلستاں
ہر پھول سوگ میں ہے کلی کو بھی غم ہے آج
— مسرور آروی

پیر و جواں سبھی کا کلیجہ ہے پاش پاش
ٹوٹا ہر ایک دل پہ وہ کوہِ ستم ہے آج
— نسیم آروی

ہندوستاں کی راہبری کے لیے غنیؔ
نہرو نہیں تو نہرو کا نقشِ قدم ہے آج
— غنی بھاگلپوری

نجیب رامش

جب ہری چوڑیاں ٹوٹتی ہیں ...."

جب بچے کی نازک باہیں اپنے ماں باپ کی گردن میں
اک پیار کے بندھن کے بدلے پھانسی کے پھندے ہو جائیں
جب بھائی کی سانسوں میں بھائی بارود کی بو محسوس کرے
تاریخ جہاں کے سادہ ورق جب خون سے گندے ہو جائیں
جب مخلص کے احسانوں کی قیمت تلوار کا پانی ہو
سب نازک رشتے دنیا کے جب گورکھ دھندے ہو جائیں
جب حرم اپاہج ہو جائے اور ہمدردی بھی شاپ بنے
اور کچھ ایسا پری ورتن ہو انسان درندے[1] ہو جائیں
اس وقت شرافت کہتی ہے اب خون بہانا جرم نہیں
خود اپنی حفاظت کی خاطر ہتھیار اٹھانا جرم نہیں

ہم دیکھ رہے تھے دنیا کی گرتی ہوئی اخلاقی قدریں
فطرت کو بیڑی پہنانے اڑتے ہوئے ظالم طیارے
طاقت کی ہوس میں قوموں کے انصاف کا قاتل بنتے ہوئے
تہذیب کی نازک کرنوں کو ڈستے ہوئے خونیں اندھیارے
ایٹم میں مجسم ہوتی ہوئی انسان کے سینے کی دوزخ
فصلوں میں اگتے ہوئے فاقے، باغوں میں دہکتے انگارے
سائنس کی لو میں جلتا ہوا انسان کا تابندہ ماضی
تہذیب کا فن سکھلاتے ہوئے تعمیر و ادب کے گہوارے
لیکن جب سیما پر ہم کو کچھ سفاکوں نے چھیڑ دیا
دنکر[1] کا نگ پتی جاگ اٹھا، پرساد[2] کا بھارت جاگ اٹھا

ہم جب بھی جاگے دنیا کو سندیس دیا تو جیون کا
کتنے ہی مہا پرش ابھرے ہیں موقع موقع کی نزاکت سے
لیکن جب خطرہ ہے سر پر، لیکن جب سرحد زخمی ہے
اک بھائی حملہ آور ہے ہم پر دو گز دھرتی کے لئے
جب آگ اگلتی ہیں توپیں ہم امن پرست انسانوں پر
تلوار کی دھاریں توڑ چکیں جب پیار محبت کے رشتے
جب ہری چوڑیاں ٹوٹتی ہیں لداخ کی کومل کلیوں کی
تب بدھ اور گاندھی نہیں، مگر پرتاپ سے خود سر جاگیں گے
جو اپنے دل کے ٹکڑوں سے یہ ہری چوڑیاں جوڑیں گے
اور ان کو توڑنے والوں کو پاتال میں بھی نہیں چھوڑیں گے

[1] رام دھاری سنگھ دنکر کی ہندی کی مشہور نظم 'ہمالیہ' کی طرف اشارہ ہے۔
[2] جے شنکر پرساد۔ نظم 'ہمالہ کے آنگن میں اسے پرتھم کرنوں کا دے اپہار' کی طرف اشارہ ہے۔

[1] یہ قافیہ غلط ہے۔ ع۔م

عبدالمجیب سہالوی

کاتب کی کرشمہ سازی

غالب نے اللہ میاں سے فریاد کی تھی کہ ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

غالب کو اللہ میاں سے شکایت تھی کہ دمِ تحریر ان کا کوئی آدمی نہیں تھا کہ وہ دیکھ سکتا کہ کراماً کاتبین غلط سلط ان کے اعمال نامے میں کیا لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن ہمارا تجربہ ہے کہ کاتب چاہے فرشتہ ہو چاہے انسان کبھی بالکل صحیح نہیں لکھ سکتا اور کچھ نہ کچھ ترمیم کرکے اپنی ٹانگ اڑانا ضروری خیال کرتا ہے۔

قریب انیس سال سے ہمارا اور کاتبوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ہم غالب کی طرح یہ بھی شکایت نہیں کر سکتے کہ ع

آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

ہمارا آدمی یعنی پروف ریڈر ہر وقت کاتبوں کے سر پر اسی طرح سوار رہتا ہے جس طرح کراماً کاتبین ہمارے کاندھوں پر، اور ہم بھی کچھ زیادہ دُور نہیں ہوتے۔ لیکن کاتب کی کرشمہ سازی کی کوئی کاٹ نہیں۔ فرشتہ کاتب اور انسان کاتب کی غلطی میں فرق یہ ہے کہ فرشتے کی غلطی کا خمیازہ آدمی کو آخرت میں بھگتنا پڑتا ہے اور اڈیٹر کو اپنے کاتب کی کرشمہ سازی کا جلوہ صبح ہی صبح صفحۂ اخبار پر نظر آ جاتا ہے۔

غالب کو صرف کاتب سے شکایت تھی ہمیں کاتب اور پروف ریڈر دونوں سے ہے۔ کاتب صاحب تو خیر بھول کر غلط لکھ جاتے ہیں۔ لیکن غضب یہ ہے کہ پروف ریڈر صاحب مارے قابلیت کے جان بوجھ کر صحیح کو غلط بنا دیتے ہیں جو کاتب کی غلطی سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم نے طے کر لیا ہے کہ چاہے کاتب کا غلط لکھا ہوا نہ پڑھیں لیکن پروف ریڈر کا صحیح کیا ہوا ضرور پڑھتے ہیں۔

اس عادت کی بنا پر ہمیں کاتب صاحبان کی کرشمہ سازیوں کے علاوہ پروف ریڈر صاحبان کی کچھ لرزہ خیز اصلاحوں کا بھی تجربہ ہوا ہے۔ فی الحال آپ کاتب صاحبان کی ستم ظریفیاں سنئے اور سر دُھنئے۔

غالباً یہی سردی کا زمانہ تھا کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ رات کی زلفیں بکھرنے کے بجائے سکڑ کر گدّی پر آ گئی تھیں اور وہ ٹیڈی گرل معلوم ہو رہی تھی اور ہر شخص ٹھٹھرا ہوا تھا۔ کاتبوں کی اُنگلیاں سخت سردی سے برف ہو رہی تھیں لیکن کتابت کی کرنٹ ان میں گرمی پیدا کر رہی تھی۔ ایک کاتب صاحب سردی کے مارے کسی بڑے بقراط مضمون نگار کا مضمون لکھ رہے تھے۔ مضمون جیسا تھا وہ تھا ہی لیکن خط اتنا خراب تھا کہ دیکھتے ہی ان کے بڑے آدمی ہونے کا یقین ہو جاتا تھا کیونکہ اب بدخط ہونا بڑے ہونے کی نشانی قریب قریب طے کر لیا گیا ہے غالباً اسی لئے مضمون نگار صاحب نے بدخط بن کر اپنے کو بڑا ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ کامیاب اس لئے کہ وہ بدخط ہونے میں

تمام بڑے آدمیوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

انھوں نے اپنے مضمون میں ایک جگہ سردی کا زور دکھاتے ہوئے لکھا تھا کہ 'سردی نے اپنی زمہریری چادر فضا میں پھیلادی' لیکن چونکہ سردی سے کاتب صاحب کی انگلیاں سکڑی ہوئی تھیں اس لئے وہ نہ تو 'زمہریری' لکھنے کی جرأت کر سکیں اور نہ 'چادر فضا میں پھیلا سکیں' اور انھوں نے ضروری ترمیم کر کے لکھ دیا کہ 'سردی نے اپنی زہر بھری چادر فضا میں پھیلادی'۔

ایک دوسرے کاتب صاحب معلوم نہیں کیوں بابر سے خفا تھے؟ شاید یہ وجہ ہو کہ بابر نے ہمایوں کے اچھے ہونے کی دعا کر کے اپنی جان دے دی لیکن اس نے یہ نہ کیا کہ لوگوں کا خط اچھا کرنے کی دعا کر کے کاتبوں کی جان مصیبت سے بچا لیتا۔ بہرحال جو وجہ ہو اُن کا قلم 'بابری فوج' لکھنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہوا اور انھوں نے مضمون نگار کی اجازت لئے بغیر 'بابری فوج' کی جگہ 'باہری فوج' لکھ دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ کاتب صاحب سے یہ غلطی اس وقت سرزد ہوئی جب مضمون نگار اور بابر دونوں کاتب صاحب کے ہاتھوں اپنی یہ درگت بنتے دیکھنے کے لئے اس دنیا میں موجود نہ تھے ورنہ کوئی تعجب نہ تھا کہ مضمون کی اشاعت کے بعد 'بابری فوج' اخبار کے دفتر پر دھاوا بول دیتی تو کاتب صاحب کو پتہ چلتا کہ وہ 'باہری فوج' نہیں 'بابری فوج' تھی۔

غالب نے اللہ میاں سے کراماً کاتبین کی کتابت پر ایک مرتبہ شبے کا اظہار کر کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے تمام کاتبوں کو خفا کر دیا اور اب وہ غالب کے مشہور سے مشہور شعر کو بھی بغیر کاٹ چھانٹ کے کبھی نہیں لکھتے۔ غالب کا مشہور شعر ہے ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ہمارے بعض کاتب صاحبان کاتب ہی نہیں بلکہ ماشاءاللہ شاعر بھی ہیں۔ چناں چہ جن کاتب صاحب کے پلّے غالب کا یہ شعر پڑا تھا وہ شاعر ہونے کے ناتے غالب کی اس خصوصیت سے کہ وہ اکثر انوکھی بات کہتے ہیں نہ صرف واقف تھے بلکہ اس پر انھیں سخت اصرار تھا اس لئے انھیں یہ بات پسند نہ آئی کہ عام لوگوں کی طرح غالب بھی 'خدا کی قدرت'، جو عام بول چال میں شامل ہے اپنے انوکھے کلام میں استعمال کریں اس لئے انھوں نے غالب سے معذرت کا اظہار کئے بغیر 'خدا کی قدرت' کے بجائے 'خدا کی مورت' کر دیا۔ جب غلطی کی طرف توجہ دلائی گئی تو نہایت فلسفیانہ انداز میں بولے: 'مورت میں بھی تو خدا ہی کی قدرت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے اس کے بعد ان سے کچھ کہنے کی کیا گنجائش تھی۔ توجہ دلا کر خود ہی شرمندہ ہوئے اور ٹوکنے کی معافی مانگی۔

ایک دوسرے کاتب صاحب کو ایک موقع پر غالب کا یہ شعر ؎

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

لکھتے وقت یہ اعتراض پیدا ہو گیا کہ اس میں عاشق کے گریبان کے لئے صرف 'چار گرہ' کی ناپ رکھی گئی ہے۔ جو بالکل ناکافی ہے۔ کیوں کہ یہ اُس زمانے کی ناپ ہے جب لوگ عشق میں مبتلا ہو کر صحرا نوردی کرتے تھے اور مجنوں کی طرح سوکھ کر کانٹا ہو جاتے تھے۔ لیکن اب تلاشِ روزگار کے سلسلے میں فرصت نہ ہونے کی وجہ سے ایسے لوگوں نے عشق کرنا چھوڑ دیا ہے جنھیں پیدل صحرا نوردی کرنی پڑے اور سوکھ کر کانٹا ہوں۔ اب یہ کارِ خیر ان لوگوں نے اپنے سر لے لیا ہے جن کے پاس کار بھی ہے اور ٹہل ٹہل کر سرد آہیں بھرنے کے لئے گھر کے سامنے لان بھی۔ اس لئے وہ صحرا نوردی کرنے کے بجائے صرف موٹر پر تفریح کرتے اور کراتے ہیں۔ ان کے لئے عشق ٹانک کا کام کرتا ہے اور وہ غمِ عشق میں دبلے ہونے کی جگہ موٹے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ان کے گریبان کی ناپ چار ہی گرہ رکھی گئی تو گردن اتنی کس جائے گی کہ خطرناک نتائج برآمد ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے انھوں نے غالب سے معذرت کے ساتھ شعر میں ترمیم کر کے 'چار گرہ' کی جگہ 'چار گز' کر دیا تاکہ گلا کسنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

ایک کاتب صاحب کافی اپ ٹو ڈیٹ آدمی ہیں اور چونکہ کوٹ پتلون سے ہر وقت لیس رہتے ہیں اس لئے فرش پر بیٹھ کر کتابت کرنے کی جگہ کرسی پر ٹیک لگا کر کتابت کرتے ہیں۔ اُن کی زبانِ قلم پر جب یہ شعر آیا ؎

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

تو زبانِ قلم نے بوریا لکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ کیوں کہ اس سے نہ صرف غالب کی ہتک ہوتی تھی بلکہ بوریئے پر چلنا خود ان کے قلم کو سخت ناگوار تھا اس لئے انھوں نے غالب کی بے سروسامانی پر پردہ ڈالنے کے لئے یہی مناسب خیال کیا کہ 'بوریا' کے بجائے 'تولیا' کر دیا جائے تاکہ اگر غالب کسی کی آمد آمد سے گھبرا کر اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھنا چاہیں تو کوئی دقت نہ ہو اور بوریئے کی بدنمائی بھی شعر سے دور ہو جائے۔ رہا تولیئے کا گھر میں نہ ہونا، تو یہ کوئی توہین کی بات نہیں کیونکہ دھوبی غالب کے زمانے میں بھی کپڑے دیر سے لانے اور کھو دینے کے عادی تھے اور اب بھی ہیں اس لئے گھر میں تولئے کا نہ ہونا یا میلا ہونا اتنا بُرا نہیں جتنا گھر میں بوریئے کا ہونا یا نہ ہونا ہے۔

کاتب صاحبان کو غالب سے جتنی پرخاش ہے اتنا ہی مجھے غالب کے اشعار نقل کرنے کا شوق ہے۔ چناں چہ میں نے کتابت کے لئے ایک اور مضمون دیا جس میں غالب کا یہ شعر کسی موقع پر نقل کیا گیا تھا ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

میں غالب کے معاملہ میں کاتب صاحبان کی ہمدردی سے واقف تھا اس لئے میں نے کہا کہ جلد لکھ کر لایئے مجھے جانا ہے۔ میں مضمون دیکھ کر جاؤں گا۔ وقت کم تھا اس لئے کاتب صاحب باوجود کوشش کے شعر میں کوئی خاص ترمیم نہ کر سکے مگر چپکے سے تخلص کا تاج غالب کے سر سے اُتار کر آتش کے سر پر رکھ دیا اور یہ چوری اتنی خاموشی سے کی گئی کہ پروف ریڈر صاحب کو بھی اس کا پتہ نہ چلا اور ہم بھی تیزی سے پڑھ گئے۔ لیکن خلافِ عادت جب غالب کو ننگے سر دیکھا تو ہم چونک پڑے اور چوری کھل گئی۔ ہم کاتب صاحب کی اس فن کاری پر خفا ہونے کے بجائے خوش ہوئے اور پاس بلا کر انھیں کے ہاتھوں غالب کی تاج پوشی کی رسم ادا کرائی۔ غالب کے بقول ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

کاتب صاحب کے ناوک کا شکار تنہا غالب ہی نہ تھے بلکہ میر پر بھی کاتب صاحبان کبھی کبھی نظرِ عنایت کر دیتے ہیں لیکن بہت معمولی یعنی میر کی جگہ کبھی تمیر یا پیر لکھ دیتے ہیں۔ جہاں تک ان کے اشعار میں ترمیم کا تعلق ہے اس کا ہمیں کم تجربہ ہے۔ کیونکہ ہمیں بدقسمتی سے میر صاحب کے اشعار بہت کم یاد ہیں۔ اس لئے ہم نقل بھی کم کرتے ہیں۔ اتفاق سے ایک مرتبہ یہ شعر یاد آگیا اور ہم نے لکھ دیا ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اُن کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

تو کاتب صاحب نے یہ ستم کیا کہ 'اُنکی' زلفوں کو 'اپنی' زلفوں سے بدل کر شعر کی ساری رنگینی خاک میں ملا دی۔ جب کہا کہ یہ کیا غضب کیا تو فرمانے لگے کون ہے جو 'اپنی' یعنی 'خودی' کی زلفوں میں اسیر نہیں۔ خیر میں نے تو کاتب صاحب کی یہ کٹھ حجتی برداشت کر لی لیکن اگر خدانخواستہ میری جگہ میر صاحب ہوتے تو یقین کیجئے کہ کاتب صاحب کی زلفوں کی خیر نہ تھی۔

ایک کاتب صاحب جو شاید شاعری کو شیطانی فعل سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ شاعر اپنے اصلی نام کے بجائے فرضی نام سے صرف اس لئے شاعری کرتے ہیں کہ جب میدانِ حشر میں پکارا ہو تو ان کا پتہ ہی نہ چلے۔ ورنہ تخلص کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ اسی لئے تخلص لکھتے وقت وہ صحت کا کوئی خیال نہیں رکھتے۔ ایک مرتبہ وہ جگر صاحب پر کوئی مضمون لکھ رہے تھے جس میں کئی جگہ 'جگر مراد آبادی' کا لفظ آیا تھا اور وہ ہر جگہ جگر مراد آبادی کی جگہ 'جگ مراد آبادی' لکھ گئے تھے۔ میں نے دیکھا تو سرپیٹ

لیا اور کہا کہ آپ نے جگر صاحب پر کیوں ظلم کیا۔ فرمانے لگے میں نے ظلم کیا کہ جگر صاحب نے۔ جگر صاحب مراد آباد میں پیدا تو ضرور ہوئے لیکن قیام ہمیشہ گونڈے میں رہا اور جگ مراد آباد میں پیدا بھی ہیں اور مشہور بھی ہیں اس لئے مراد آبادی کہلانے کا حق جگر صاحب سے زیادہ جگ کو ہے۔ میں نے کہا ایسی ہی ضد تھی تو مراد آبادی نکال دیا ہوتا۔ کہنے لگے اس سے تو بڑا کھانچا پڑ جاتا۔ اس میں تو صرف جگر کی 'ر' کو گھسیٹ کر جگ بنا دیا۔

شروع شروع میں جب سونا کنٹرول قانون لاگو ہوا اور روزانہ 'سوناروں کی ہڑتال' 'سوناروں کی ستیہ گرہ' اور 'سوناروں کے جلوس' کی خبریں لکھتے لکھتے کاتبوں کا قلم سوناروں پر خوب رواں ہو گیا تو اتفاق سے اسی زمانے میں کہیں سے سوکارنو صاحب کے پُر جوش خیر مقدم کی خبر بھی آ گئی۔ پھر کیا تھا۔ کاتب صاحب کے قلم نے 'سوکارنو کے بجائے سوناروں' کا وہ پُر جوش خیر مقدم کیا کہ ہم پڑھتے ہی کرسی سے اچھل پڑے۔ خیریت ہوئی کہ اس وقت کوئی تھا نہیں ورنہ کاتب صاحب کے علاوہ ہمیں بھی شرمندگی ہوتی۔

شاعروں اور لیڈروں کے ناموں کے علاوہ کاتب صاحب کا قلم آفت رقم الفاظ پر بھی کم ستم نہیں ڈھاتا۔ 'جمعیۃ الوداع' کو جمعیۃ العلماء، اگر افشانی کو ربیع الثانی، برشگال کو پرتگال اور بہنوئی کو بھنوئی بنا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

ایک مرتبہ تو کاتب صاحب کے قلم اعجاز رقم نے وہ معجزہ دکھایا کہ ہم لوگ دنگ رہ گئے۔ ریاستی حکومت کے ایک بہت نیک نام اور سینئر اعلا افسر کے انتقال کی خبر آئی جس میں لکھا تھا کہ پس ماندگان میں ان کے ایک صاجزادے 'زیرِ تعلیم' ہیں۔ لیکن کاتب صاحب کو اتنے سینئر افسر کے صاجزادے کا ابھی تک زیرِ تعلیم رہنا پسند نہ آیا اور انھوں نے حکومت سے مشورہ لئے بغیر بہ یک جنبشِ قلم انھیں 'وزیرِ تعلیم' بنا دیا جو ہم لوگوں کے لئے خوش گوار لیکن حیرت انگیز انکشاف تھا۔

اسی طرح ایک مضمون میں کسی مصور کی تعریف کرتے ہوئے مضمون نگار نے لکھا تھا کہ وہ متعدد شاہ کاروں کا خالق تھا لیکن 'بیروزگار' تھا۔ کاتب صاحب چوں کہ خود فن کار تھے اور باروزگار تھے اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آئی کہ متعدد شاہ کاروں کا خالق 'بیروزگار' بھی ہو سکتا ہے اس لئے قلم کے ایک ہی وار سے 'بیروزگار' کو 'پروردگار' بنا دیا۔

غالباً اسی لغزش سے خفا ہو کر اللہ میاں نے کاتبوں کو 'نقل راچہ عقل' کی بددعا دے دی۔ لیکن اس بددُعا کا اثر عقل اور نقل دونوں پر پڑا۔ یعنی نہ تو وہ عقل سے کام لیتے ہیں اور نہ نقل مطابق اصل کرتے ہیں۔

مضمون نگار حضرات سے

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھئے

۲۔ اپنا ایڈریس نہایت صاف اور خوش خط لکھئے

۳۔ غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ ڈاک کے ٹکٹ اور مناسب سائز کا لفافہ ہو گا۔

(ادارہ)

سودیش دیپک

اندھیرے کا سیلاب

بند دروازے کے سوراخوں سے روشنی کی لکیریں میلے فرش پر بچھ گئی ہیں۔ بستر میں جاگا بیٹھا کب سے انتظار کر رہا ہوں، ہوٹل والا چائے لائے تو اٹھوں۔ تکونے کمرے پر نگاہیں ڈالتا ہوں۔ رات کو سوچ کر سویا تھا کہ صبح اسے صاف کروں گا۔ اب ارادہ بدل لیا ہے اچھا، اگر صفائی کی بھی جائے تو اس کمرے کی شکل و صورت میں کیا فرق آجائے گا؟ ہاں اگر یہ تکونے سے چوکور ہو جائے...... سر جھٹک کر اس بات کو سوچنا بند کر دیتا ہوں۔ چائے پینے سے پہلے ایسی ہی واہیات باتیں دماغ میں اتھل پتھل مچائے رہتی ہیں۔

چائے والا پورا دروازہ کھول کر اندر آتا ہے۔ مکان سڑک پر ہے۔ سامنے سڑک پر گندے غلیظ بچے دھوپ میں پڑی چارپائیوں پر بیٹھے، ادھ لیٹے، ریں ریں کر رہے ہیں۔ اس علاقے میں غلطی سے بھی کوئی مسکراتا بچہ شاید ہی دیکھا ہو۔

"دروازہ بند کرتے جانا۔"

چائے والے سے کہتا ہوں۔

وہ آنکھوں آنکھوں میں مسکراتا باہر چلا جاتا ہے۔ یہ مسکراہٹ میں نے محلے کے سب لوگوں کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔ میرا نام انھوں نے "بند دروازے والا صاحب" رکھا ہے۔

چائے کی چُسکی بھر لیتا ہوں۔ ایک پیالے میں آٹھ پیالیوں کی مقدار سے کم شیرینی کیا ہو گی۔ اب؟ اچھا اسے اب ٹھنڈا ہو لینے دو۔ ایک ہی گھونٹ میں پی ڈالوں گا۔ دوائی تو کبھی پینی ہی پڑتی ہے۔

پیلی پیلی دھوپ پورے کے پورے فرش پر لیٹ گئی ہے۔ گندے فرش پر پھیلی دھوپ کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ کسی سڑتے ہوئے پانی کے گندے تالاب کا خیال آجاتا ہے۔

پڑوس والے ریڈیو زور سے بجاتے ہیں۔ ہندی میں خبریں ہو چکی ہیں۔ اب وہی پنجابی میں ہو رہی ہیں تو آفس کا ٹائم ہونے کو ہے۔ خبریں ختم ہونے کا مطلب دفتر کی تیاری۔

جس کی جگہ عارضی کام ملا ہے۔ وہ مہینے بعد آجائے گا ___ پھر؟ آگ لگاؤ۔ ابھی مہینہ پڑا ہے۔

"ماسٹر جی نمستے" کا جواب دیتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچتا ہوں ___ آپ؟"

"ہاں بھائی! ایمرجنسی کی وجہ سے میری چھٹی کینسل ہو گئی ہے اس لئے آج جوائن کرنے آگیا ہوں۔"

"لیکن آپ تو مہینے بعد ___"

"ہاں، بتایا نا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ آپ چارج سنبھال لیں۔"

دفتر کے لوگ جو مجھ سے ہندی پڑھتے ہیں۔ باہر آ گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے پرانے ماسٹر جی کو آتے دیکھ لیا تھا جس کا مطلب تھا ___ نئے ماسٹر کی چھٹی۔

سب کہتے ہیں، ملتے رہا کریں - ہمیں آپ بہت یاد آئیں گے وغیرہ وغیرہ - میں بھی کہتا ہوں —— مجھے بہت یاد آئے گی آپ کی، وغیرہ وغیرہ -

باہر آ جاتا ہوں - مسکرا کر سوچتا ہوں کہ اس سر درد سے چھٹی ملی کہ مہینے بعد کیا ہوگا - نہیں تو پورا مہینہ دماغ میں کیڑا سرسراتا رہتا -

پیچھے سے چپڑاسی آواز دیتا ہے - "آپ کی چٹھی ماسٹر جی! اور کوئی آئے گی تو گھر پہنچا دوں گا -"

سگرٹ سلگاتا ہوں - ایک اُسے دے کر آگے بڑھ جاتا ہوں -

خط ایک نگاہ میں پڑھ جاتا ہوں - چھوٹی منّی نے جو پانچویں درجے میں پڑھتی ہے - لکھا ہے کہ چاچا جی سرگباش ہو گئے ہیں سب وہاں گئے ہیں اس لئے وہ خط لکھ رہی ہے -

خط کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیتا ہوں - بے وقوف! تین چاچا ہیں - اب کس کی موت ہو گئی ہے؟ کیا معلوم - یاد بھی نہیں پڑتا کہ کسی ایک کے بیمار پڑنے کی خبر پہلے گھر سے آئی تھی -

غبار آہستہ آہستہ کم ہو جاتا ہے - ہوگا تینوں میں سے کوئی ایک - کوئی بھی ہو - میں کیا کر سکتا ہوں؟

بازار میں ورما مل جاتا ہے - پرانا دوست ہے - "چلو یار! گھر تک چلیں - میں بھی آج آفس نہیں گیا -"

سوچتا ہوں، اُسے بتاؤں، میری نوکری چلی گئی ہے - پھر خیال آتا ہے، اُسے بتا کر کیا ہوگا؟

ورما کی نئی نئی شادی ہوئی ہے - شادی سے پہلے اس کی بیوی نے میری کچھ کہانیاں پڑھی تھیں - بے چاری میری عزت کرتی ہے - وہ جب بھی کمرے میں آکر مجھے نمستے کرتی ہے تو ورما کی آنکھوں میں ہمیشہ ناراضگی تیر جاتی ہے - وہ اُسے کسی نہ کسی کام سے رسوئی میں بھیج دیتا ہے -

ایک بار اُسے بیوی سے کہتے سنا تھا کہ وہ میری موجودگی میں کمرے میں ذرا کم ہی آیا کرے - بیوی نے جب دلیل پیش کی تھی کہ میں ان کا دوست ہوں، ایک اچھا لکھک ہوں تو ورما کے جواب کا آدھا حصہ ہی کان میں پڑا تھا —"ان لوگوں کا کیرکٹر ......"

اس کے بعد میں ورما کے گھر کم ہی گیا - اب سگرٹ سلگانے کے لئے ماچس نکالتا ہوں - خالی —

"ماچس ورما!"

وہ رسوئی میں جا کر بیوی سے ماچس مانگتا ہے — "ایک تیلی دے دو - خالی ماچس اس کے پاس ہے -"

اس کی بیوی شاید اعتراض کرتی ہے - "یہ بُری بات ہے!"

"نہیں ایک ہی تیلی دے دو - ان لوگوں کو تم نہیں جانتیں ماچس جیب میں ہی رکھ لے گا -"

میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں -

"ارے! تم چلے - بیٹھو - چائے ......"

"نہیں -"

میں باہر نکل آتا ہوں - ایک رکشا والے سے ماچس مانگ کر سگرٹ سلگاتا ہوں -

بیوی اور دوستوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں لیکن اس سے اچھا کام صدر بازار کی دکانوں کے بورڈ پڑھنا ہے - یہ کام اتنی بار کر چکا ہوں کہ بورڈوں کے کونوں پر چھوٹا سا لکھا ہوا پینٹر تک کا نام یاد ہے -

پاس سکوٹر آکر رکتا ہے - پروفیسر شرما ہیں - نمستے کرتا ہوں -

"کیوں بھائی! آج آفس ......"

"وہ نوکری ختم، سر!"

"اچھا — کوئی کہانی وانی لکھی کہ نہیں؟ لکھو تو مجھے ضرور دکھانا اچھا ٹائم کٹ جاتا ہے -"

وہ جھٹ سے سکوٹر سٹارٹ کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں -

ہونہہ! نوکری کی بات کا اثر ہی نہیں - بس ٹائم اچھا کٹنا چاہیئے -

اب کیا کیا جائے؟ جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں - ریزگاری کافی ہے - ایک سرے سے شروع کر کے اگر ہر دکان پر چائے پینا

شروع کردوں اور ایک کپ پر آدھا گھنٹہ لگایا جائے تو کافی ٹائم گزر سکتا ہے۔

تھوک کے حساب سے چائے پینا شروع کر دیتا ہوں لیکن بھلا دماغ سوچنا بند کرتا ہے؟ کون سا چاچا مرا ہوگا؟ نوکری کے بغیر کیسے چلے گا؟ خرچ کم کرنا چاہیئے۔ آج کی چائے میں ہی....
جھٹ سے انگریزی کا محاورہ یاد کرتا ہوں — 'وَیل ڈیئر ڈونٹ بی پینی وائز پاؤنڈ فلش'
اور چائے کا پروگرام باقاعدہ جاری رکھتا ہوں۔

چائے والے بھی کچھ پہچان گئے ہیں۔ مالک چھوکرے سے کہتا ہے:

"صاحب آئے ہیں — ایک دم سٹرانگ چائے — ایک سو بیس میل کی — دم کی مافِک" (موافق)

چائے بھی کتنی پی جا سکتی ہے؟ بِمّی کے پاس کیوں نہ چلا جائے؟ پر نہیں۔ اس سے تو اچھا خاصا جھگڑا ہو چکا ہے۔ پھر دو دن ہی پہلے اس کی چھوٹی بہن انیتا کی شادی ہوئی تھی۔ اس میں بھی تو نہیں گیا۔

کیا بِمّی سچ مچ اتنی بدصورت ہے، یا کہ دوست یونہی مذاق کرتے ہیں۔ دوستوں کا کہنا ہے کہ میں دیکھنے سننے میں کافی اچھا ہوں۔ اس معمولی سی' کالی سی' لڑکی سے میرا میل جول انہیں عجیب لگتا ہے۔ وہ ہمیشہ کہتے ہیں — ان رائٹروں سے خدا بچائے۔ کہانیوں کی ہیروئن تو یوں کتابی چہرے والی ہوگی — اور اصلی ہیروئن! توبہ!!

ویسے بِمّی کالی سہی، یونہی سہی۔ پر جانے مجھے کیوں اچھی لگتی ہے؟

کچھ دن پہلے کی باتیں یاد کر رہا ہوں — وہ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے دو تین بچے ٹیوشن پڑھنے آئے تھے۔ وہ کچھ بیمار تھی۔

"تو انہیں آج واپس کیوں نہیں بھیج دیتی؟"

"واہ —! ان کی ممّی جلدی بھیجنے پر ناراض نہ ہو جائے گی؟"

وہ بچوں سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھنا شروع کر دیتی ہے۔

پنجاب کی راجدھانی؟ "چنڈی گڑھ"

بھارت کے اُپ راشٹرپتی؟ "ڈاکٹر ذاکر حسین"

"ذاکر — ذاکرُ نہیں — ذاکِر حسین — اچھا آنٹی"

کانچ کے برتن، کس سے صاف کرتے ہیں؟ 'دِم سے'

میں بیچ میں بول پڑتا ہوں — ایک کپ چائے بِمّی!

وہ وہیں سے بیٹھے بیٹھے آواز دے کر موسی کو چائے لانے کے لئے کہتی ہے۔ میں اسے انگریزی میں کہتا ہوں کہ بچوں کو چھٹی کرے۔

وہ کہتی ہے — "بس تھوڑی دیر اور"۔

آخر بچے اپنے چھوٹے چھوٹے سینے تان کر چین کے خلاف ایک گیت گاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

چائے آجاتی ہے۔ بِمّی اپنا سر خود دبا رہی ہے۔

"درد ہے؟"

"ہونہہ"

"کوئی دوا پی لی ہوتی۔"

"اچھا۔"

میں کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں — اس سے شادی کی بات کروں۔

لیکن یہ میری عادت یا کمزوری ہے کہ بات کو ہمیشہ غلط زاویے سے شروع کرتا ہوں۔

"انیتا کی شادی کب ہو رہی ہے؟"

"اگلے ہفتے"

کام وام تو بہت ہوگا۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ۔

آپ! آپ کام کریں گے؟ وہ آہستہ سے ہنس دیتی ہے۔

مجھے اس کی یہی عادت پیاری لگتی ہے۔ کیسے مجھے پورا کا پورا بدّھو سمجھتی ہے۔ سوچتا ہوں، اپنی بات کہہ دوں۔

"اچھا، تم شادی کب کر رہی ہو؟ اب انیتا کی شادی

کے بعد تمھاری ذمہ داریاں ختم۔"

"کروں گی۔ آپ کو کیا چنتا ہے؟"

اب آگے کیا کہوں — سیدھی طرح کیوں نہیں کہہ دیتا —

"تم مجھ سے شادی کب کر رہی ہو؟"

"تم کیا سوچتی ہو؟ تمھارے لئے کوئی خاص بڑا آدمی کہیں سے آئے گا؟

وہ سمجھتی ہے۔ "تمھارے لئے" میں نے اس کے رنگ روپ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بُرا مان جاتی ہے۔

"ہاں بڑے آدمی کا ہی انتظار ہے۔ میں تو کسی ملٹری آفیسر سے شادی کروں گی 'ایسے ویسے' سے نہیں۔"

'ایسے ویسے' کا مطلب میں بخوبی سمجھتا ہوں۔ اس نے مجھے ہی نشانہ بنایا ہے۔ چپ رہ جاتا ہوں۔

"آپ کب شادی کریں گے؟"

"کروں گا — کسی ایسی لڑکی کا انتظار ہے جو بیس تیس ہزار جہیز میں لائے۔"

وہ اداس ہو جاتی ہے۔ معمولی سا چہرہ اور بھی معمولی ہو جاتا ہے۔

"اپنے آپ کو لیکھک کہتے ہیں۔ پھر بھی جہیز کی بات۔"

"لیکھک ہوں تو یہ کب لکھا ہے کہ جہیز نہیں لینا چاہیئے۔"

وہ چُپ — میں چُپ۔

"اچھا" — میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔

وہ باہر تک چھوڑنے آتی ہے۔ رک کر اس سے پوچھتا ہوں۔ "تم نے منّو بھنڈاری کی تپ دق پڑھی ہے۔"

"ہاں۔"

'تمھیں وہی ہو گیا ہے۔' اور تیز تیز قدموں سے چل دیتا ہوں۔

اب خیال آ رہا ہے۔ اتنی کڑی بات نہیں کہنی چاہیئے تھی۔ چلوں۔ پھر بمّی کے ہاں ہی چلوں — چھوٹی انیتا کے بیاہ کے بعد کتنی اداس ہو گی۔

موسی جی دروازہ کھولتی ہیں۔ سامنے چارپائی پر کمبل اوڑھے بمّی سو رہی ہے۔ موسی بتاتی ہیں کہ انیتا کی شادی کے بعد اسے زوروں سے بخار آ گیا ہے۔ عموماً بے ہوش سی رہتی ہے۔ موسی چائے لاتی ہیں۔

"کہو تو بمّی کو جگاؤں۔ ویسے کچھ ہی دیر پہلے سوئی ہے۔ بچّے پڑھنے آئے تھے۔ واپس بھیج دئے ہیں۔"

موسی کم ہی بولتی ہیں۔ آج میرے پاس بیٹھ جاتی ہیں۔

"سنو، اس دن تم بمّی سے جھگڑے تھے کیا؟ روتی رہی۔ تب سے بیمار ہے۔"

"نہ موسی!"

"اچھا۔"

بیٹھے بیٹھے کئی پرچے پڑھ جاتا ہوں۔ کبھی کبھی نظر اُٹھا کر بمّی کو دیکھ لیتا ہوں۔ زور زور سے سانس لے رہی ہے۔

ڈھلتے سورج کی کمزور کرنیں چق سے چھن چھن کر اندر پھیل رہی ہیں۔ مدّھم مدّھم۔

کچھ آواز سی سنائی پڑتی ہے۔ بمّی شاید جاگ پڑی ہے۔ کُرسی چارپائی کے پاس کر لیتا ہوں۔ پر نہیں۔ وہ تو بدستور سوئی پڑی ہے۔

آواز پھر آتی ہے۔ دھیان دے کر سنتا ہوں۔ بمّی بڑبڑا رہی ہے۔ آگے جھکتا ہوں۔

"اچھا بچّو! پنجاب کی راجدھانی کا کیا نام ہے؟"

"بھارت کے اُپ راشٹرپتی کون ہیں؟"

"کانچ کے برتن کس چیز سے صاف کئے جاتے ہیں؟"

"چین کے خلاف کوئی کوتا سناؤ — پھر چھٹّی۔"

وہ چپ ہو جاتی ہے۔ میں بیٹھا ہوں۔ خاموش۔ بے بس۔ محسوس ہوا کہ کوئی بہت تیز ہتھیار جسم کے آر پار گزر گیا ہے گزر رہا ہے۔

اُٹھ کر چل دیتا ہوں۔ ہاں اس راجکماری کو قید سے چھڑانے کوئی ملٹری آفیسر چمچماتی وردی میں کب آئے گا؟ اب سچ سچ اس پر ایمان لے آتا ہوں کہ بمّی کو پورا کا پورا منّو بھنڈاری والا

تپ دق ہو گیا ہے۔

کمرے میں پہنچ کر چپ چاپ پڑ رہتا ہوں۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ بجلی کیا جلانی ہے ؟

دروازے پر کھٹ کھٹ ہوتی ہے۔ اوپر والوں کی بچی پنکی ٹافی لینے آئی ہے۔

"انکل تم اندھیرے میں بیٹھے ہو ؟"

"ہاں، بیٹا !"

وہ سٹول پر چڑھ کر بجلی جلا دیتی ہے۔ پنکی کانونٹ میں پڑھتی ہے۔ بڑی پیاری انگریزی بولتی ہے۔

سیڑھیوں پر سے گر پڑی تھی۔ لنگڑا کر چلتی ہے۔

"انکل! آج ممی ڈیڈی سے کہتی تھیں کہ پنکی بڑی ہو جائے گی تو کیا ہوگا؟ اس لنگڑی سے کون شادی کرے گا ؟"

"ہونہہ"

"کیوں انکل! کیا لنگڑی لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی ؟"

"ہوتی ہے بیٹا !"

پنکی میز پر سے سگرٹ اٹھا کر مجھے دیتی ہے۔

"ڈونٹ یو سیم ٹو بی اپ سیٹ انکل"

"ہاں بیٹا !"

"اچھا تو میں چلتی ہوں۔"

"اچھا بیٹا۔"

"کھڑکی بند کر دوں انکل! اندھیرا اندر آ رہا ہے۔"

"نہ بیٹا! کھڑکی سے اندھیرا تھوڑا آتا ہے۔"

"ڈونٹ مائنڈ اِٹ انکل! یو آر سِلی۔! جب تم مجھے کہتے ہو۔ کھڑکی بند کرنا پنکی! دھوپ آ رہی ہے۔ تب اندھیرا بھی تو کھڑکی سے ہی اندر آتا ہے۔"

"اچھا بیٹا۔"

وہ کھڑکی بند کر کے لنگڑاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

دروازہ بند — کھڑکی بند — پھر بھی اندھیرے کا سیلاب ہے کہ امڈتا ہی چلا آتا ہے۔

پڑوس والے ریڈیو لگا دیتے ہیں۔ کوئی غزل گا رہا ہے:

کیسے کہہ دوں کہ ملاقات نہیں ہوتی
ملتے رہتے ہیں مگر بات نہیں ہوتی

دوسرا مصرع بار بار دہرایا جا رہا ہے۔ ملتے رہتے ہیں مگر بات نہیں ہوتی — مگر بات نہیں ہوتی — بات نہیں ہوتی — نہیں ہوتی۔

چاول کی ملوں میں کام آنے والی مشینیں

مرکزی وزیرِ خوراک شری سی سبھرامنیم نے ملک میں چاول کی ملوں میں کام آنے والی مشینیں تیار کرنے والوں کو یقین دلایا کہ انھیں جدید ترین مشینری کی تیاری کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ انھوں نے بمبئی کی چاولوں کی ملوں کی مشینری تیار کرنے والوں کی انجمن کے نمائندوں سے جنھوں نے وزیر موصوف سے ملاقات کی، کہا کہ سرکار کی پالیسی گھریلو صنعتوں کی ہر ممکن طریقے سے حوصلہ افزائی ہے۔

شری سبھرامنیم نے کہا کہ سرکار باہر سے صرف چھ جدید یونٹ منگا رہی ہے۔ ان یونٹوں سے رہنمایانہ کام لیا جائے گا اور ان کے کام کا اندازہ کیا جائے گا۔ یہ اس لئے نہیں کہ کل مشینری باہر سے ہی منگائی جائے۔ بلکہ ان کے کامیاب ہونے کی صورت میں پہلی کوشش یہ ہوگی کہ یہ دیکھا جائے کہ ہمارے ملک میں اس میں سے کس قدر سامان تیار ہو سکتا ہے تاکہ اشد ضروری حصے ہی باہر سے منگوائے جائیں۔

ابراہیم اختر

ہری نارائن آپٹے

مرہٹی کا ایک ممتاز ادیب

۸ - مارچ ۱۸۶۴ء کو ضلع خاندیش کے ایک چھوٹے سے گاؤں پاروڑہ میں مرہٹی زبان کے عظیم فن کار ہری نارائن آپٹے پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام نانا صاحب تھا جو بڑے مذہبی اور پرانے خیالات کے آدمی تھے۔ ہری نارائن نے بمبئی اور پونا میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور ۱۸۸۳ء میں میٹرک پاس کیا۔ دورانِ تعلیم ہی انھوں نے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں سیکھ لیں اور یورپ کے ممتاز اہلِ قلم مثلاً رینالڈس، ملٹن، شیکسپیئر، سکاٹ، شیلے، کیٹس، مولئیر، ڈکنز، جین آسٹن کی کتابوں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا اور اسی زمانہ میں انھوں نے رینالڈس کے ناول 'اولڈ لنڈن' کا مرہٹی میں 'بوسیدہ قدریں' کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس طرح انھوں نے ادبی میدان میں پہلا قدم رکھا۔ اس کے بعد لانگ فیلو کی ایک نظم 'سانگ آف لائف' کا بڑی آسان اور سلیس مرہٹی میں ترجمہ کیا۔ مغربی ادب کے مطالعہ نے ہری نارائن کو نئی راہ دکھائی اور بڑی تیزی سے ان کا ذہنی ارتقاء ہوا۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں انھوں نے سنسکرت کے ایک عالم سے سنسکرت میں مہارت پیدا کر لی اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بنگلہ زبان بھی سیکھ لی اور بنگلہ ادبیات کا کافی مطالعہ کیا۔ ۱۸۸۵ء سے ان کی مستقل ناول نگاری کا دور شروع ہوا اور بیشتر مضامین کہانیاں اور ناول لکھ کر انھوں نے مرہٹی ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔

آج تک مرہٹی زبان میں ہری نارائن آپٹے کے مقابل کوئی دوسرا ادیب پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کو ہمیشہ ادق اور کٹھن زبان سے بچائے رکھا۔ ان کی زبان بڑی لطیف، سادہ، سلیس اور خوب صورت ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی ان کی تحریروں کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہری نارائن عوام اور خواص دونوں میں مقبول ہیں۔ وہ ہری نارائن کی سادہ، سلیس اور پُرخلوص زبان ہی تھی جس نے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا۔ ورنہ وہ زبان دانی کے زعم میں مشکل اور ادق زبان کا سہارا لیتے تو آج بیشتر مرہٹی بولنے والے ان کے نام سے مانوس نہ ہوتے۔

ہری نارائن کے دل میں دیش بھگتی اور قوم کی خدمت کا بے پناہ جذبہ تھا۔ ان کی اس تڑپ اور خلوص کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس وقت وہ میٹرک میں تھے۔ اسکول کے دو مدرسین بلونت راؤ تلک اور گوپال راؤ کو اخبار 'کیسری' میں قابلِ اعتراض مضمون لکھنے کے سلسلے میں گرفتار کر لیا گیا۔ ہری نارائن اور ان کے ساتھیوں نے جگہ جگہ چلے گئے، گھر گھر گھوم کر مقدمہ لڑنے کے لیے اخراجات اور ان کی مدد کے لئے پیسہ پیسہ جمع کیا۔ اس دوڑ دھوپ اور کش مکش میں ان کی تعلیم پر بُرا اثر پڑا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہری نارائن اس

سال میٹرک میں ناکام ہو گئے۔ اپنے اس نقصان کا ان کو بالکل افسوس نہیں ہوا اور انھوں نے اپنی ہمت پست نہ ہونے دی۔ ہری نارائن کے دل میں ملک کو غلامی سے آزاد کرانے اور ہندوستانی قوم کی گرتی ہوئی حالت کو سدھارنے کا جذبہ دن بدن پروان چڑھ رہا تھا۔ اپنے اس عزم کو ملک کے کونے کونے تک پہنچانے کے لئے انھوں نے قلم اٹھایا۔

۱۸۹۰ء میں ہری نارائن نے ایک ہفتہ وار اخبار 'مشغلہ' جاری کیا۔ اس اخبار میں وہ برابر انگریزوں کے خلاف مضامین شائع کرتے رہے۔ انھیں عوام کی گرتی ہوئی حالت کا بڑا دکھ تھا۔ اس لئے وہ ہندوستان سے غریبی اور جہالت دور کرنے، نئی اور طاقتور بنیادوں پر نئے سماج کی تعمیر کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ اس اخبار کی وجہ سے وہ ہمیشہ مالی مشکلات میں مبتلا رہے اور اپنی لکھی ہوئی کتابیں بیچ بیچ کر اخبار کو جاری رکھا اور اپنے نصب العین کی خاطر بڑے سے بڑا نقصان بھی برداشت کیا۔ ان کی باغیانہ تقریریں انگریز سرکار کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگیں اور اس نے ہری نارائن کی تمام تخلیقات کو ضبط کر لینے کا حکم دے دیا۔ لیکن ان کے شفیق استاد اور دوست مادھو راؤ رانڈے اور دوسرے رفیقوں کی کوششوں کی بدولت ان کی کتابیں ضبط نہ ہو سکیں اور 'مشغلہ' بھی جاری رہا۔ صرف ان کی ایک انگریزی کتاب جو یوروپ میں چھپی تھی جس میں ہندوستانی کاشتکاروں کی زبوں حالی کا بڑا دردناک خاکہ کھینچا گیا تھا اور انگریز حکومت کے ظلم و استبداد کی بڑے پُر اثر انداز میں تصویر کھینچی گئی تھی، اسے ضبط کر لیا گیا کیونکہ اس کے شائع ہوتے ہی انگریزی اور فرانسیسی کے بہت سے اخباروں نے انگریزی حکومت پر نکتہ چینی شروع کر دی تھی۔ اپنی بدنامی سے بچنے کے لئے حکومت نے اسے فوراً ضبط کر لیا۔ ہندوستانیوں کو تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی میدان میں آگے بڑھانے کے لئے ہری نارائن نے بھرپور جدوجہد کی۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک ہندوستانی عوام بیدار نہیں ہوتے اس وقت تک آزادی کی لڑائی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۱۹۱۲ء میں اکولہ میں مرہٹی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ہری نارائن کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ یہ ہری نارائن کی قومی اور ادبی خدمات کا بڑا اعتراف تھا۔ مرہٹی زبان میں ہندوستان کے ماضی کی تاریخ مرتب کرنے میں انھوں نے بڑی کدوکاوش کی۔ بھگوت گیتا اور مہابھارت پر بھی انھوں نے بڑا کام کیا۔ چیدہ چیدہ واقعات کے خلاصے اور اہم سبق آموز باتیں انھوں نے سلیس اور عام فہم مرہٹی میں منتقل کیں تاکہ ایک عام آدمی بھی ان سے استفادہ کر سکے۔ ان کی زندگی کے دو اہم مقاصد تھے۔ ایک تو ملک کو غلامی سے آزاد کرانا اور دوسرا ہندوستانی عوام کو دنیا کی دوسری ترقی یافتہ اقوام کی صف میں جگہ دلانا۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے انھوں نے آخر وقت تک جدوجہد کی۔ ہری نارائن کو آگے بڑھانے اور انھیں اس جدوجہد کے لئے منظم کرنے میں ان کے مخلص استاد اور ہمدرد دوست راؤ صاحب رانڈے کا بڑا ہاتھ رہا۔ مرہٹہ عوام پر راؤ صاحب رانڈے کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اپنی تعلیم اور تربیت سے تین ممتاز قومی رہنما مہاراشٹر کو دیئے۔ جو اپنے دلوں میں قوم کا درد لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان تینوں نے مرہٹہ عوام کی حالت سدھارنے انھیں تعلیم کے زیور سے مالا مال کرنے اور ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کی، اس لئے ان کی بے لوث قومی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں۔ اور آج مہاراشٹر ان عظیم شخصیتوں پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

ہری نارائن میں قومی خدمت کا جذبہ اتنا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ اس جذبے کے بغیر ہم ہری نارائن کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے ناولوں میں ہم کو جگہ جگہ اس جذبے کی تڑپ اور شدت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ہری نارائن نے

مرہٹی زبان کی بہت خدمت کی ہے اور اس کو اپنی تخلیقات کی شکل میں قیمتی خزانہ دیا ہے۔ ان کے بعض ناول اتنے اہم ہیں کہ انھیں دنیا کے عظیم ادب میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ ان کے ناول 'میں' کو مرہٹی ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس ناول میں انھوں نے انگریز حکومت کی چالبازیوں کو بڑی خوبی سے بے نقاب کیا ہے جس کو پڑھنے سے قاری کے ذہن میں انگریز حکومت کے ظلم و زیادتی کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس دور میں ہندوستانیوں کی سیاسی' معاشی اور تعلیمی حالت کی پستی کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دوسرے ناول چینز رگپت، سویرا، کوئی کیوں سوچے ؟ روپ نگر کی راجکماری، پنت راؤ، راہِ نجات وغیرہ بھی کافی مقبول ہیں۔ 'راہِ نجات' ان کا آخری ناول ہے۔ یہ ایک سماجی اور اصلاحی نوعیت کا ناول ہے۔ اس ناول کے ایک ایک لفظ میں ہمیں ان کے قومی جذبہ کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ اگر وہ بار بار جنم لیں تو بھی قوم کی خدمت کرنے سے نہیں تھکیں گے۔ یہ ناول اپنے خاص موضوع اور انداز بیان کے لحاظ سے مرہٹی ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

سیاسی تحریکات میں بھی ہری نارائن نے عملی طور پر حصّہ لیا۔ کانگریس کے بیشتر جلسوں میں انھوں نے شرکت کی اور اس کی سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ہری نارائن کو مختلف پریشانیوں میں مبتلا ہونا پڑا۔ گھر کے بگڑتے ہوئے حالات اور باہر کی دوسری پریشانیوں نے ان کو کافی نڈھال کر دیا۔ ناسازگار ماحول اور نامساعد حالات سے مجبور ہو کر ان کو اپنا ہفتہ وار اخبار 'مشغلہ' بند کر دینا پڑا جسے انھوں نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی جاری رکھا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں 'مشغلہ' کی اشاعت مسدود ہو گئی اور اس کے دو سال بعد ہی مرہٹی زبان کا یہ عظیم فن کار ۳۔ مارچ ۱۹۱۹ء کو فنا کی آغوش میں چلا گیا۔

نئی کتابیں

ماسٹر رام چندر از صدیق الرحمٰن قدوائی

صفحات ۵۷ + ۱۹۴ - ٹائپ میں - مجلد - قیمت ساڑھے آٹھ روپے -
ناشر: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۶

انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے یہاں ایک کالج قائم کیا، جو اپنے محلِ وقوع کے باعث "دلّی کالج" کہلایا - اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندستانی شرفا کی اولاد کو مغربی علوم کی تعلیم ان کی اپنی زبان میں دی جائے، جس سے انھیں معلوم ہو کہ مختلف شعبوں میں دنیا کیا ترقی کر رہی ہے - اگرچہ یہ کالج ایک خاص غرض سے قائم کیا گیا تھا، لیکن اس کے کارکنوں — اساتذہ و طلبا — کی محنت اور اخلاص اور مقصدیت نے اسے ادارے کی سطح سے اُٹھا کر ایک تحریک کی شکل دے دی - آج اردو ادب کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس میں دلّی کالج کے کارناموں اور ان کے دُور رس نتائج کا ذکر نہ ہو -

خیر اس تفصیل میں جانے کا یہ محل نہیں -

اس کالج سے طلبہ کا جو پہلا گروہ فارغ التحصیل ہو کر نکلا، ان میں ایک شخص "رام چندر" گلِ سرِ سبد کی حیثیت رکھتے ہیں - وہ تعلیم ختم کرنے کے ساتھ ہی کالج میں مدرس مقرر ہو گئے، اور اس حیثیت سے ایسے کامیاب ہوئے کہ "ماسٹر رام چندر" گویا ان کا علم بن گیا، حالاں کہ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے - وہ ریاضی داں تھے، مؤرخ تھے، صحافی تھے، مضمون نگار تھے، مصنف تھے، مصلحِ قوم تھے، غرض ان کی شخصیت بڑی ہمہ جہتی تھی - انھوں نے اردو میں صحیح معنوں میں مضمون نگاری کی ابتدا کی اور اس پہلو سے اتنا ذخیرہ جمع کر دیا کہ اسے دیکھ کر آج بھی حیرت ہوتی ہے - ادبِ اردو کا کون سا طالبِ علم ہے، جو منشی ذکاءاللہ، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد، ماسٹر پیارے لال آشوب، مولانا حالی کے ناموں سے ناواقف ہے - لیکن شاید یہ بات عام طور پر معلوم نہ ہو کہ ان میں سے اکثر اصحاب نے دلی کالج میں تعلیم پائی، ان میں سے بعض ماسٹر رام چندر کے شاگرد تھے اور بعض جلیس اور دوست -

ابھی رام چندر اس کالج میں طالبِ علم ہی تھے کہ انھوں نے یہاں کے پرنسپل فیلکس بوتروکی حوصلہ افزائی اور اپنے اساتذہ کی رہنمائی میں لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیا - شروع میں ان کی توجہ زیادہ تر ترجمے پر مبذول رہی، لیکن رفتہ رفتہ خود بھی تصنیف و تالیف کرنے لگے - پھر جب نئے پرنسپل ڈاکٹر اشپرنگر آئے، تو ان کی تحریک پر انھوں نے پندرہ روزہ فوائد الناظرین اور ماہانہ محبِ ہند (جس کا نام پہلے خیر خواہِ ہند تھا) دو پرچے جاری کیے - ان سے انھوں نے اپنے خیالات کی ترویج کا کام لیا - یہ دونوں رسالے بہت دن تک جاری رہے - ان کے مضامین کی بوقلمونی اور افادی حیثیت اتنی نمایاں ہے کہ انھیں دیکھ کر نہ صرف مسرت ہوتی ہے بلکہ تعجب بھی ہوتا ہے کہ آج سے سوا صدی پہلے ایسے دقیق موضوعات پر اردو میں لکھنے والے موجود تھے! کتاب زیرِ نظر کے مصنف نے

بہت خوب کیا کہ اس کے آخر میں دو ضمیموں کی شکل میں مختلف عنوانوں کے تحت، ان مضامین کی فہرست شامل کر دی، جو ماسٹر رام چندر کے قلم سے ان دونوں پرچوں میں شائع ہوئے تھے۔ ان فہرستوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ماسٹر رام چندر نے اردو زبان کو کیا کچھ دیا، اور اس وقت دیا، جب یہ بہت حد تک تہی دامن تھی۔

اردو والوں کا فرض ہے کہ وہ ماسٹر رام چندر کے احسانات کا اعتراف کریں، لیکن ان پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ توازن نہ کھو بیٹھیں اور بے جا تعریف سے احتراز کریں اور غلط باتیں ان کی طرف منسوب نہ کر دیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ماسٹر رام چندر نے اپنے رسالے 'محب ہند' کی دو اشاعتوں (دسمبر ۱۸۴۹ و جنوری ۱۸۵۰ء) میں ایک مضمون لکھا۔ اس کا عنوان تھا: تتمۂ علوم در باب توہمات و رسوم — طریقۂ خط و کتابت۔ اس میں انھوں نے اس وقت کے 'محمد شاہی' طرزِ خطوط نویسی کا مذاق اڑایا، جس میں پیاز کی طرح چھلکے ہی چھلکے اور گودا غائب ہوتا تھا۔ انھوں نے لکھا کہ یہ روش غلط ہے، اسے ترک کر کے سیدھا سادا، روزمرہ کی زبان میں مفید مطلب طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس سے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی مرحوم کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ غالب نے ماسٹر رام چندر کا یہ مضمون دیکھ کر ہی اردو میں سادہ خطوط لکھنا شروع کیے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ غالب کا پہلا اردو خط ۱۸۵۲ء کا ہے، جب کہ رام چندر کا یہ مضمون جنوری ۱۸۵۰ء میں چھپ چکا تھا (غالب اور اردو خطوط نویسی از کیفی مطبوعہ آج کل، ستمبر ۱۹۵۲ء) کیفی مرحوم اپنے جوشِ عقیدت میں یہ سب کچھ لکھ گئے۔ غالب ۱۸۴۸ء میں غالباً، اور ۱۸۴۹ء میں یقیناً، اردو میں خط لکھ رہے تھے۔ تفتہ اور جواہر سنگھ جوہر کے نام ۱۸۴۹ء کے خطوط موجود ہیں۔ رہی تحریر کی سادگی اور طویل خطاب و آداب کی روش سے بیزاری، تو اس کا اظہار وہ ۱۸۲۵ء میں کر چکے تھے، جب انھوں نے پنج آہنگ کا آہنگِ اوّل مرتب کیا ہے۔ اس صورت میں غالب کو ماسٹر رام چندر کا مقلد قرار دینا صریح ظلم ہے۔

مصنف نے تیسرے باب میں ماسٹر رام چندر کی تالیفات وغیرہ کی فہرست درج کی ہے اور ان کے تفصیلی حالات بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ مکمل نہیں اور اس میں مندرجہ ذیل اضافہ ہونا چاہیے۔

(۱) ہندسہ با جبر۔ وود (Waud) کی ایک کتاب (Algebraical Geometry) ہے۔ رام چندر اور رادھا کرشن نے مل کر اسے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب مطبع اردو اخبار میں ۱۸۵۳ء میں چھپی تھی۔

(۲) رسالہ علم ہیئت۔ یہ ہرشل اور رون کیسل کی کتابوں اور انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے متعلقہ مضمون کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ یہ رام چندر اور راجودھیا پرشاد کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ رسالہ بھی دہلی اردو اخبار پریس میں ۱۸۴۸ء میں چھپا تھا۔

(۳) مولوی عبدالحق مرحوم نے 'مرحوم دلّی کالج' میں ان کی ایک کتاب دالجبرا (ترجمہ برجز) کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔

(۴) اس کے علاوہ "پنجاب کے سکھ عہد کی تاریخ اور سوانح مہاراجہ رنجیت سنگھ" جو ہنری پرنسپ کی انگریزی کتاب کا شنکر داس کا کیا ہوا ترجمہ ہے، اس پر رام چندر نے اصلاح دی تھی یہ کتاب بھی دہلی اردو اخبار پریس میں ۱۸۴۶ء میں چھپی تھی۔

(۵) مصنف نے کتاب 'عجائباتِ روزگار' کے طبع اوّل کے مطبع کا نام نہیں لکھا، غالباً انھوں نے اس کا نسخہ نہیں دیکھا۔ یہ مطبع دہلی اردو اخبار میں چھپی تھی۔ سرورق کی عبارت ہے:

کتاب عجائباتِ روزگار تالیف کی ہوئی ماسٹر رام چندر،
مدرس مدرسہ دہلی کی، بیچ ۱۸۴۷ عیسوی کے مطبع
دہلی اردو اخبار میں طبع ہوئی

آخری صفحے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ طباعت بتاریخ ششم ماہ اگست ۱۸۴۷ عیسوی کو ختم ہوئی۔

(۶) اصول گورنمنٹ کے۔ یہ کتاب نارٹن (Norton) کی کتاب (Principles of Government) کا ترجمہ ہے، جو رام چندر نے طالب علمی کے زمانے میں ایک اور طالب علم پنتیمبر کے ساتھ مل کر

کیا تھا۔ اس کی عبارت کی اصلاح مولوی سید محمد مدرس فارسی نے کی تھی۔ اور یہ دہلی اردو اخبار پریس میں ۱۸۴۷ء میں چھپی تھی۔ مصنف نے اس کا سنۂ طباعت نہیں لکھا۔

ماسٹر رام چندر سے متعلق اردو میں یہ دوسری کتاب ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر زور مرحوم کے قائم کردہ ادارہ "ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ" حیدرآباد کی طرف سے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تالیف "رام چندر – اردو کے ارتقا میں ان کا حصہ" شائع ہوئی تھی۔ اس میں سوانح عمری کا حصہ بہت تشنہ تھا۔ البتہ رام چندر کی تحریروں کے اقتباس اور انتخاب کا حصہ بہت قابل قدر تھا۔ موجودہ کتاب نے سوانح عمری مکمل کر دی اور رام چندر کے کارناموں اور ادب اردو میں ان کی اہمیت پر بھی بہت متوازن انداز میں نظر ڈالی ہے۔

یہاں یہ لکھنا بھی بے محل نہیں ہوگا کہ بہت دن ہوئے، انڈین ریویو (انگریزی) مدراس کی طرف سے ہندستان کے علما اور سائنس دانوں کی سوانح عمریوں کا ایک مجموعہ انگریزی میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ماسٹر رام چندر کی بھی خاصی تفصیلی سوانح عمری شامل تھی۔ یوں خیال ہوتا ہے کہ نہ ڈاکٹر سیدہ جعفر کو اس کا علم ہے، نہ جناب صدیق الرحمٰن قدوائی کو۔

(مالک رام)

اُوپر کی منزل

کرتار سنگھ دُگل کے دس ڈراموں کا مجموعہ۔ ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ قیمت چار روپے۔ ضخامت ۲۳۰ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت طباعت اچھی۔ کتاب مجلد اور جلد پوش کی حامل ہے۔

ڈراما نگاروں میں کرتار سنگھ دُگل کا اپنا الگ مقام ہے۔ آپ کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ "دیا بجھ گیا" کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اکثر ڈراموں کے ترجمے ہندی کے علاوہ کئی یورپی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں شائع شدہ دو ڈرامے 'اپنی اپنی کھڑکی' اور 'اوپر کی منزل' آج کل میں چھپ چکے ہیں۔ دگل صاحب ڈرامے کی تکنیک سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ کے ڈرامے ریڈیو سے بھی نشر ہوتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کے سبھی ڈرامے دل چسپ اور معیاری ہیں۔

مطالعہ

نریش کمار شاد کے ۱۷ مضامین کا مجموعہ۔ ناشر میرا نیڈ کمپنی اردو بازار دہلی۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔ کتابت، طباعت، کاغذ، جلد، جلد پوش اوسط۔

نریش کمار شاد ایک ذہین شاعر اور ادیب ہیں۔ وہ ہر رنگ میں شعر کہتے ہیں اور ہر رنگ میں نثر لکھتے ہیں۔ ان کے نثری مضامین کا یہ مجموعہ ان کی ہمہ گیری پر دال ہے۔ ان کی ہر تحریر سے ان کے شعور کی صحت مندی اور روایت اور ترقی پسندی کے بین بین ان کی روش کے آثار ملتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ قابل قدر مجموعۂ مضامین قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

شہرِ سخن

مصنف ملک زادہ منظور احمد۔ شائع کردہ ملک زادہ پبلیکیشنز ۲۹ - سیتا رام اعظم گڑھ۔ قیمت چار روپے۔

اس کتاب میں ملک زادہ صاحب نے قریب ۲۵ شاعروں کا تعارف لکھا ہے جو بجائے خود دل چسپ ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے تنقید کا صحیح حق ادا کیا ہے۔ پھر بھی یہ بات ان کے حق میں جاتی ہے کہ کسی شاعر کے جسمانی اور ادبی خد و خال کا نقش بناتے وقت ضروری نہیں کہ تنقید کے رنگوں سے کام لیا جائے۔ انھوں نے شعراء کے بارے میں جو رائیں دی ہیں انھیں انھوں نے اپنے اسلوب کی رنگینی سے دل کش بنا دیا ہے۔ کتابت طباعت وغیرہ گوارا۔

پیاسی بیل

مانک ٹالہ کے ۱۸ افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت چار روپے۔ طابع و ناشر کرشن گوپال مانک ٹالہ۔ وڈالا۔ بمبئی ۳۱۔

جوگندر پال نے اس کتاب کا حرفِ اول لکھا ہے۔ کتابت طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ۔ مانک ٹالہ خود لکھتے ہیں کہ

اس مجموعے کی بہت سی کہانیاں میں نے اپنے بچپن کے ماحول سے حاصل کی ہیں۔ ان کہانیوں میں 'ست یگ کا انسان'، 'ایک ہیرے ایک گوتم'، 'پونم'، 'گدھوں کی کمی نہیں' اور 'معجزہ' شامل ہیں۔ کچھ کہانیاں انھیں اپنی غیر ملکی سیاحتوں سے حاصل ہوئیں۔ مانک ٹالہ کا اندازِ بیان بڑا جچا تلا ہے اور وہ گھسے پٹے راستوں پر چلنے سے گریز کرتے ہیں۔ بقول خود وہ منفرد ادیب ہیں۔ مانک ٹالہ کے لفظی معنی ہیں موتیوں کا سوداگر۔ ان کہانیوں کے باب میں وہ لکھتے ہیں کہ اپنی دانست میں میں نے کچھ قیمتی موتی پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ قول اگر خودستائی نہیں تو حقیقت بھی نہیں اور ان کے افسانے قیمتی موتی نہ سہی سنگ ریزے بھی نہیں۔

شامتِ اعمال

دلاور فگار کے مزاحیہ کلام کا مجموعہ۔ قیمت تین روپے۔
ملنے کا پتہ فن کاران جدید، نواب منزل ڈیوڑھیا محل محلہ سوتھہ بدایوں۔

دلاور فگار ہندوستان کے مزاح نگار شاعروں میں بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی ان کے کلام کی یہ ہے کہ ان کے مزاح میں بدذوقی نہیں عریانی نہیں اور ابتذال نہیں۔ ان کے کلام سے ان کے علم اور فن پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کا یہ مجموعہ اہلِ نظر کے نزدیک ان کی شاعری کو شامتِ اعمال نہیں بلکہ برکتِ اعمال ثابت کرے گا۔

موت کی شہنائی

حسن شبیر کی نظموں کا مجموعہ۔ قیمت چار روپے۔
دائرۂ ذہن و انقلاب۔ ۵ کالی داس مارگ۔ لکھنؤ۔

شبیر خیال اور اندازِ بیان کے لحاظ سے بالکل نئے شاعر ہیں۔ نئے سے مراد تازہ واردِ ملکِ سخن نہیں بلکہ جدید اور محض جدید۔ ان کی اکثر نظمیں ان کی ذہانت پر دال ہیں۔ ان کے یہاں مضامین کا تنوع ہے اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں نظم محض خوب صورت نثر بن کر رہ گئی ہے۔

(ع۔م)

ترتیب

سرورق۔ پشت پر:۔ لال چوک سری نگر میں عوام پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر سن رہے ہیں۔

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل
دہلی

جواہر لال نہرو نمبر

سالانہ چندہ:۔
ہندوستان میں:۔ سات روپے
پاکستان میں:۔ سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے:۔ ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ:۔
ہندوستان میں:۔ ۶۰ پیسے
پاکستان میں:۔ ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے:۔ ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

جلد ۲۴ — کارتک شک سمت ۱۸۸۶
نمبر ۴ — نومبر ۱۹۶۴ء

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومتِ ہند
پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

جوشؔ ملیح آبادی

کوئی بتائے یوسفِ کنعاں کدھر گیا

تاریک ہے نگاہ میں دُنیا ترے بغیر   بھارت ہے ایک یاس کا پُتلا ترے بغیر
دہلی کے حُسن پر ہے رنڈاپا ترے بغیر   جمنا ترے بغیر نہ گنگا ترے بغیر

تو گُم ہوا تو اشک ہمارے نکل پڑے
جب چاند چھُپ گیا تو ستارے نکل پڑے

کل جو برس رہا تھا وہ بادل نہیں رہا   اب جسمِ دوستاں میں وہ کس بل نہیں رہا
چشمِ عروسِ دہر میں کاجل نہیں رہا   ہندوستاں کی مانگ میں صندل نہیں رہا

اب ہر نظر ہے قافلۂ چشمِ نم کے ساتھ
ساری برات تھی اُسی دولھا کے دم کے ساتھ

تیرے سدھارتے ہی نگاہیں بدل گئیں   شیریں صدائیں آہ کے سانچے میں ڈھل گئیں
طاقِ سیاسیات کی شمعیں پگھل گئیں   خیمے کی جان تھیں جو طنابیں وہ جل گئیں

سارا زمانہ طور سے بے طور ہو گیا
تو کیا گیا کہ رنگ ہی کچھ اور ہو گیا

نکلا ترا جنازہ جو اے میرِ کارواں   اک لشکرِ عظیم جلو میں ہُوا رواں
تیری چتا کی آگ ہوئی جب شرر فشاں   نوعِ بشر کے قلب سے اُٹھنے لگا دھواں

دنیا وفورِ گریہ سے منہ ڈھانپنے لگی
رویا جو آسماں تو زمیں کانپنے لگی

جمنا کی سمت آہ ترا آخری سفر   اس درجہ تھا ہجوم کہ لرزاں تھی رہ گزر
جلتے ہوئے جو دل تھے تو پھُنکتے ہوئے جگر   پروانے کا جنازہ تھا شمعوں کے دوش پر

گلشن تھا آندھیوں کا تسلسل لئے ہوئے
گُل سرنگوں تھے میّتِ بلبل لئے ہوئے

جس کی زبان نغمۂ صد آب شار تھی   جس کی جبیں طلوعِ لبِ جوئے بار تھی
جس کی نظر شعاعِ سرِ کوہ سار تھی   جس کی ہر ایک سانس نسیمِ بہار تھی
وہ تاج دارِ حسنِ فراواں کدھر گیا
کوئی بتائے یوسفِ کنعاں کدھر گیا

خونِ حیات میں وہ تلاطم نہیں رہا   ہندوستاں کے لب پہ ترنّم نہیں رہا
موتی جو رولتا تھا وہ قلزم نہیں رہا   کھلتے تھے جس سے دل وہ تبسّم نہیں رہا
کل تک چڑھے ہوئے تھے جو دریا اُتر گئے
رخصت ہوا مسیح تو بیمار مر گئے

یارو وہ حسنِ سنبل و ریحاں کہاں گیا   وہ کاروانِ لُولُو و مرجاں کہاں گیا
وہ شہریارِ کشورِ دوراں کہاں گیا   قدسی تھے جس سے دنگ وہ انساں کہاں گیا
میرے ندیم طیّب و طاہر کو کیا ہُوا
اے دوستو بتاؤ جواہر کو کیا ہُوا

تو کیا گیا کہ دولتِ فکر و نظر گئی   تابندگیٔ چہرۂ اہلِ نظر گئی
سُر گم ہوئے کمانِ مغنّی اُتر گئی   نغموں پہ اوس پڑ گئی ہر لے ٹھٹھر گئی
شیرازۂ نظامِ تجلّی بکھر گیا
سورج کے ڈوبتے ہی اندھیرا اُبھر گیا

دریائے سرخوشی میں روانی نہیں رہی   موجِ صبا میں عطر فشانی نہیں رہی
بزمِ طرب میں زمزمہ خوانی نہیں رہی   جو نیند لا سکے وہ کہانی نہیں رہی
تیری حیات موت سے جب زیر ہو گئی
دنیا ہر اک نگاہ میں اندھیر ہو گئی

لہروں میں غوطہ زن ہے تری ہمّتِ جواں   موجوں میں تیری خاک کی غلطاں ہیں بجلیاں
ہر جزر و مد ہے ایک کڑکتی ہوئی کماں   تیرا لہو ہے جملہ رگوں میں رواں دواں
تیری چِتا کی راکھ ہے گنگا لئے ہوئے
پانی رواں ہے آگ کا دریا لئے ہوئے

ذرّے سیاہ پوش ہیں تارے ہیں سوگوار   دل کے نگر میں اب نہ کبھی آئے گی بہار
تجھ ہم نوا کی موت سے اے یارِ مہرکار   میں اپنی زندگی سے نہایت ہوں شرمسار
دنیائے عاشقی کی یہی رسم و راہ ہے
لیلیٰ کے بعد قیس کا جینا گناہ ہے

فراق گورکھپوری

جواہر لال نہرو

کچھ یادیں — کچھ تاثرات

میں نے بی۔ اے کلاس کی طالب علمی کے زمانے میں جب تحریکِ آزادی کا نام کچھ دنوں کے لئے ہوم رول رکھا گیا تھا، اسی زمانے میں اس تحریک کے سلسلے میں لکھنؤ میں ہونے والے کانگریس کے نہایت اہم اور تاریخی اجلاس سے قبل ایک سبھا میں پنڈت جواہر لال نہرو کو پہلے پہل دیکھا تھا۔ یہ سبھا الٰہ آباد میں بابو رام پرشاد کے باغ میں ہوئی تھی۔ اتر پردیش کے بہت سے چوٹی کے لیڈر اس سبھا کی زینت تھے۔ مثلاً پنڈت مدن موہن مالوی، پنڈت موتی لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو، سمیع اللہ بیگ، منشی ایشور سرن، اور کئی دیگر اکابر و مشاہیرِ وطن۔ جب بہت سے پختہ کار سیاسی رہنما ہندوستان کے حقوق سے متعلق تقریریں کر چکے تو قریب قریب آخر میں جواہر لال نہرو کا نام پکارا گیا۔ یہ بات ہے ۱۹۱۶ء کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو سر سے پیر تک اعلیٰ درجے کے انگریزی کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ان کی عمر اس وقت ۲۶۔۲۷ سال کی تھی۔ وہ ایک منحنی صورت کے ایسے نوجوان نظر آ رہے تھے جسے تخیل پر انتہائی زور دینے کے باوجود ہندوستان یا کسی ملک کے عوام سے نہ ہم آہنگ کیا جا سکتا تھا، نہ مانوس سمجھا جا سکتا تھا اور نہ کسی لحاظ سے متعلق کیا جا سکتا تھا۔ سب کی تقریریں نہایت سلیس اور مانوس ہندوستانی زبان میں ہوئی تھیں۔ یکہ و تنہا جواہر لال تھے جن کی سات آٹھ منٹ کی تقریر انگریزی زبان میں تھی۔ مجھے اس تقریر کا آغازی جملہ اب تک یاد ہے، وہ جملہ یہ تھا:

After the roaring of lions my words will sound like the bleating of a lamb.

یہ تقریر بالکل انگریزوں کے لہجے میں تھی۔ اور یوں بھی کوئی خاص بات اس مختصر سی انگریزی تقریر میں نہیں تھی۔ مجھے اس عالم میں اس نوجوان کو دیکھ کر خواب میں بھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ اب سے ایک نہایت مختصر عرصے کے اندر یہ نوجوان ہندوستان کی تقدیر بننے والا ہے۔ ابھی مہاتما گاندھی ہندوستانی سیاست دانوں یا سیاسی کرداروں میں ایک نہایت باعزت لیکن پچھلی صفوں کے ایک فرد کی حیثیت رکھتے تھے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی مہاتما جی نے ہندوستانی سیاست کے اکھاڑے میں باقاعدہ قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ اُن کانگریس والوں کا جلسہ تھا جنھیں بعد کو مہاتما گاندھی کی زلزلہ خیز اور انقلابی تحریک کے کارن کانگریس سے الگ ہونا پڑا باستثنائے چند۔ خود مجھ پر فوری اثر جواہر لال نہرو کو دیکھ کر قدرے بلکہ کافی حد تک ناآسودگی کا تھا۔ وہ ان اعتدال پسند سیاست دانوں کے زمرے میں ایک اجنبی اور باہری سے آدمی معلوم ہوتے تھے جو محض رسماً ہندوستان کی سیاسی تحریک میں شریک ہو گیا ہو۔ اس وقت مجھے کیا خبر تھی کہ خود مجھے آئی سی ایس کا بلند ترین عہدہ ملنے والا ہے اور میں سب کچھ تج کے ایک دن تحریکِ آزادی میں اپنے آپ کو ڈال دوں گا اور جواہر لال نہرو سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جاؤں گا اور اس قدر مانوس ہو جاؤں گا کہ جذباتی طور پر ان سے زندگی بھر کوئی اور آتنا مانوس نہیں ہو سکا۔ اور یہ سب

باتیں آج ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ چشم زدن میں ہو گئیں۔

۱۹۱۸ء میں میں نے بی۔ اے پاس کیا۔ آج ہمارے ہم وطنوں کے لئے شاید یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اسی سال جب میں نے میور سنٹرل کالج سے بی۔ اے پاس کیا تھا تو علی گڑھ ایم۔ اے۔ او کالج سے ہمارے آج کے محترم نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے بی۔ اے پاس کیا تھا۔ اس امتحان میں پورے صوبے میں میری چوتھی پوزیشن آئی تھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی تیسری پوزیشن آئی تھی۔ اب میں آگے بڑھتا ہوں۔ ہم لوگوں کا نتیجہ شائع ہونے کے قریب قریب فوراً ہی بعد پہلی جنگِ عظیم ختم ہو گئی اور اس جنگ میں ہندوستان کو اتنی بڑی قربانی دینی پڑی تھی کہ سارے ملک میں ایک ناقابلِ شکست اور ناقابلِ فنا سیاسی بیداری پیدا ہو گئی تھی جس کا اندازہ کر کے انگریزی ملوکیت کانپ اُٹھی تھی۔ لیکن جرمنی پر فتح پانے کے نشے میں اس ملوکیت نے ہندوستانی سیاسی بیداری کو کچل دینا چاہا تھا۔ رولٹ ایکٹ پاس کیا گیا جو تمام سیاسی تحریکوں کا گلا گھونٹنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ ہندوستان کا احتجاج نہایت شاندار تھا جس کا ایک مظاہرہ ۱۹۱۹ء کی گرمیوں میں امرتسر کے اس جلیاں والا باغ میں ہوا جس کی زیارت کا شرف مجھے حال میں ہوا۔ ہندوستان اور ساری دنیا جانتی ہے کہ جلیاں والا باغ میں کیا ہتیا کانڈ ہوا اور کس طرح ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور دوسرے پیارے ہم وطنوں کا خون اس ہتیا کانڈ میں مل کر ایک ہو گیا۔ ہندوستان اب کچھ اس طرح اُبھر چکا تھا کہ کائنات کی تمام طاقتیں اس ابھرتے ہوئے ہندوستان کو دبا نہیں سکتی تھیں۔ لیکن میں جواہر لال نہرو سے متعلق اپنی کچھ یادیں اور اپنے کچھ تاثرات قلم بند کر رہا ہوں اس لئے اس داستان کو طول نہ دے کر فوراً وہاں پہنچ جاتا ہوں جہاں مہاتما گاندھی نے ہندوستان کی سیاست کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور ہماری تاریخ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک نیا موڑ دے دیا۔

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو اس کی رہ گذر آئی (فراق)

لیکن ساتھ ہی ساتھ راقم الحروف کا یہ شعر بھی سن لیجئے:

ہر آوازِ جرس پر آ ملیں گے قافلے والے
تجھے معلوم بھی ہے کارواں در کارواں ہم ہیں

مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۰ء کے شروعات میں انگریزی سامراج اور انگریزی حکومت پر جو ان کا اٹل عقیدہ تھا اُسے خیرباد کہا۔ جب پنجاب کے گورنر سے انگریزی حکومت نے امرتسر اور پورے پنجاب کے ضمیر سوز مظالم پر کوئی باز پرس نہیں کی تو مہاتما گاندھی کی معصومی مجروح ہو کر اس طرح چونک اُٹھی کہ سارا ہندوستان چونک گیا۔ اب آزادی کی جنگ کا مہاتما گاندھی نے کھلا ہوا اعلان کر دیا۔ جس طرح ہندوستان میں بلکہ ہندوستان کی جھونپڑیوں میں مہاتما گاندھی کا نعرہ گونجا اور ایک فلک شگاف آوازِ بازگشت ملک کے ذرّے ذرّے سے آئی اُسے سن کر خود ہندوستان بلکہ سارا جہان اس جرأتِ رندانہ اور ہمّتِ مردانہ پر عش عش کرنے لگا۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
دیکھنا ہندوستاں اب کیا سے کیا ہو جائے گا

اب سے لگ بھگ پونے تین ہزار برس پہلے راج کمار سدھارتھ نے کپل وستو کا راج محل چھوڑ کر جلاوطنی اختیار کی تھی اور بودھ گیا میں انھیں گیان ہوا تھا۔ اس بار جواہر لال نہرو کا مسکن آنند بھون خود بخود راج محل سے بودھ گیا میں تبدیل ہو گیا اور جس طرح مہاتما بدھ کی قیادت کو سب سے پہلے ان کے پتا اور دوسرے گھر والوں نے قبول کیا تھا بجنسہٖ اسی طرح اس بار ہندوستان کے نئے سدھارتھ جواہر لال نہرو کے تیاگ اور لگن سے متاثر ہو کر ان کے والد محترم پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے پورے گھرانے نے تیاگ اور قربانی کا بانا پہن لیا۔

اس دوران میں میری زندگی ہلاکت آمیز آزمائشوں سے گزر رہی تھی اور بغیر کسی آگ کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جھلس کر رہ گئی تھی۔ میں اکتوبر یا نومبر ۱۹۲۰ء میں گورکھپور سے الٰہ آباد محض جی بہلانے کی کوشش کرنے کے لئے چند دنوں کے لئے آ گیا تھا۔ عدم تعاون کی تحریک اپنی پہلی منزلوں میں تھی۔ سارا ملک

ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ میں اپنی زندگی سے بیزار تھا۔ آئی۔سی۔ایس کا عہدہ بلکہ کوئی بھی عہدہ میرے لئے کسی قسم کی کشش نہیں رکھتا تھا۔ اسی وقت یہ غیبی تحریک میرے اندر پیدا ہوئی کہ میں آنند بھون جو اب ہندوستان کی زیارت گاہ بن چکا تھا جا کر اپنے آپ کو پنڈت موتی لال نہرو کے قدموں میں ڈال دوں۔ جب میں آنند بھون پہونچا تو پنڈت موتی لال نہرو کی پُرشفقت اور پدرانہ شخصیت سے ناقابلِ بیان حد تک متاثر ہوا۔ انھوں نے بھی مجھ میں کوئی غیبی کشش محسوس کی۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ میں گورکھپور کے وکیل منشی گورکھ پرشاد عبرت مرحوم کا بیٹا ہوں جن کی معیت میں وہ تملکوہی راج کا بہت بڑا مقدمہ لڑ چکے تھے اور جیت چکے تھے۔ پنڈت جی اس یاد دہانی پر نہایت محبت آمیز ڈھنگ سے متاثر ہوئے۔ اسی وقت ملاقات کے کمرے میں پنڈت جواہرلال نہرو آ پہونچے اور پنڈت موتی لال نہرو نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے جواہرلال نہرو کو سونپ دیا۔ ہم دونوں کی نگاہیں ملیں اور ہم دونوں نے ایک ایسا باہمی قرب اور کشش محسوس کی جو قریب قریب نصف صدی تک کم از کم میری زندگی کا ایک بہت بڑا سہارا رہی۔

کھدر اور کھدر پوشی اب ایک زمانے سے کسی قدر اپنی امتیازی دلکشی کھو چکے ہیں۔ لیکن جب پہلے پہل ہزارہا لکھوکھا ہم وطنوں نے کھدر دھارن کیا تو وہ نفسیاتی طور پر منظم اور ہم آہنگ ہوگئے جب موتی لال نہرو کو اور جواہرلال نہرو کو آنند بھون میں میں نے کھدر میں دیکھا تو خاموش طریقے پر اس منظر میں مجھے ایک جادو نظر آیا۔ اس ملاقات کے بعد گورکھپور چلا آیا اور سرکاری عہدے سے اپنا استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔ میں نے اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے بڑا بھیانک اقدام کیا تھا۔ میری اور میرے پورے خاندان کی روٹیاں خطرے میں آگئی تھیں کیونکہ ہم لوگوں کے پاس کوئی ذریعہ آمدنی اور اثاثہ گزارے کے لئے نہیں تھا۔ قرضے پر گزارا تھا۔ ہاں! تو اب مختصر وقفوں کے بعد صدہا بار جواہرلال نہرو کا قرب حاصل ہونے لگا۔ اگلے چند برسوں کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اختصار سے بھی بیان کروں تو پوری کتاب ہو جائے گی۔

اس دوران میں جواہرلال نہرو نے خاموش طریقے سے مجھے اس کا احساس کرادیا کہ وہ میری غیر معمولی قدر کرتے ہیں اور کانگریس میں میری شرکت کو ایک بہت اہم واقعہ سمجھتے ہیں اور یہی احساس مجھے مہاتما گاندھی کے محبت آمیز رویے سے ہوا۔

جب ۱۹۲۱ء میں انگلستان کے ولی عہد ہندوستان آئے تو ان کی اس آمد کا بہت بڑے پیمانے پر بائیکاٹ ہوا۔ اس وقت مہاتما گاندھی کو چھوڑ کر قریب قریب تمام چوٹی کے سیاسی لیڈر گرفتار کرلئے گئے۔ غالباً ۶۔ دسمبر ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں یو۔پی کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس سے کچھ قبل پورا نہرو پریوار گرفتار ہو چکا تھا اور پنڈت جواہرلال نہرو مجھے یو۔پی کانگریس کا ڈکٹیٹر نامزد کرکے جیل چلے گئے تھے۔ میں نے اس اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ بجائے میرے رفیع احمد قدوائی مرحوم ڈکٹیٹری کا بار سنبھالیں لیکن عین اسی وقت یہ پورا جلسہ گرفتار کر لیا گیا اور ہم سب لوگ نینی جیل میں بھیج دیئے گئے۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو لمبے جرمانوں کے ساتھ ڈیڑھ برس کی قید ہوئی جسے میں نے آگرہ جیل اور کچھ مہینوں لکھنؤ جیل میں گزارا۔ رہائی کے بعد میں گورکھپور آکر از سرِ نو ضلع کانگریس کمیٹی کا کام کرتا رہا۔ اس دوران میں کئی بار جواہرلال نہرو کبھی تن تنہا اور کبھی دوسرے کانگریس لیڈروں کی معیت میں میرے مہمان ہوتے رہے۔ چند مہینوں کے بعد جواہرلال نہرو نے کانگریس ورکنگ کمیٹی میں یہ تجویز پیش کی کہ مجھے کانگریس کا انڈر سیکرٹری مقرر کر دیا جائے۔ جنرل سیکرٹری پنڈت جواہرلال نہرو خود تھے۔ اب میں الہ آباد چلا آیا اور گویا آنند بھون کے کنبے کا ایک فرد بن گیا۔ دفتر میں اور دفتر کے اوقات کے بعد دفتر سے باہر روزانہ میرا اور جواہرلال نہرو کا ساتھ رہنے لگا۔ اس زمانے میں میں نے کئی برسوں تک جواہرلال نہرو کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ دفتر کا کام بہت باقاعدگی سے کرتے تھے۔ کبھی ایک آدھ دن کے لئے طبیعت ناساز ہو جاتی تو وہ دفتر کو لکھ بھیجتے کہ "میں شرمندہ ہوں کہ آج بیمار پڑ گیا اور دفتر نہ آسکوں گا۔" وہ بیمار پڑ جانے کے معاملے میں مریض کو ذمہ دار

اور مجرم سمجھتے تھے۔ اسے تقدیر کی بات نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بار دفتر کے کام سے فراغت پاکر جواہرلال نہرو نے مجھ سے پوچھا کہ انیسویں صدی کے دو سب سے بڑے انسان کون تھے؟ خود ان کو اور گاندھی جی کو تو میں بیسویں صدی کا آدمی مانتا تھا۔ میں ذرا سوچ میں پڑگیا تو انھوں نے خود کہا اور بالکل صحیح کہا کہ ڈارون اور مارکس۔ آج جب ان کی یہ مختصر گفتگو یاد کرتا ہوں تو یہ سوچ کر دل کو ایک چوٹ لگتی ہے کہ کاش ہمارے تمام سیاسی اور سماجی لیڈر ڈارون اور مارکس کی عالم گیر اہمیت کا احساس کرتے یا کرسکتے تو شاید ہمارا ملک فکریاتی لحاظ سے بہت سی غلطیوں کا شکار نہ بنتا۔

جواہرلال نہرو تن آسانی، عیش و آرام اور لذت پرستی سے بہت دور تھے۔ ان کی شخصیت میں جھول تھے ہی نہیں۔ اور نہ کہیں یا کسی لحاظ سے ڈھیلا پن تھا۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگے جانتے ہو کہ میں الہ آباد ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرنے کے خیال سے کیوں بیزار رہا ہوں؟" پھر خود ہی بتایا کہ بار ایسوسی ایشن میں لوگوں کی زندگی میں کوئی گہرائی یا سنجیدگی نہیں تھی بلکہ اس قدر یہ زندگی سطحی اور بے تہہ تھی کہ میں ایک مغائرت محسوس کرنے لگا۔ مجھے ایک بات اور یاد کرکے کچھ فخر سا محسوس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جواہرلال کا موڈ دیکھ کر میں انھیں اردو کے رچے ہوئے اشعار سناتا تھا۔ اردو شاعری پر میری بات چیت وہ بڑے انہماک سے سنتے تھے۔ عجب کیا کہ اردو اور ہندی کے جھگڑے کے معاملے میں جس بلند مدبرانہ روشن خیالی کا ثبوت وہ دیتے رہے اس معاملے میں ان باتوں اور وقفوں کا بھی کچھ حصہ ہو۔ اس زمانے میں وہ اردو بالکل لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہندوستان کے کس خطے کا حسن فوقیت رکھتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے حسن کی خطہ وار تقسیم یا بٹوارہ نہیں کیا تھا۔ کہنے لگے کہ سندھ کے حسن میں سب سے زیادہ دلکشی ہے۔

جواہرلال نہرو کی اور میری ذہنی ادبی دلچسپیوں میں کچھ ہستیاں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ہم دونوں یورپ اور خاص کر جدید یورپ کے کارناموں اور تخلیقات سے متاثر تھے جیسے کروپاٹکن، برنارڈ شا، ایچ جی۔ ویلز۔ اس کے علاوہ بیسیوں اور ادبا اور مفکرین تھے۔ میں یورپ کی بلند ہستیوں کے علاوہ قدیم ہندوستان کے مفکروں، شاعروں اور فن کاروں اور ایران کے ادب و فنون لطیفہ سے بھی شدید دلچسپی رکھتا تھا لیکن اس امر پہ میرے ان کے تبادلۂ خیالات کی نوبت بہت کم آئی۔ شاید اس طرف ان کا دھیان قریب قریب اس زمانے میں گیا جب وہ Discovery of India (تلاش ہند) کی تصنیف کئی برس بعد جیل میں کر رہے تھے۔ میں نیم شعوری طور پر اس زمانے میں بھی یہ محسوس کرتا رہا کہ جواہرلال نہرو انتہائی سیاسی سرگرمیوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کرکے بھی عالمی یا آفاقی کلچر سے ایک زندہ اور شدید لگاؤ رکھتے ہیں۔ عمل کو وہ علم و فکریات سے الگ نہیں کرتے۔ کاش ہمارے سیاسی کارکنوں میں سطحی اور تری سیاست کے علاوہ آفاقی کلچر سے واقفیت حاصل کرنے اور اس سے متاثر ہونے اور اس کی روشنی میں ہندوستان کی تعمیر کرنے کی لگن اس کی آدھی بھی ہوتی جس کا اندازہ میں نے جواہرلال نہرو کی شخصیت میں کیا تھا۔ جب جب گورکھپور میں جواہرلال نہرو میرے مہمان ہوتے تو رات کو سوجانے سے پہلے سرہانے لالٹین رکھ کر کچھ نہ کچھ ضرور پڑھتے۔ الیکشن باز سیاستدانوں یا سیاست نادانوں کو یہ توفیق کہاں؟

جواہرلال نہرو کی خوراک عام آدمیوں سے کافی کم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کھانے پینے کا فرض وہ ایک جھٹکے کے ساتھ انجام دیتے ہیں اور نیم توجہی کے ساتھ پورا کرتے ہیں۔ انھیں ناشتے پر براؤن بریڈ بہت پسند تھا اور کھاتے وقت ان کی انگلیوں کے سرے ہی کھانے کی چیزوں سے بھیگتے تھے۔ یہ سارے محاسن اور لطائف و ظرائف ان کی خاندانی ثقافت اور لڑکپن ہی سے انگلستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی دین تھے۔ اکثر ان کے ساتھ عام جلسوں میں تقریریں کرتے ہوئے میں ایک روایتی غلطی کا مرتکب ہوجاتا تھا۔ میں ہی کیا۔ یہ غلطی مولانا محمد علی اور ہزارہا لکھو کھا دوسرے آدمی بھی کرتے رہے۔ میں نے کئی بار ان کے سامنے دوران تقریر لوگوں سے کہا کہ جواہرلال نہرو کے پورے گھرانے کے کپڑے پیرس میں

ڈھلتے تھے۔ انھوں نے ایک بار تخلیے میں مجھے بتایا کہ بھائی یہ سب غلط ہے۔ ایسا کرنے سے تو پیرس ہی سے ہم لوگ برابر نئے کپڑے اسی قیمت میں سلوا کر منگا سکتے تھے۔ عجیب عجیب باتیں ہمارے خوش اعتقاد اور اختراع زدہ یا افواہ زدہ یارانِ وطن نے مشہور کر رکھی تھیں جن میں ایک بات یہ تھی کہ جواہرلال نہرو یا پنڈت موتی لال نہرو کے کموڈ کے برتن میں نہایت قیمتی مخمل جڑا ہوا ہوتا ہے۔ میں نے ایسے دوستوں سے عرض کیا کہ کبھی آپ نے یہ بھی غور کیا کہ ایسا کموڈ صاف کیسے کیا جائے گا اور کتنی بار استعمال میں آ سکے گا۔ تب لوگوں کی آنکھیں کھلیں۔ کئی بار موٹروں اور دوسری سواریوں پر دیہاتوں کے دُور دراز سفر میں جواہرلال نہرو میرے ساتھ تنہا رہے ہیں۔ ایک بار کسی چھوٹے سے شہر میں مقامی کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری کو بھی ہم لوگوں نے کھانے پر بُلا لیا تھا۔ جب مٹن کے نام سے ایک چیز تقسیم کی جا رہی تھی تو سیکریٹری صاحب نے نہایت معصومی سے پوچھا کہ مٹن میں گوشت تو نہیں پڑا ہے۔ سب کو لطف آ گیا۔ ایک بار کچھ مارواڑیوں نے پنڈت جی اور ہم سب کو چائے پلائی۔ لیکن چائے پینے کے ظروف یعنی پیالے سب دھات کے بنے ہوئے تھے۔ سب کے ہونٹ جھلس جھلس جاتے تھے۔ میں خود سوچ نہیں پا رہا ہوں کہ وہ چائے ہم لوگوں نے پی کیسے؟ ’لب سوز‘ تک تو خیریت تھی لیکن یہ چائے تو ’لب پھونک‘ تھی یا ’لب جھلس‘۔ آپ سمجھے کہ یہ جدت یا بدعت کیوں کی گئی تھی۔ کٹر قسم کے ہندو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ صرف دھات کے برتن استعمال ہونے کے بعد صفائی کے ساتھ مانجے جا سکتے ہیں۔ جواہرلال نہرو ایسے موقعوں پر جھلّاتے نہیں تھے بلکہ بیک وقت اپنی ہنسی اور غصے کے امتزاج سے اپنے دل و دماغ میں گدگدی پیدا کر لیا کرتے تھے۔

ایک بار غالباً ضلع بستی میں دورہ کرتے ہوئے پنڈت جی کو شدید بخار ہو آیا لیکن اس عالم میں بھی انھوں نے بخار سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خود اپنی داڑھی شیو کی جو صرف ایک ہی روز کی بڑھی ہوئی تھی۔ میں ان کی اس باقاعدگی پر نم دیدہ ہو گیا تھا۔ آج جب یہ بات یاد آتی ہے کہ ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کی صبح کو جب وہ ناقابلِ برداشت کرب میں مبتلا تھے اور اس دنیا میں صرف چند گھنٹوں کے مہمان تھے، انھوں نے اپنا شیو بنایا تھا تو کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ یہ شخص آخری سانس تک ایک سپاہی تھا۔ ایشیا کی روایتی کاہلی انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ ہم لوگ پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے پورے خاندان کے متعلق ایک نہایت غلط اور گستاخانہ تصور کو اپنے دلوں میں جگہ دئے ہوئے ہیں۔ وہ یہ کہ یہ پورا خاندان عیش پرستوں کا خاندان تھا۔ میں نے اس خاندان کے ایک ایک فرد کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میری نگاہیں ایکس رے کا کام کرتی ہیں اور اس مضمون کے ذریعہ میں ہندوستان اور ساری دنیا کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس خاندان کا ایک ایک فرد فولادی رگ و ریشہ کا آدمی تھا اور ہے۔ نفاست پسندی کو سستی عیاشی سمجھنے کی غلطی ناقابلِ معافی ہے۔ جواہرلال نہرو کو زندگی میں ہزارہا ایسے موقعے آئے ہیں جب انھیں سخت سے سخت جسمانی آزمائش سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ لیکن وہ اتنے سدھے ہوئے آدمی تھے کہ کنکروں کے بستر پر بھی انھیں نیند آ سکتی تھی۔

ایک ایک واقعہ یاد آتا ہے اور کلیجہ خون ہو جاتا ہے۔ دیش بندھو داس پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے اور محبان وطن کا ایک بڑا حصہ تحریکِ ترکِ موالات کے چار سال بعد یہ چاہنے لگا کہ کاؤنسلوں اور اسمبلیوں کا بائیکاٹ بند کر دیا جائے اور الیکشن لڑا جائے۔ مہاتما گاندھی ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ جواہرلال نہرو اس امر میں رہے تو خاموش لیکن گاندھی جی سے کھلّم کھلّا اختلاف کا خیال ان کے راستے میں حائل ہو جاتا تھا۔ باپ بیٹے میں یعنی موتی لال نہرو اور جواہرلال نہرو میں ایک کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ آنند بھون ایک خاموش لیکن ناخوش گوار کشاکش میں مبتلا ہو چکا ہے۔ انھیں دنوں ایک روز جب جواہرلال نہرو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں موجود نہیں تھے دفتر میں ڈاک آئی جو مجھے سونپ دی گئی۔ اس میں ایک لفافہ جواہرلال نہرو کے نام تھا اور پتہ مہاتما گاندھی کا لکھا ہوا تھا۔ اس وقت مجھ سے ایک جرم سرزد ہوا جس کا انکشاف میں آج کر رہا ہوں۔ مجھے کوئی حق مہاتما جی کے جواہرلال نہرو کے نام اس ذاتی خط کو کھولنے کا نہیں تھا

لیکن مجھ سے رہا نہیں گیا اور نہایت احتیاط سے میں نے اس خط کو کھول کر پڑھ لیا۔ مہاتما جی نے جواہرلال کو لکھا تھا کہ اگر تم تکلیف اور پریشانی محسوس کر رہے ہو تو میں تمہیں کسی کالج میں پروفیسری دلانے کی فوراً کوشش کر سکتا ہوں۔ میں نے نہایت احتیاط سے لفافہ بند کر دیا اور دوسرے دن پنڈت جواہرلال نہرو کو لفافہ مل گیا۔ انھیں یا کسی کو پتہ نہیں چلنے پایا کہ میں مہاتما جی کا خط پڑھ چکا ہوں۔ اس وقت مجھے اس امر کا علم اور احساس ہوا کہ باپ بیٹے کی کشیدگی یہاں تک پہونچ چکی ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ ہر سال ایک دن پنڈت موتی لال نہرو لگ بھگ دس ہزار روپے جواہرلال کے نام کرنٹ اکاؤنٹ میں بینک میں جمع کر دیتے تھے تاکہ سال بھر تک انھیں اپنے ذاتی اخراجات کے لئے باپ سے کچھ مانگنا نہ پڑے۔ لیکن جب مذکورہ بالا کشمکش پیدا ہو گئی تو اس سال بددلی کی وجہ سے موتی لال جی نے ایسا نہیں کیا تھا جس سے یہ نازک حالت پیدا ہو گئی تھی۔

ادھر دیش بندھو داس اور موتی لال نہرو وغیرہ کی قائم کردہ سوراج پارٹی کاؤنسلوں اور اسمبلیوں پر کانگریس کا قبضہ جمانے کی کشمکش جاری کئے ہوئے تھی ادھر اس تجویز کے خلاف مہاتما جی کے پیرو اپنی کوششیں جاری کئے ہوئے تھے۔ کانگریس میں ایک تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت پنڈت جواہرلال نہرو نے انگلستان کی سیاست اور سیاسی روایتوں کی روشنی میں ایک سمجھوتہ (Compromise) پیش کیا۔ وہ سمجھوتہ یہ تھا کہ کانگریس بحیثیت مجموعی انتخابات نہ لڑے۔ لیکن کانگریس کے ممبروں کو فرداً فرداً اس کی آزادی ہو کہ وہ انتخابات میں حصہ لیں۔ یہ تجویز دلی میں کانگریس کے ایک خاص اجلاس میں پاس ہو گئی اور پنڈت جواہرلال نہرو کی کوششوں سے کانگریس ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ گئی۔ نہایت روشن خیالانہ اور مدبرانہ تجویز تھی۔ آنند بھون کی فضا بھی اب مکدر نہیں رہی تھی۔ اس طرح کانگریس نے ہندوستان کی آئینی مجالس پر الیکشن لڑ کر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ دلی اسمبلی میں سوراجیہ پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ پیش آیا جو مجھ سے متعلق ہے۔ پنڈت موتی لال کو ایک ایسے سکریٹری کی ضرورت پڑ گئی جو پارلیمنٹ کے کاموں میں ان کی مدد کر سکے۔ ان کی نظر انتخاب مجھ پر پڑ گئی۔ یہ بات میرے لئے باعثِ فخر تھی کیونکہ اس منصب کے لئے غیر معمولی قابلیت کی ضرورت کا احساس کر کے پنڈت موتی لال نہرو نے میرا انتخاب کیا تھا اور نہایت محبت سے مجھے اس جگہ کی دعوت دی تھی۔ جواہرلال نہرو مجھے ایک کنارے لے گئے اور بتایا کہ پاپا کا سکریٹری ہونے کا مشورہ میں تمہیں نہ دوں گا۔ جب یہ بات پنڈت موتی لال نہرو کو معلوم ہوئی تو ایک عرصہ کے لئے وہ جواہرلال نہرو سے کافی ناخوش ہو گئے۔ لیکن جواہرلال نہرو نے مجھے صحیح مشورہ دیا تھا۔ وہ میرے کردار سے واقف ہو چکے تھے اور جانتے تھے کہ قابلیت سے قطع نظر جس مستعدی، مشقت اور کئی دیگر لوازم کی اس جگہ کے لئے ضرورت ہے وہ میرے مزاج و کردار میں نہیں ہیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ کے ولی صاحب اور بعد کو ہندوستان کی ناقابلِ فراموش ہستی رفیع احمد قدوائی نے اس منصب کو سنبھالا۔

۱۹۲۶ء کی کانگریس کا اجلاس آسام کی ریاست میں ضلع گوہاٹی میں ہوا جس کے صدر سری نواس آینگر مرحوم تھے۔ جن سے پنڈت موتی لال نہرو کی ذرا کم پٹتی تھی۔ اس اجلاس میں کانگریس کے سکریٹری رنگا سوامی آینگر چنے گئے۔ کانگریس کا دفتر مدراس منتقل ہو گیا۔ میں مدراس نہیں جا سکتا تھا اس لئے میں انڈر سکریٹری کے عہدے سے مستعفی ہو گیا۔ اس اجلاس کے بعد اندازاً دو برس کے لئے پنڈت جواہرلال نہرو نے یورپ کے ممالک کا وہ سفر کیا جو غالباً ان کی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم واقعہ ہے۔ اس سفر میں بڑے ملکوں کی سیاست اور عالمی سیاست کا جواہرلال نہرو نے اتنا گہرا مطالعہ کیا کہ عالمی سیاست کے وہ دنیا میں سب سے بڑے ماہر بن گئے۔ اتنے بڑے ماہر کہ خود میرے سامنے مہاتما گاندھی نے اعلانیہ اعتراف کیا کہ بین الاقوامی سیاست میں جواہرلال میرے گرو ہیں۔ اسی سفر نے جواہرلال میں وہ صلاحیت پیدا کر دی کہ انھوں نے ہندوستان کی خارجہ پالیسی کو ساری دنیا میں سب سے روشن خیال

پالیسی بنا دیا - اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دے دیا - اس سفر میں جواہرلال نہرو نے مجھے بتایا کہ انھیں مسولینی اور ہٹلر نے بہت بُلانا چاہا اور اپنا ہم خیال بنانا چاہا لیکن جواہرلال نہرو نے فاشزم اور نازی ازم کے خطروں کا احساس کر لیا تھا اور وہ اس دام میں نہیں پھنسے - اس سفر میں یورپ کے مختلف ممالک سے جواہرلال نے مجھے پچیس تیس خط بھیجے تھے - یہ خطوط میں اپنے لااُبالی مزاج کا شکار ہو کر کھو چکا ہوں اور ایک مدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ ان خطوط کو کھو کر میں نے ایک ناقابلِ معافی جُرم کیا ہے -

میں اب الٰہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہو چکا تھا - جواہرلال نہرو سے کبھی کبھی ملاقاتیں ہو جاتی تھیں - ایک بار اسی دوران میں جب وہ آنند بھون آئے ہوئے تھے میں ان سے ملنے گیا - وہ برسوں تک مجھے رگھوپتی کہا کرتے تھے لیکن یونیورسٹی میں میں سہائے صاحب ہو گیا تھا یعنی رگھوپتی سہائے کا آخری ٹکڑا میرا نام بن گیا تھا - میں نے بے خیالی میں یہ کہہ کر اطلاع کرائی کہ سہائے صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں - وہ اس نام کو پہچان نہیں سکے - جب وہ باہر آ کر مجھ سے ملے تو یہ کہتے ہوئے اندر لے گئے کہ اب آپ سہائے صاحب ہو گئے کچھ دنوں میں صرف ہائے صاحب نہ رہ جائیں - اچھا اب یادوں کے باب کو ختم کرتا ہوں اور اس مضمون کے آخر میں کچھ تاثرات قلمبند کرتا ہوں - لیکن ایک یاد عالمِ فراموشی سے ابھر آئی ہے - ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں جواہرلال نہرو اور رفیع احمد قدوائی نے مشورہ کر کے طے کیا کہ اتر پردیش کے چناؤ میں میں کانگریس کی طرف سے کھڑا ہو جاؤں - لیکن اب میں عملی سیاست سے الگ ہو چکا تھا اور میں نے اظہارِ معذرت کر دیا -

آزادی کے بعد جواہرلال نہرو کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں - محض عوام نہیں بلکہ ملک کے خواص اور بڑے سے بڑے مفکروں نے عالمی سیاست کے سلسلے میں انھیں بجا طور پر جگت گرو مانا ہے - اب جواہرلال امر ہو چکے ہیں اور اس صدی کی تاریخ ان کے کارناموں کے بغیر ہرگز مکمل نہیں سمجھی جا سکتی - میں اکثر دل ہی دل میں یہ سوچتا ہوں کہ جواہرلال نہرو اور میں اس قدر باہمی قرب اور ہم آہنگی کیوں محسوس کرتے تھے - میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ مشرقی اور مغربی، قدیم اور جدید کلچر کا جو سنگم ہندوستان کو خود تکمیلی کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے لازمی ہے - وہی سنگم یا وہی امتزاج ہم دونوں چاہتے تھے - نہ محض مغربی زندگی سے کام چلنے والا ہے، نہ صرف بھارت ماتا، بھارت ماتا پکارنے سے کام چلنے والا ہے - ہم دونوں کے دل ایک ہی ساز کے پردوں کی دھڑکن تھے -

۲۱ - مارچ ۱۹۶۴ء کو جب میں دلّی میں موجود تھا تو ایک پیام جواہرلال نہرو کے یہاں سے میرے نام آیا کہ پنڈت جی تمھیں یاد کر رہے ہیں - ان کے یہاں دو تین شاعروں کی چھوٹی سی نشست اسی دن رکھی گئی تھی - وہ جب مجھ سے ملے تو دیر تک میرا ہاتھ نہیں چھوڑا - ہم دونوں اپنے آنسوؤں کو روکے ہوئے تھے - میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھ سے صرف چھ سات برس بڑے ہیں - آپ کو کہاں سے یہ حق پہونچ گیا کہ میں تو چلتا پھرتا رہوں اور آپ اس قدر بیمار پڑ جائیں - اس جملے کے خاموش تاثرات کو میں نے کچھ دیر تک آنکھیں بھر کے ان کے چہرے پر دیکھا - دن ڈوبے صحبت ختم ہوئی - میں جواہرلال نہرو، اندرا گاندھی اور لال بہادر شاستری سے رخصت لے کر بھاری دل سے دلّی میں اپنی جائے قیام پر آ گیا - مجھے بعد کو لوگوں نے بتایا کہ میرے چلے آنے کے بعد غیر معمولی شفقت اور بہت سی یادوں کی تھرتھراہٹوں کے ساتھ جواہرلال نہرو میرا ذکر کرتے رہے - مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ہم لوگوں کی آخری ملاقات تھی -

بسمل سعیدی

سیلِ غم

ہو گئی ساری داستاں ہمہ غم
از زمیں تا بہ آسماں ہمہ غم

غم ہی غم صبح، شام غم ہی غم
زندگی ہے تمام غم ہی غم

غم ہی غم ہے تمام عالم میں
غرق، عالم تمام ہے غم میں

مہر غمگیں ہے، ماہ غمگیں ہے
کل سفید و سیاہ غمگیں ہے

غم زدہ غایت و غرض غمگیں
ہے غمیں جوہر و عرض غمگیں

عام اک حسِ مشترک غم ہے
شرق سے لے کے غرب تک غم ہے

پھول غمگیں ہیں باغ غمگیں ہیں
دل ہیں غمگیں دماغ غمگیں ہیں

قیس و لیلیٰ و ساربان غمگیں
کارواں کا ہے کارواں غمگیں

جس قدر غم ہے کس قدر کم ہے
مرگِ انسانیت کا ماتم ہے

ملک در ملک، شہر در شہر آہ
ہر طرف غم ہی غم، خدا کی پناہ

یہ کوئی غم کدہ ہے یا دہلی
کوئی ماتم کدہ ہے یا دہلی

موت کا دوش ہے کہ دھرتی ہے
دوش پر زندگی کی ارتھی ہے

ستم و جورِ آسمانی سے
اٹھ گئے آج دارِ فانی سے

رہ نمائے جہاں جواہر لال
میرِ ہر کارواں جواہر لال

اے بدا دورِ چرخ بد اسلوب
ہو گیا مہرِ نیمروز غروب

دوپہر کو ہوئی ہے آج وہ شام
روک دی جس نے گردشِ ایام

جسدِ تاریخ جیسے ختم ہوا
رک گیا یوں قلمِ مورخ کا

لکھ گیا داستانِ آزادی
رہبرِ کاروانِ آزادی

کر گیا ملک و قوم کو آزاد
خاتمِ دورِ جبر و استبداد

ہو گئی قدرِ ہر روایت ختم
شرف و مجدِ آدمیت ختم

دامنِ کائنات نم نہ رہا　　چشمِ ہستی میں اشکِ غم نہ رہا
کس کے مرنے پر آہ روئیں گے ہم　　موت اب کس کی ہوگی قابلِ غم
حاملِ وصفِ بے شمار تھے وہ　　کتنے اچھوں کی یادگار تھے وہ
اہلِ فضل ان میں کتنے شامل تھے　　کس قدر جامعِ فضائل تھے
آج کس کس سے ہم ہوئے محروم　　ان سے زندہ تھے کس قدر مرحوم
شخصیت ہو تو شخصیت ایسی　　مرتبت ہو تو مرتبت ایسی
اُن کی محبوبیت میں عظمت تھی　　اور عظمت میں ان کی محبوبی
ان کا انداز کتنا پیارا تھا　　جامہ زیبی نے قول ہارا تھا
ان کے غصّے میں پیار شامل تھا　　شامل ان کے دماغ میں دل تھا
صاحبِ طرز مالکِ تحریر　　مایۂ ناز وہ ادیبِ شہیر
کتنی مطبوعِ طبع مطبوعات　　وجہِ تالیفِ قلب تصنیفات
جن سے محظوظ و مستفید ہوا　　روس، انگلینڈ، جرمن امریکہ
اُن کی عزّت زمانے بھر میں تھی　　اور اتنی ہی جتنی گھر میں تھی
متاثّر تھا ان سے سارا جہاں　　امنِ عالم کی تھے وہ رُوحِ رواں
جنگ سے جس جگہ گریز ہو ننگ　　تھا وہاں ذہن میں تصوّرِ جنگ
ان کا دَورِ وزارتِ عظمیٰ　　بابِ زرّیں ہے اک سیاست کا
تھی زمانے میں بے عدیل و نظیر　　ان کی فہم و فراست و تدبیر
اب کہاں پاسبانِ ملک ایسے　　نیّرِ آسمانِ ملک ایسے
ہاں مگر وہ غروب ہو کر بھی　　دے گئے روشنی ہمیں اپنی
سرد ہو کر بھی آفتابِ حیات　　کر گیا ہم کو گرمِ عزم و ثبات
اُن کے آدرش ہم نہ بھولیں گے　　عمر بھر اُن کا غم نہ بھولیں گے
یاد رکھیں گے زندگی اُن کی　　زندگی اب ہے پیروی اُن کی

ہر رہِ پیچ و خم پہ چلنا ہے
اُن کے نقشِ قدم پہ چلنا ہے

کرشن موہن

کرم یوگی نہرو

اے یوگی کیوں توڑ دئے تو نے عہد و پیمان
سب کو روتا چھوڑ گیا اپنے غم میں ہلکان
تیرا جیون تھا سنسار کی شان
کرم یوگ کا مان
مانو پریم کی خاطر تو نے تن من دھن سے
کام کیا دن رین
تج کر سب سکھ چین
صدیاں بیتیں تو پیدا ہو تجھ سا راہنما
روز کہاں آتے ہیں جگ میں تجھ سے من سمراٹ
جیون کا سمان لئے تو اترا کال کے گھاٹ

شانتی میں بھی اک شکتی ہے
مانو پریم ایشور بھکتی ہے
تو نے ہمیں بتایا
تیاگ کے تن کی مایا

اے آزادی کے مندر کے پریم پجاری
آج ترے انتم درشن کو
آئے ہیں لاکھوں نر ناری
آنکھیں کھول انھیں پہچان
دکھ میں ہیں سارے سنساری
مانو جیون کا آدرش رہا ہے تیرا یوگ
آج ترے اٹھ جانے سے ہر دل پر چھایا سوگ

پھول، تری پتیاں بکھری ہیں لیکن تیری خوشبو
رہتی دنیا تک من مہکائے گی
تو نے اپنے پران دئے ہیں تیاگ لے سورگ سہاگ
لیکن تیرا کام امٹ ہے، تیرا نام امر
اب تیرے پد چن ہوں گے رہبر

———

میں خود اپنا سوگوار

جب سے بیدار ہوئے ہیں مرے احساس و شعور
جادۂ زیست پہ نظروں سے رہا گرمِ سفر

وقت نے جو بھی کہا، بڑھ کے سنا ہے میں نے
ایک اک موڑ کو پلکوں سے چنا ہے میں نے

آج تک قافلۂ قوم و وطن کے ہمراہ
کبھی مسرور ہوا ہوں، کبھی مغموم رہا

گلستانوں سے بیابانوں سے گزرا ہوں میں
کہیں جھجکا، کہیں ٹھٹکا، کہیں ٹھہرا ہوں میں

ملک کی آن بڑھانے کے طریقے سوچے
ایک اک خم پہ لئے اپنے تفکر کے دیئے

قوم کا درد بٹانے کے جتن کرتا رہا
ایک اک موڑ کو موضوعِ سخن کرتا رہا

جب بھی بہکے ہیں قدم، میں نے سنبھالا ہے قلم
واقعہ کوئی ہوا — طبع رواں جاگی ہے

جب بھی الجھی ہے نظر، نظم لکھی ہے میں نے
بات کچھ بھی ہو مگر، نظم لکھی ہے میں نے

لیکن اس حادثۂ قوم و وطن کی خاطر
کوئی شعلہ نہ مری شمعِ سخن سے لپکا
کوئی مصرعہ مرے ہونٹوں سے نہ چھوٹا اب تک
کوئی آنسو نہ مری چشمِ قلم سے ٹپکا

ہر بلکتا ہوا انسان بلاتا ہے مجھے
خونِ دل، خونِ جگر دے کے کوئی نوحہ لکھ

مجھ کو ایک اک دلِ پُر درد صدا دیتا ہے
آدمیت کا رخِ زرد صدا دیتا ہے

دیکھ — اقوامِ زمانہ کا جگر چاک ہوا
نیکیٔ قلبِ بشر کا کوئی مسکن نہ رہا

دیکھ، انسان کی عظمت کا ستارا ٹوٹا
نکہت و نور نگاہی کا منارا ٹوٹا

خاک بر سر ہیں کسی سمت خرد کے انداز
آج رو رو دیا آئینۂ ادراکِ حیات

سر بزانو ہے کسی سمت جنونِ پیہم
لڑکھڑاتا نظر آتا ہے یقینِ محکم

ہر تمنائے مسرت ہے پریشاں خاطر
دلِ امروز دھڑکنے کی ادا بھول گیا

ہر طرف شور ہے، ہر سمت بپا ماتم ہے
نبضِ ہستی کی دھمک آج بہت مدھم ہے

اٹھ گیا وہ کہ جو تھا دوست زمانے بھر کا
ایک پیغامبرِ امن داماں رُد ٹھ گیا
سب کا غم خوار، ہر انسان کا ہمدرد اٹھا
اک مجاہد نہ رہا، ایک جواں مرد اٹھا

ٹینک کی گونج گرج کے لئے بنسی کی تان
جنگ بازوں میں رہا ذکرِ محبت بن کر
فوج کے بینڈ کو دیتا ہوا سنگیت گیا
رزم گاہوں میں لئے اپنے مدھر گیت گیا

جس کی خواہش تھی کہ ہو عظمتِ ہستی کو فروغ
آدمیت کا پرستار اٹھا دنیا سے
ذہن میں جس کے رہی ایک مثالی دُنیا
اپنے خوابوں میں لئے 'جنگ سے خالی دنیا'

کتنے ہی ملک ہیں اس مے کدۂ عالم میں
عرصۂ دہر میں کیا جانے ہیں کتنی قومیں
جن کو مے خواری تھی مرغوب اسی جام کے ساتھ
جن کی آزادی ہے منسوب اسی نام کے ساتھ

درسِ اخلاص ہو، یا عزم و عمل کا پیغام
واقعہ یہ ہے کہ اس مرد کے احسانوں سے
کوئی بات اس کی فراموش نہیں ہو سکتی
نسل انساں کی سبک دوش نہیں ہو سکتی

زیست کا قافلۂ گرمِ سفر پوچھتا ہے
آج جو بھی ہے، جہاں بھی ہے، اسی سوچ میں ہے
دھند میں ڈوب گئی راہگذر — کیا ہوگا؟
گُل ہوئی روشنیٔ فکر و نظر — کیا ہوگا؟

رو، اس اک حادثۂ زیست پہ رو اے شاعر!
ملک و ملت کی سیہ پوش نگاہوں نے کہا
خونِ دل خونِ جگر سے کوئی نوحہ لکھ
میرے احباب کی خاموش کراہوں نے کہا

شدتِ غم سے دُکا عصرِ رواں کا رہوار
ایک وہ روح گئی ہے کہ زمیں کانپ گئی
فرطِ آلام سے وقتِ گزراں چیخ اُٹھا
ایک وہ فرد اُٹھا ہے کہ جہاں چیخ اُٹھا

یہ قیامت کی گھڑی ایسی اچانک آئی
شیروانی سے گرا ٹوٹ کے اک سُرخ گلاب
چشمِ ہستی سے یکایک نکل آئے آنسو
وادیٔ موت میں آوارہ ہوئی ہے خوشبو

کس کی آغوش میں پائیں گے جگہ دیوانے
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں سوال اُبھرا ہے
کون بیمارِ محبت کا مسیحا ہوگا؟
کیسے اس زخمِ دل و جاں کا مداوا ہوگا؟

اپنی تاریخ کا اک بابِ حسیں ختم ہوا
قہر ہے قہر — جوانوں کا کلیجہ نہ رہا
اپنی تعمیر کا ہر گنبد و محراب گیا
کیا قیامت ہے کہ بچوں کا حسیں خواب گیا

زندگی اب بھی ہے، جینے کی جسارت نہ رہی
جام و ساغر ہیں دھرے، بادۂ گلرنگ نہیں
پرِ پرواز تو ہے، جراٴتِ پرواز گئی
ساز ہاتھوں میں رہا ساز کی آواز گئی

ارتقاء سر بگریباں ہے عزائم خاموش · صبح تو سوگ میں ہے، کون سنبھالے اس کو
مرثیہ خواں ہو کہ اب وہ دلِ پُر سوز نہیں · قوم کے ناز اُٹھانے کا سلیقہ کس کو؟

راہِ پُرخارِ سیاست کے خم و پیچ میں بھی · اب کسے ہوگی بھلا پیار کی جنّت کی تلاش
کون ماضی کے اُجالوں کو سمجھ پائے گا · کس کے امکان میں ہوگی نئے بھارت کی تلاش

امتزاجِ عمل و جذبہ تھی جس کی ہستی · پیش کرتے ہی رہے علم و ادب جس کو خراج
ذہن میں حسن، نگاہوں میں شعورِ تاریخ · شیر کا دل تھا جو سینے میں تو شاعر کا مزاج

ہر نفس وہم روایات سے لڑتا ہی رہا · ہر قدم ایک نیا باغ لگایا اس نے
زندگی جب بھی لُٹی، اس کی نظر چیخ اُٹھی · روشنی جب بھی گھٹی، خود کو جلایا اس نے

سخت تر مرحلۂ دار و رسن آئے - مگر · ہاتھ سے عظمتِ کردار کا دامن نہ چھُٹا
اس کے چہرے پہ کوئی گردِ مہ و سال نہ تھی · یہ وہ بوڑھا تھا کہ جس سے کبھی بچپن نہ چھُٹا

دوستوں کا ہے تقاضا میں لکھوں نظم - مگر
مجھ پہ جو بیت رہی ہے وہ کوئی کیا جانے
یوں تو ان میں سے ہر اک فرد ہے مخلص پھر بھی
کون ایسا ہے جو بڑھ کر مرا غم پہچانے

میری دُنیا میں بپا موت کا سناٹا ہے · لئے جاتا ہے جو سانس اب بھی وہ تنہا میں ہوں
سامنے میرے کئی تازہ جنازے ہیں دھرے · جن پہ رونے کے لئے ایک اکیلا میں ہوں

یہ جنازہ ہے بصیرت کا - وہ ہے فکر کی لاش · یہ جنازہ ہے مری راہ کا — وہ منزل کا
یہ مرے ذہن کا مردہ - وہ نگاہوں کی ہے لاش · یہ مرے قلب کی میت — وہ جنازہ دل کا

اس طرف زیرِ کفن ہے مرے کنبے کا بزرگ · اس طرف میرے بھرے گھر کا ہے لاشہ - دیکھو
یہ مرے بھائی کی میت - وہ مرے چاچا کی · یہ، مرے کاندھے پہ، خود میرا جنازہ دیکھو

مہر بر لب جو ہُوا ہوں تو یہ مجبوری ہے · ایک دو غم مجھے ملتے تو انھیں کہہ لیتا
داغ ہی داغ ہیں سینے میں، جگر چاک ہی چاک · زخم دو چار جو کھِلتے تو انھیں سہہ لیتا

موج در موج بڑھا جاتا ہے سیلابِ الم
ڈوبنے والا ہوں - تنکے کا سہارا دے دو
دوستو! آج تقاضائے سخن کے بدلے
بن پڑے تم سے تو آؤ مجھے پُرسا دے دو

جواہر لال نہرو
زندگی کی جھلکیاں



بیٹی اور نواسوں کے ...



۱۹۱۲ء میں
اپنے والد کے ساتھ



کملا نہرو کے ساتھ شادی کے بعد



بیرسٹر کے لباس میں



کملا نہرو

اپنے رفیقوں کے ساتھ

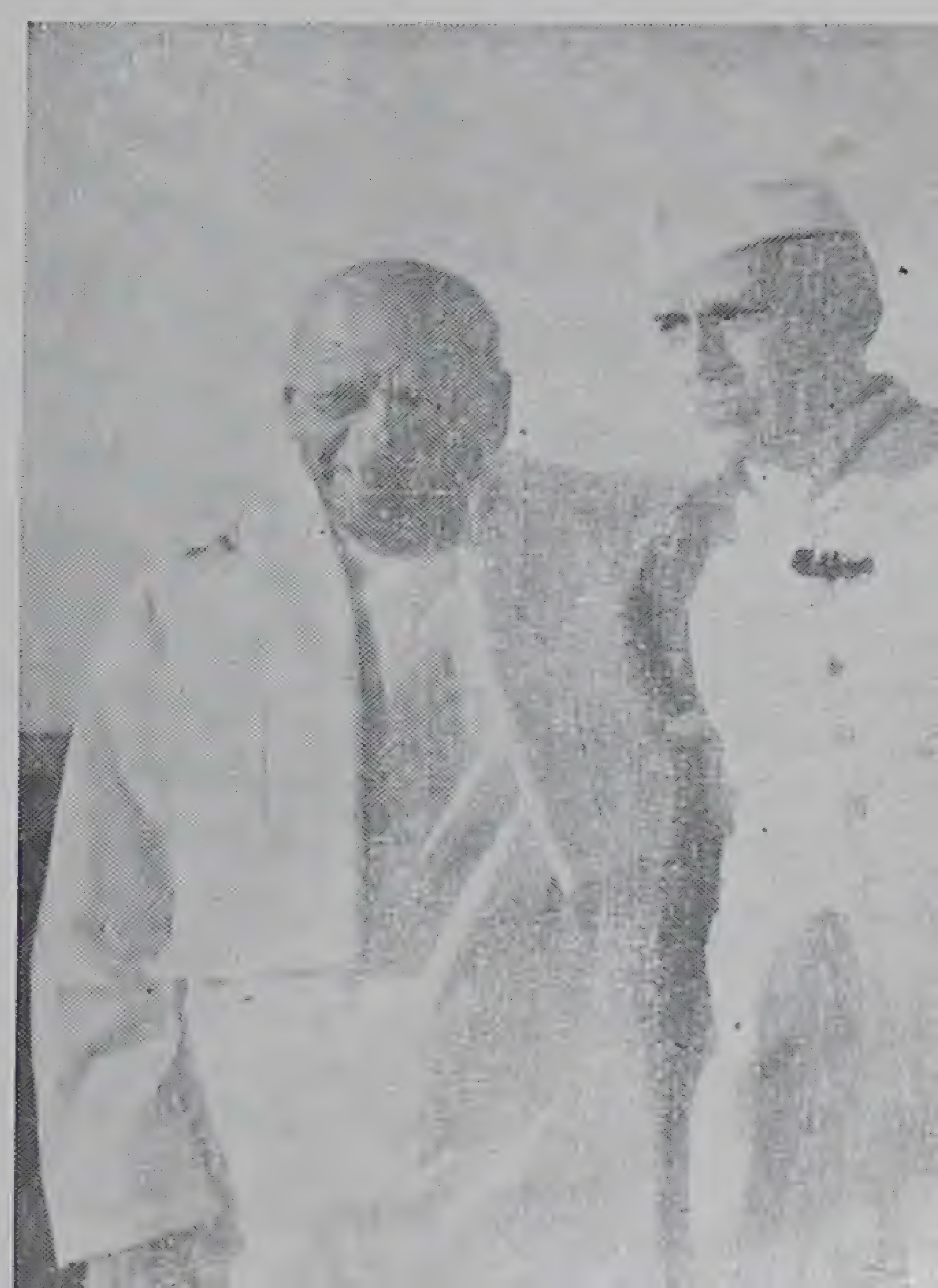


مولانا آزاد کے ساتھ



خان عبدالغفار خاں کے ساتھ

سردار پٹیل کے ساتھ



ڈاکٹر راجندر پرساد کے ساتھ



خواجہ احمد فاروقی

افسانۂ آں شبے کہ با یار گزشت

یادش بخیر، میرٹھ کالج بھی عجیب ادارہ تھا اور ۳۵ء ۳۶ء کا زمانہ اس سے بھی عجیب تر۔ ہر طرف مقدمۂ سازش میرٹھ کے چرچے تھے۔ مظفر احمد اور شوکت عثمانی کی کہانیاں الف لیلہ کی طرح مشہور ہو گئی تھیں۔ کالج میں Kationalist Association لنڈن ٹائمس، ہیرٹ جرنل اور ہریجن کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ پارٹی اور کانگریس کا ہر جگہ ذکر تھا۔ کالج کے پرنسپل کرنل ٹی اف اوڈانل ایک آئرش تھے جو وائسرائے کے اے ڈی سی ہونے کے باوجود ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے بڑی ہمدردی رکھتے تھے۔ میں اس زمانہ میں صوبائی اسٹوڈنٹس کانگریس کی مجلسِ عاملہ کا ممبر اور نائب صدر تھا۔ ان صحبتوں نے عروقِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیا تھا، دل میں عجیب قسم کا ولولہ تھا۔ خودی بہت بڑھ گئی تھی اور "یزداں بکمند آور" سے کم، طبیعت کسی چیز پر راضی نہ ہوتی تھی۔ نہ معلوم اِترا ہٹ تھی یا بڑے بننے کا شوق یا کسی مُرشد کی تلاش یا یہ جذبہ کہ ان بڑوں کی چھوٹ ہم پر بھی پڑ جائے۔ شاید ہی دلی اور میرٹھ میں کوئی اہم جلسہ ایسا ہوتا ہو جہاں میں نہ پہنچتا ہوں۔ دہلی میں خالدہ ادیب خانم آئیں اور میں صفوں کو چیرتا ہوا پہلی قطار تک پہنچ گیا۔ ٹیگور میرٹھ آئے، میں جب تک روبرو نہ بیٹھ گیا چین نہیں آیا۔ پنڈت جی مسز ارونا آصف علی کے ساتھ میرٹھ آئے، میں نہ صرف ان کے پاس پہنچ گیا بلکہ اپنا دعوت نامہ بھی پیش کر دیا۔ "پنڈت جی ہمارے کالج میں لکچر دے دیجئے۔"

پنڈت جی جیسے بھرے بیٹھے ہوں۔ "جی نہیں میں الکشن کے لئے آیا ہوں۔ الکشن کو اپنے دماغ سے Switch off نہیں کر سکتا۔ کیسا کالج۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔"

شمشیر کی یہ عُریانی دیکھنے کے قابل تھی!

میں نے مؤدبانہ عرض کیا "اس الیکشن کی اہمیت ہی پر کالج میں تقریر کر دیجئے۔"

میری توقع کے خلاف اتنی دیر میں ان کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ اور اب وہ سرتاپا لُطف و کرم تھے۔ فرمایا: "عقلمند تم نے مجھے پہلے سے کیوں نہ لکھ دیا۔ اب تو ایک ایک منٹ بندھا ہوا ہے۔ تم لڑکوں کو میری طرف سے دعوت دے دو وہ یہاں آ جائیں ورنہ میرے اُوپر بوجھ رہے گا۔"

"وہ تو بغیر آپ کے بُلائے بھی آئیں گے۔ آپ فرماتے ہیں تو اُن سے کہہ بھی دوں گا۔"

"تم خفا تو نہیں ہوئے؟ میں اس کی پھر کبھی تلافی کر دوں گا۔"

"آپ سے اور خفگی — اوّل تو یہ خفگی نہیں اور اگر ہے تو اس پر ہزار محبتیں قربان ہیں۔"

پنڈت جی کے چہرے پر جو 'عشق' کی سُرخی تھی اور جس سے ان کا پورا پیکرِ گل تاب ناک تھا وہ مجھے آج تک یاد ہے۔ اس الکشن کی معروفیت میں جب بلفظِ زمین کی طنابیں کھنچ گئی تھیں اور انھوں نے بیل گاڑی سے لے کر ہوائی جہاز تک ہر ممکن

ذریعہ سے سفر کرکے ہندوستان کی ساری زمین کو طے کر ڈالا تھا، اس عالم میں انھیں ایک معمولی لڑکے کی دل داری کا خیال رہے، وہ اس کی پیشانی سے محرومی کی سلوٹیں صاف کریں۔ اس سے پوچھیں کہ تم آزردہ تو نہیں ہوئے — معمولی بات نہیں ہے ؎

آوازۂ خلیل ز بنیادِ کعبہ نیست
مشہور گشت زاں کہ بآتش نکو نشست

پنڈت جی سے دوسری ملاقات ۴۷ء میں ہوئی، جامعہ کی جوبلی کے موقع پر، جب چاروں طرف وحشت اور بربریت کا طوفان برپا تھا اور ہماری شریف قدریں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی تھیں۔ ہر محفل میں فسادات کا ذکر تھا۔ اس نفرت، تعصب اور تنگ نظری کا، جو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس موقع پر معلّموں اور ذہنی قاعدوں کا کام کتنا اہم اور کتنا ضروری تھا، جامعہ کی جوبلی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ بقول آغا حیدر حسن دہلوی ذاکر صاحب نے لگاوٹ کی باتوں کا سرد سامان کیا تھا۔ میں اور سید اسد اللہ کاظمی[1] صاحب ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ آغا صاحب کا زیادہ وقت ہمارے ساتھ گزرتا تھا۔ ان کی مزے مزے کی باتیں اور حکائیتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔

اس موقع پر ذاکر صاحب نے ایک عجیب و غریب تقریر کی جس میں انھوں نے انسانیت، رواداری اور شرافت کی قدروں کے بچانے پر زور دیا اور ان چراغوں کی طرف اشارہ کیا جو جامعہ نے آندھیوں میں روشن کئے تھے۔ اس تقریر کی سحر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ مجمع میں ہر شخص کی آنکھیں نم ناک تھیں۔ جب جلسہ ختم ہو گیا تو کاظمی صاحب مجھے پکڑے ہوئے پنڈت جی کے پاس لے گئے اور ان سے میرا تعارف کرایا۔ "پنڈت جی یہ فاروقی صاحب ہیں۔ آپ کے پرستاروں میں ہیں۔ یہ بھی ہوا کے راستے میں چراغ جلانا چاہتے ہیں اور جامعہ کے لیے حافظ[2] صدیق سے اینٹھ کر ۲۵ ہزار کا چیک بھی لائے ہیں۔"

ان کے ریشمی ہاتھوں کا لمس مجھے آج تک یاد ہے۔ کوئی ڈیڑھ منٹ تک وہ بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑے رہے۔ میں نے انھیں دیکھا اور انھوں نے مجھے۔ دونوں کی آنکھیں فارغ از گریہ تھیں لیکن نہ انھوں نے کچھ کہا نہ میں نے ؎

امروز کہ چشمِ من و عشرتی بہم افتاد
باہم نگریستیم و گریستیم و گذشتیم

تیسری ملاقات اس وقت ہوئی جب پنڈت جی وزیر اعظم ہو چکے تھے، ۱۹۵۲ء میں۔ اس وقت میں دہلی کالج میں شعبۂ اردو کا صدر تھا۔ یہ ادارہ قدیم دلّی کالج کی اولادِ معنوی ہے۔ اس کے در و دیوار مجھ سے سرگوشیاں کرتے تھے کہ یہاں پھر ملاپ کا وہی کام ہونا چاہیے جو پہلے ماسٹر رام چندر نے اور بعد میں مولانا حالی نے کیا تھا۔ میں اردو زبان و ادب کے دائرے میں یہی کر سکتا تھا کہ ہند آریائی اور دراوڑی زبانوں کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دوں اور ایک سمپوزیم کی طرح ڈالوں جس میں رام دھاری سنگھ دنکر، آل احمد سرور، من متھ ناتھ گپت، پربھاکر ماچوے، چندر کانت بھٹ، لکشمی راگھون اور روات سائی جیسے ادیب شریک ہوں اور مختلف زبانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے ہندوستانی ادبیات میں وطن دوستی کے تصوّر پر بحث کریں۔

اس سمپوزیم کا ذکر ایک بزرگ کے سامنے آیا جو آج بھی اپنا نام ظاہر کرنے کے لیے تیار نہیں۔ انھوں نے فرمایا "یہ کام تو اس لائق ہے کہ پنڈت جی کو دعوت دی جائے۔ تمھاری ملاقات ہے؟"

میں نے عرض کیا "صاحب آپ بھولتے ہیں۔ چندہ کے ایک ادارے میں اردو کا معلّم ہوں۔ ملاقات ہے لیکن بہت سرسری دو دفعہ ملا ہوں۔ اب تو بھول بھی گئے ہوں گے۔"

فرمایا "نہیں جی کیا فضول بچھرایونی[3] باتیں کرتے ہو۔

---

[1] چیف آف یونسکو مشن بغداد
[2] حافظ محمد صدیق مرحوم سوداگر رئیس کان پور
[3] بچھرایوں ضلع مرادآباد کا ایک قصبہ۔ میرا مولد

ٹیلی فون کرو۔ وقت مقرر کرو۔ (پھر میرے پس و پیش کو دیکھ کر فرمایا) اچھا میں خود ٹیلی فون کرتا ہوں۔ تم خط بھیجو اور ابھی میرے سامنے لکھو۔"

میں نے پنڈت جی کو لکھا کہ "ہندوستانی کلچر کی عمارت جس مضبوط بنیاد پر قائم ہے وہ فکر و خیال کی مفاہمانہ روش ہے۔ اسی نے اس کلچر میں باوجود رنگارنگی کے ایک خاص قسم کی وحدت، وسعت، گہرائی اور گیرائی پیدا کر دی ہے۔ یہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان مختلف زبانوں کا ہونا ہماری ہمہ رنگ تہذیب کے حق میں برا نہیں ہے۔ الفاظ کا اختلاف اتنا اہم نہیں جتنے وہ خیالات اور ان کی یکسانی اہم ہے جو ان الفاظ کے پیچھے نظر آتی ہے۔ ہم یہ سمپوزیم اسی لیے منعقد کر رہے ہیں کہ مختلف ادیبوں سے روشناس ہوں، ان سے کچھ لیں اور ان کو کچھ دیں۔ اسی طرح ہندوستانی ادب کے کنگرے بلند ہو سکتے ہیں۔"

فوراً وقت مقرر ہو گیا اور خط کا جواب بھی معاً آ گیا۔

سردیوں کا زمانہ تھا اور صبح کا وقت، پنڈت جی ٹھیک آٹھ بجے ڈرائنگ روم میں تشریف لے آئے۔ گل ارمنی شیروانی، اس میں سرخ گلاب کی کلی لگی ہوئی۔ چہرہ گلاب سے زیادہ شگفتہ، جسم میں وہ چستی جس پر نوجوانوں کو رشک آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے آنے سے غیر معمولی طور پر خوش ہوں، جیسے اس مجمع میں صرف مجھ ہی سے تعلقات ہوں۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی ہی شفقت سے کہنے لگے "فاروقی صاحب آپ نے بہت اچھے کام کی ابتدا کی ہے۔ میرا جی بڑا خوش ہوا۔ یہ کام تو ایسا ہے کہ ایک اکیڈمی[1] کی طرف سے باقاعدہ اور مستقل طور پر کیا جائے۔ میں یہ کام بھی ضرور کروں گا۔ آپ کو معلوم ہے مجھے اس کام سے کتنی دلچسپی ہے۔ لیکن میں ابھی چین سے آیا ہوں اور اب پاکستان جانا ہے۔ معلوم نہیں کون سی تاریخ مقرر ہو اس لیے شاید سمپوزیم میں نہ آ سکوں، لاچاری ہے۔ لیکن اگر میں دہلی میں ہوا اور کوئی مانع قوی نہ ہوا تو ضرور حاضر ہوں گا۔"

۱؎ اس وقت ساہتیہ اکادمی وجود میں نہیں آئی تھی۔

اس "انکار" میں "اقرار" کا سارا لطف تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرا قد اونچا ہو گیا ہو، جیسے مجھے دولت مل گئی ہو۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے بلایا اور سمپوزیم کی پوری روداد سن کر میری ہمتوں کو دوبالا کیا — اس سے اندازہ کیجیے کہ ان کی میزانِ قدر میں ان باتوں کی کتنی اہمیت تھی اور جہاں کہیں ان کو کوئی تعمیری جذبہ نظر آتا تھا اس کی وہ کتنی قدر کرتے تھے۔ اس کی اگر کوئی وجہ تھی تو صرف یہ کہ خود ان کی ذات میں ان اعلیٰ قدروں کے چراغ روشن تھے۔

پنڈت جی سے چوتھی ملاقات لندن میں ہوئی۔ یہ واقعہ ۵ جولائی ۱۹۵۷ء کا ہے۔ میں راک فلر ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے مغربی یورپ کا سفر کر رہا تھا اور اس زمانہ میں لندن میں مقیم تھا۔ پنڈت جی نے ہندوستانی طلبا کو مخاطب کیا اور بڑی پاکیزہ تقریر کی۔ اس کا ایک جملہ اب تک میرے دل پر نقش ہے:

"آپ لوگ یہاں کی مادی آسائشوں میں رہ کر ہندوستان کے متعلق ایک خاص قسم کی تنقید کرنے لگتے ہیں۔ تنقید بری چیز نہیں میں اس کو پسند کرتا ہوں۔ بغیر اس کے ہم اپنی اصلاح نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر مسائل کو سامنے رکھا جائے جن سے ہم ان دس برسوں میں دوچار رہے ہیں تو میں کہوں گا کہ ہماری رفتار غیر اطمینان بخش نہیں رہی بقول شاعر ؎

اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں
گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھ کر چلے"

اس کے بعد ایک ایک طالب علم سے فرداً فرداً ملے اور اس کے کام کے متعلق غیر معمولی دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ "آپ کو یہاں کے کتب خانے بھی پسند آئے؟"

میں نے عرض کیا۔ "انڈیا آفس کا کتب خانہ تو اتنا اچھا ہے کہ بس نہیں چلتا کہ اس میں بیٹھے لگ جائیں اور میں اسے ہندوستان لے جاؤں۔"

فرمایا "خیر اپنی ضرورت کے بقدر عکس ضرور لے لیجیے گا

(پھر نصیحت کے طور پر فرمایا) انگریز قوم کی بڑائی اس کی علم دوستی میں ہے۔ انھوں نے صرف حال ہی کو ایک حقیقت نہیں سمجھا بلکہ ماضی کا احترام کیا ہے اور مستقبل پر نظر رکھی ہے۔ ہماری تقدیر کا انحصار بھی اسی حسن تناسب اور اسی علم و عرفان پر ہے۔"

میں ۱۹۵۸ء میں ہندوستان واپس آگیا اور ۱۹۵۹ء میں پنڈت جی کی کوشش سے دہلی یونیورسٹی میں اردو کا علیحدہ شعبہ قائم ہوگیا۔

میں نے یورپ کے کتب خانوں سے کچھ نایاب مخطوطات کے عکس بھی حاصل کئے جو دراصل اردو کی ادبی تاریخ کے گم شدہ اوراق ہیں۔ ادب کے حیات افروز عناصر سے واقفیت بہم پہنچانے اور اپنی کھوئی ہوئی دولت کو پھر پانے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ دہلی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو ان اہم مخطوطات کو حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع کرے۔ تاکہ ان مآخذ سے تاریخ اور تہذیب کے سمجھنے میں مدد مل سکے۔ اسی لیے شاید ایک مستشرق نے نصیحت کی تھی Know Thy Texts اس سلسلے کی پہلی دو کتابیں (فضلی کی کربل کتھا اور نواب اعظم الدولہ سرور کا عمدہ منتخبہ) پنڈت جی کے نام معنون کی گئیں۔

میرے انتساب کی عبارت یہ تھی:

" ہندوستان کے اس ادبی جواہر پارہ کو جو مغرب کے کتب خانوں میں تقریباً ڈیڑھ سو برس رہ کر پھر اپنے وطن کی محفلوں کو روشن کرنے آیا ہے، احترام اور خلوص کے ساتھ شری جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جن کی ذات گرامی ہندوستان کی بہترین تہذیبی اقدار کی محرم و محافظ رہی ہے۔"

پنڈت جی نے از راہ علم پروری اور دل نوازی نہ صرف اس انتساب کو شرف قبول بخشا بلکہ ان دو کتابوں کو لینے کے لیے بنفس نفیس دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بھی تشریف لائے اور انھوں نے تین گھنٹے ہمارے اساتذہ اور طلبا کے ساتھ صرف کرکے ہماری ہمتوں کو بڑھایا اور جو چھوٹا سا تہذیبی اور علمی کام ہم اپنے محدود دائرے میں کر رہے ہیں اس پر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

" میں اردو زیادہ جانوں یا نہ جانوں لیکن اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں کہ اردو کی جگہ کیا ہے ہند میں۔ کیا ہونی چاہیے اور وہ بھی خاص کر شہر دہلی میں۔ اس لیے مجھے خوشی ہوئی یہ معلوم کرکے کہ یہ شعبہ اردو کا دہلی یونی ورسٹی نے شروع کیا۔ کیوں کہ اگر دہلی یونی ورسٹی یہ کام نہ کرتی تو وہ ایک عجیب تکلیف وہ بات ہوتی۔ یہ کہ دلی اپنے ایک عزیز بچے کو پہچانتی نہیں کیونکہ اردو دلی میں پیدا ہوئی جیسا کہ پروفیسر فاروقی نے ابھی کہا۔ یوں تو اس کا پھیلاؤ بنا رہا اتر پردیش اور بہار کے کچھ حصوں میں۔ دلی اور لکھنؤ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ یوں بھی یہ ایک ادبی چیز ہے اور جو چیز اپنی ہے اس کی طرف توجہ نہ کرنا ایک غلط بات ہے۔ یہ ہماری دولت ہے لیکن اس کے علاوہ خود اردو بھی ایک کافی دولت مند چیز ہے...... بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ اردو کی طرف خاص توجہ ہو...... تاکہ اس کی جڑیں مضبوط ہوں تاکہ وقت آنے پر جب بھی، ہوا موافق ہو، وہ پوری قوت سے پھیل سکے۔ اب بھی کچھ کم نہیں پھیل رہی ہے لیکن یہ پھیلاؤ اور بھی چاہیے......

" تو غرض کہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہاں دہلی یونی ورسٹی نے یہ شعبۂ اردو چلایا ہے اور ڈیڑھ برس میں اس نے اچھا کام کیا ہے اور پانچ برس کا اور منصوبہ بنایا ہے۔ بنیادی کام ہے یہ۔ اور یقین ہے کہ اس سے فائدہ ہوگا۔ اردو جاننے والوں کو ہی نہیں سارے ملک کو۔ اس کام کو زور سے جاری رکھیں اور اس کے ساتھ اپنے سامنے تصویر رکھیں ― اردو کو عام لوگوں کی زبان بنانے کی ― اور آپس کا جو رشتہ ہے اسے بڑھائیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ چل پڑے۔

اس سے ہندی کو بھی فائدہ ہوگا اور اردو کو بھی۔"
پنڈت جی کے یمن قدم سے ہمارے اندر کام کا ایک نیا حوصلہ۔ ایک نئی توانائی پیدا ہوئی اور یہ شاخ، بردمند ہوگئی۔

ہماری یہ کتابیں آف سٹ اور ٹائپ میں چھپی تھیں۔ چاء کے موقع پر ایک صاحب اردو رسم خط کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کرنے لگے۔ اس موقع پر پنڈت جی نے اس کی خوبصورتی اور اس کے پُرمعنی اختصار پر اتنی بلیغ اور دلکش گفتگو کی کہ ہم سب حیران رہ گئے۔

پنڈت جی کے دل میں بڑی خواہش تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی کے تعلقات ہوں۔ یہ رکاوٹیں کم ہوں اور یہ پڑوسی ملک ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس خواہش کے پیش نظر انہیں دنوں ایک ہند و پاک ثقافتی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ ڈاکٹر تارا چند اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر چنے گئے اور میں اس کا سکریٹری منتخب ہوا۔

ڈاکٹر تارا چند میرے مخدوم ہیں اور بڑے فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ جلسے کے روز پنڈت جی سے کہنے لگے۔ "یہ پروفیسر فاروقی ہیں۔ کانفرنس کے سکریٹری۔ یہ سب کیا دھرا انہیں کا ہے۔" پنڈت جی نے بڑی دل نوازی سے فرمایا "میں جانتا ہوں یہ بڑے کام کے آدمی ہیں۔" اس کام میں بڑے بڑے نازک مقام آئے لیکن ان گتھیوں کو ان دونوں بزرگوں نے منٹوں میں سلجھا دیا اور ہم لوگوں کو، جو اُن کے چراغ کا ادنیٰ اثر تو ہیں، بڑی تقویت رہی کہ ہر مشکل ان کے ناخنِ تدبیر سے جلد دور ہو گئی۔

اگست ۱۹۶۱ء میں میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے امریکہ کی یونی ورسٹی آف وس کان سن میں چلا گیا۔ میرے دورانِ قیام میں (۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۳ء) پنڈت جی امریکہ تشریف لائے لیکن میں واشنگٹن سے اتنی دور اور منصبی کاموں میں اس طرح گھرا ہوا تھا کہ ان کی خدمتِ اشرف میں حاضر نہ ہو سکا۔ لیکن "نصف ملاقات" کی ایک عجیب و غریب بلکہ تاریخی صورت نکل آئی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ مے ڈی سن میں جہاں میں مقیم تھا،

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند تشریف لے آئے۔ وہ غریب کینسر میں مبتلا تھے اور زندگی کے دن گن رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ بڑی مایوسی کا وقت تھا لیکن وہ راضی برضا تھے اور ان کو خدا پر ایسا محکم یقین تھا کہ وہ کسی وقت بھی نا امید نہیں ہوئے بلکہ جس طرح وہ غیر ملکی دشمن سے لڑتے رہے تھے اسی طرح پامردی سے مرض کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ان کی دانشمندی حب الوطنی اور معاملہ فہمی کا میرے دل پر گہرا نقش ہے۔ ان کے پاس الجمعیۃ روزانہ آتا تھا۔ اس میں عثمان صاحب کا ایک اداریہ سہ لسانی فارمولہ پر شائع ہوا تو میں نے مولانا کو پڑھ کر سنایا۔ اس میں لکھا تھا کہ یو۔پی میں اس کی عجیب و غریب تعبیر کی گئی ہے کہ سہ لسانی فارمولہ میں ہندی، سنسکرت یا جنوبی ہند کی زبانیں اور انگریزی شامل ہے اور اردو اس فہرست سے یکسر خارج ہے۔ مجھے اس کا یقین نہیں آیا کہ یہ تعبیر ہو سکتی ہے بلکہ یہ شبہ ہوا کہ شاید اڈیٹر سے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ میں نے مولانا کے سامنے تجویز پیش کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں پنڈت جی کو ان کی طرف سے خط لکھوں تاکہ یہ معاملہ قطعی طور پر صاف ہو جائے اور غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔ انھوں نے اس رائے پر صاد کیا اور مسودہ کو پسند فرمایا۔ یہ خط اس وجہ سے اور زیادہ مؤثر ہو گیا کہ مولانا بسترِ مرگ پر تھے اور انھوں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے اس پر دستخط کئے تھے۔ پنڈت جی نے فوراً جواب دیا اور لکھا کہ میں نے اس معاملہ کی وزیر تعلیم سے مزید تصدیق کی۔ سہ لسانی فارمولہ کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اس میں (۱) ہندی شامل ہو جو سرکاری زبان ہے (۲) دوسرے کوئی یورپی زبان شامل ہو جس میں انگریزی بھی ہے (۳) تیسرے کوئی بھی جدید ہندوستانی زبان شامل ہو جس میں لازماً اردو کا بھی شمار ہے۔

میں نے امریکہ سے پنڈت جی کے اس خط کا ترجمہ کر کے اڈیٹر ہماری زبان کو رجسٹری سے بغرض اشاعت بھیجا تھا لیکن نہ معلوم اس پر کیا افتاد پڑی کہ وہ شائع نہیں ہو سکا اور مہینوں شارحینِ فارمولہ میں بحثیں چلتی رہیں۔

آخری مرتبہ میں نے پنڈت جی کو اپریل ۱۹۶۴ء میں دیکھا۔ میں ظلم ادارڈ کی سنٹرل کمیٹی کا ممبر تھا اور اس حیثیت سے میرا ان سے خصوصی تعارف وگیان بھون میں کرایا گیا۔ بیماری نے ان کو بے حد نڈھال کر دیا تھا لیکن ان کا عزم اسی طرح جوان اور حافظہ بدستور تھا۔ مجھے پہچان لیا اور قبل اس کے کہ میں مزاج پرسی کروں، فرمایا "اچھے ہیں آپ۔"

پنڈت جی کے انتقال پر رنج اور غم کے الفاظ معمولی نظر آتے ہیں اُن سے ہمارے دکھ کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میں تو اس رنج پر صبر بھی کرنے کے لئے تیار نہیں کہ یہ بھی ان کے ساتھ ایک قسم کی بے وفائی ہے جس کو میں روا نہیں رکھتا۔

ایک ستون تھا جو گر گیا، ایک روشنی تھی جو گل ہو گئی، ایک آئینہ تھا جس میں نئے ہندوستان کی تصویر تھی جو ٹوٹ گیا۔ ایک ساغرِ جم تھا جس میں جلوۂ آفاق کی جھلک تھی۔ جو ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا گیا۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

جواہر لال نہرو
بچپن میں ماں
کے ساتھ





شگفتہ مزاجی کے عالم میں

نواسے سے کھیل رہے ہیں





بچّوں کے ساتھ





ظفر احمد نظامی

...... اور شمع بجھ گئی

وہ ۱۹۱۶ء کی بسنت پنچمی کی ایک رنگین شام تھی جب بسنتی لباس پہنے عوام و خواص آمدِ بہار کی پُر مسرت تقریب کا جشن منا رہے تھے جسے ہندی دیومالا میں سرسوتی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ سرسوتی تمام علوم و فنون کی مقدس دیوی تسلیم کی جاتی ہے۔ اسی نشاط آفریں تقریب کا ایک حصہ اسی رنگین شام جواہرلال کو بھی کملا کول کے خوب صورت روپ میں ملا۔ کملا دلی کے ایک متمول تجارتی خاندان کی کشمیری دوشیزہ تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب پنڈت نہرو، جواہرلال کے نام سے انگلستان میں قانونی تعلیم ختم کر کے ایک بیرسٹر کی حیثیت سے الہ آباد بار میں وکالت شروع کرنے کے بعد عملی سیاست میں سرگرم حصہ لینے لگے تھے اور جنگِ آزادی کے سرفروش مجاہدوں کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔ لوکمانیہ تلک اور مہاتما گاندھی کی موجودگی میں جواہرلال نہرو صرف پنڈت موتی لال کے بیٹے کی حیثیت ہی سے روشناس تھے۔

زمانۂ قدیم سے ہی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ مجاہدانِ وطن نے اپنی دُلہنوں کی شکل تک نہیں دیکھی کہ جہاد کا اعلان سن کر میدانِ جنگ کی جانب دوڑ پڑے۔ انھیں شادی کے رنگین جوڑے سے زیادہ مقدس دلہن کی عزت سے محبت تھی، وہ اس کے لئے اپنی تمام مسرتیں قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ بالکل انھیں جاں بازوں کی طرح جواہرلال نہرو بھی عیش و عشرت کی زندگی سے منہ موڑ کر آزادی کی تحریک میں شریک ہو گئے، وہ وطن کی محبت کے نشہ سے سرشار تھے اور ہر طرح کی قربانی دے کر ملک کے پیروں میں پڑی ہوئی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دینا چاہتے تھے اور ایسے عالم میں انھیں ایسی شریکِ حیات مل گئی جو ہر طرح ان کی دل جوئی کر کے حوصلہ بڑھا کر اس مقصدِ عظیم کی تکمیل کے لئے کمربستہ کر سکتی تھی۔ یہ کملا کول تھی جو اپنے شوہر جواہرلال کی زندگی کو ایک نیا موڑ دینے والی قوت لے کر آئی تھی مگر جواہرلال کی ازدواجی زندگی قیدخانوں اور ہسپتالوں کے سلسلے کی ایک صبرآزما کڑی بن کر رہ گئی۔

کملا اپنے شوہر کی بعض خصوصیاتِ حسن کی مماثل تھی، وہ خوبصورت، اونچی پوری، نازک اندام، دُبلی پتلی، مغرورانہ انداز میں جذباتی، خود رائے اور فوری طور سے فیصلہ کرنے والی خاتون تھی جس کی آنکھوں میں مشرقی حیا کی جھلک جلوہ گر تھی۔ وہ بے پناہ حساس اور پسندیدگی کے معاملے میں انتہا پسند واقع ہوئی تھی۔ کشمیری خاتون ہونے کے باعث مشرقی تہذیب اور سلیقہ شعاری اس کی ہر ادا سے نمایاں تھی۔ وہ اجنبیوں کے درمیان خاموش رہتی اور واقف کاروں کے ساتھ انتہائی بے تکلفی سے پیش آتی۔ جواہرلال کے الفاظ میں "وہ بنیادی طور سے ایک ہندوستانی اور خاص طور سے ایک کشمیری لڑکی تھی جو حساس، مغرور، طفلانہ اور پختہ کار، نادان اور عقل مند تھی۔"

قدیم عقائد میں یقین رکھنے کے باعث اس کی تعلیم ہندو طریقے سے گھر ہی پر مکمل ہوئی تھی۔ وہ کسی کالج یا اسکول کی تعلیم یافتہ نہیں

تھی لیکن ایک حقیقی ہندوستانی لڑکی کے روپ میں اس نے وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر نئے ماحول میں مدغم ہونے کے لیے اپنے آپ کو جدید بنانے کی کوشش ضرور کی تھی۔ جواہر لال کو اس کی یہی ادا سب سے زیادہ پسند تھی کہ اس نے ہر مقام پر خود کو کامیابی کے ساتھ ایک صحیح ہندوستانی خاتون کے روپ میں پیش کیا۔ ان کے الفاظ میں "وہ ہندوستانی خواتین کا نشان بن گئی تھی تھی تو وہ حیرت انگیز طریقہ پر میرے ہندوستان کے خیالات کا مرکز بن جاتی تھی۔"

جواہر لال کے والدین اسے بے پناہ پسند کرتے تھے کیونکہ انھوں نے ہی اسے جواہر کے لیے منتخب کیا تھا۔ جواہر خود بھی اس سے بہت متاثر تھے جس کا اعتراف انھوں نے اپنے دوستوں کے نام لکھے گئے خطوط میں کیا ہے۔ جب شادی کے بعد پہلی مرتبہ وہ دُلھن بن کر آئی تو پنڈت موتی لال نہرو کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹ دیکھ کر متحیّر رہ گئی۔ اسے آنند بھون کی مغربی شان و شوکت میں خود کو سمونے میں بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ سادگی پسند زندگی کی قائل تھی اور ایک ایسے وقت میں جب ہندوستان کے عوام رہنے کے لئے جھونپڑوں کو ترس رہے تھے ایک عالی شان محل میں رہ کر وہ ان کی مفلسی اور ناداری کا مذاق نہیں اڑانا چاہتی تھی۔ ملک کی خدمت کا جذبہ اس کے دل میں ابتدا ہی سے موجزن تھا۔ ۲۰ء میں مہاتما گاندھی کے زیر اثر پنڈت موتی لال کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب آگیا اور انھوں نے ضرورت کی صرف چند اشیاء کے علاوہ تمام غیر ضروری چیزوں کا استعمال ترک کر دیا۔ اب کملا کے لئے ان کے ساتھ رہنا باعث تسکین و مسرّت بن گیا اور وہ اپنی ذات کو عوام میں شامل سمجھنے لگی۔ ابتدائی دنوں میں کملا اور جواہر کے درمیان آپسی نوک جھونک بھی رہی مگر ایک دوسرے کو سمجھنے کے بعد دونوں بے حد محتاط ہو گئے تھے اور اتحاد و یکسانیت کی فضا ہموار ہو گئی تھی۔

شادی کے ٹھیک اکیس ماہ بعد ۱۹- نومبر ۱۹۱۷ء میں کملا نے "اندرا پریہ درشنی" کو جنم دیا یہی ان کی پہلی اور آخری اولاد تھی۔ جواہر لال کی والدہ سروپ رانی اپنے پہلے بچّہ کی ولادت کے بعد سے بیمار رہنے لگی تھیں بالکل اسی طرح اندرا کی پیدائش کے بعد کملا کی علالت کا آغاز ہوا۔ اب کملا کو صرف ایک بیوی کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک بچّی کی ماں بن کر بھی اپنی ذمہ داریاں سنبھالنی تھیں۔ جواہر لال کی غیر معمولی مصروفیتوں نے کملا کو اندرا سے دل بہلانے کے مواقع بخشے۔

یوں سمجھئے کہ ازدواجی زندگی اور جواہر لال کے قید و بند کا دشوار ترین دور نیز کملا کی طویل علالت کے دل شکن سلسلے کا آغاز ساتھ ہی ساتھ ہوا۔ جواہر لال کو صرف اپنی کملا ہی کا خیال نہیں تھا بلکہ ملک کے کروڑوں انسانوں کی غلامی اور غریبی بھی ان کو اپنی طرف بلا رہی تھی، ملک انھیں پکار رہا تھا، اس کو ان کی شدید ضرورت تھی۔ انھوں نے تو دلکھا کہ "ہماری شادی سیاسی حالات سے ٹکرا گئی تھی میں جن میں ضم ہو کر رہ گیا۔" اسی طرح اس طویل سلسلۂ مصائب کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ "جیل نے مجھ پر اپنا حق جتایا، اور میں اکثر بیمار رہا یا وہ علیل رہی۔" اس طرح ازدواجی زندگی کا سنگِ بنیاد ہی ہجر و مفارقت کے ایک لامتناہی سلسلے پر رکھا گیا تھا جس میں ملاقاتیں اور مسرتیں تو تھیں مگر نہایت مختصر اور محض لمحاتی۔

جواہر لال کے قید و بند کے اس طویل سلسلہ کا آغاز ۶- دسمبر ۱۹۲۱ء سے ہوا۔ کملا کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس سے پیشتر وہ صرف جواہر لال کی بیوی اور اندرا کی ماں بن کر رہ گئی تھی۔ مگر اب اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا، اسے اپنے شوہر کی جدائی برداشت کرنے کے علاوہ اس کی دل جوئی اور دل بستگی کا سامان بھی مہیّا کرنا تھا اور اس کے جیل میں جاتے وقت اپنے ہونٹوں کو متبسم رکھنے کی دشوار ترین خدمت بھی انجام دینی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہر مصیبت سہنے کے لئے تیار تھی مگر سیاسی کاموں کو انجام نہ دے سکنے کے باعث بہت فکر مند رہنے لگی تھی۔ پہلی گرفتاری ایک دوسرے کے لئے نئے تجربات اور احساسات لے کر آئی۔ دونوں کو پہلی مرتبہ ایک دوسرے کی قربت کی قدر معلوم ہوئی اور جدائی کے بعد پھر ملنے کی آرزو کی گراں قدر مسرّت کا نیا تجربہ ہوا۔ ملک کے اندر سیاسیات میں شوہر کے دوش بدوش نہ چل سکنے کا شدید احساس

جاگ اُٹھا۔ جواہرلال بھی تصورات کی دنیا میں گم اپنے حالات کا جائزہ لیتے رہے اور کملا کی طبیعت برابر گرتی رہی۔ وہ شوہر کی جدائی میں ایک شمع خاموش کے مانند جلتی اور گھلتی رہی۔

جواہرلال کے دل میں خدمتِ وطن کا جذبہ کارفرما تھا، وہ مادرِ وطن کی خاطر اپنی ہر عزیز شے قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے اور جنگِ آزادی کے مقابلہ میں کسی چیز کو اہمیت نہ دیتے تھے۔ رہائی کے بعد انہیں سیاسی معاملات کے سلسلے میں طویل سفر درپیش رہے۔ ۱۹۲۵ء میں اختتام خزاں پر وہ کانپور کے اجلاس کی تیاریوں میں مصروف تھے اور الہ آباد کانگریس کا کام بھی دیکھ رہے تھے کہ انہیں دنوں پریشانیوں کا کوہِ گراں ان پر ٹوٹ پڑا جب لکھنؤ ہسپتال سے کملا کو دق تشخیص ہوئی۔ اجلاس میں کانگریس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ان کی موجودگی ازحد ضروری تھی، ادھر الہ آباد کانگریس کے اراکین ان کی ہدایات کے منتظر تھے اور ادھر کملا ان سے فرصت کے چند لمحات کی طلب گار تھی۔ ایسے وقت میں ان کے رفیق خاص ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے مشورہ دیا کہ کملا کو یورپ کے کسی سینی ٹوریم میں زیرِ علاج رکھا جائے جہاں دق پر فتح پائے جانے کی خبر عام تھی۔ جواہرلال اپنی مصروفیتوں کے باوجود اس کے لئے تیار ہو گئے اور ضروری مسائل سلجھا کر سفر کی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد مارچ ۱۹۲۶ء میں اپنی بیوی کملا اور بیٹی اندرا کو ساتھ لے کر اٹلی کے لئے روانہ ہو گئے۔ ان کی بہن وجے لکشمی اور ان کے شوہر رنجیت پنڈت بھی ہمراہ تھے۔ بعد ازاں ان کی دوسری بہن کرشنا اور والد پنڈت موتی لال بھی ان سے آ ملے۔ کملا سے سبھی کو محبت تھی۔ سبھی اپنا بیشتر وقت اس کے ساتھ صرف کرنا چاہتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ خاندان کے افراد نے اس کے ساتھ یورپ کا طویل سفر کرنا قبول کر لیا۔ یہ کملا کی ہردلعزیزی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ اس سفر میں ان کا زیادہ وقت جنیوا میں گزرا جہاں کملا کی صحت ٹھیک رہی۔ یہ سفر جواہرلال کے لئے بھی سود مند رہا۔ وہ اپنی تھکن بھول کر پھر بشاش ہو گئے۔ وہ اپنی بیشتر فکروں سے آزادی حاصل کر چکے تھے مگر اس سے زیادہ انہیں اپنے وطن کی آزادی کی آرزو عزیز تھی اور اسی لئے دسمبر ۱۹۲۷ء میں وہ مارسیلز سے ہندوستان کے لئے روانہ ہو گئے جہاں اخیر دسمبر میں انھیں مدراس کے اجلاس میں شرکت کرنی تھی۔ وہ یورپ صرف چھ یا سات مہینوں کے لئے گئے تھے مگر کملا کی صحت کی خاطر اکیس ماہ وہیں مقیم رہے۔

جواہرلال کملا سے ضرور محبت کرتے تھے مگر کبھی اپنے فرض اور وقت کے تقاضوں سے غافل نہیں رہے۔ وہ ہر طرح خود کو ایک عظیم مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ کملا ہر طرح ان سے متفق تھی مگر اسے ایک سیاسی رفیق کی حیثیت سے ان کے ساتھ قدم اُٹھانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ کچھ شرم مانع رہی اور کچھ موقع کا انتظار۔ مگر یہ موقع بھی جلد ہی حاصل ہو گیا جب مادرِ وطن کے سینکڑوں سپوت اور قابل رہنما جیلوں میں ٹھونس دئے گئے۔ ایسے وقت میں تحریکِ آزادی کی رہبری کے لئے مادرِ وطن کی قابلِ فخر بیٹیاں میدان میں اُتر آئیں جن میں کملا بھی شامل تھی۔ اب اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا وہ ایک سپاہی کی طرح میدانِ عمل میں سرگرم نظر آنے لگی۔ ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا جواہرلال ان دنوں نینی جیل میں تھے۔ ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کملا نے دوسری خاتون رہنماؤں کے ساتھ یہ ثابت کر دکھایا کہ مشرقی عورت صرف چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھنے ہی کے لئے نہیں بلکہ وقت آنے پر وہ میدان میں صف آرا ہو کر حالات کا مقابلہ بھی کر سکتی ہے۔ حالانکہ وہ ان دنوں علیل تھی۔ گو یورپ کے قیام میں وہ صحت یاب ضرور ہو گئی تھی مگر کلی طور سے شفایاب نہیں ہو سکی تھی مگر وہ کسی طرح پیچھے نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ گھریلو فکروں سے آزادی حاصل کر کے عملی سیاست کے میدان میں آ کھڑی ہوئی۔ کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دے دیا گیا تھا اور اسی لئے ہندوستان کے تمام بڑے رہنما جیلوں میں نظربند تھے، ایسے نازک دور میں کملا نے اپنی بیماری کی پروا نہ کرتے ہوئے دن رات مصروف رہ کر الہ آباد اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں خواتین کی تنظیم شروع کر دی۔ اس طرح دیگر رہنماؤں کی عدم موجودگی میں اس کے جوہر کھلے، وہ اپنے شوہر کے نقشِ قدم پر چلنے کی خواہشمند

تھی - قربانی اور خدمتِ وطن کا پہلا سبق اس نے اپنے شوہر ہی سے سیکھا تھا اور اب وہ اس پر عمل پیرا ہو رہی تھی - وہ حقیقی معنوں میں جواہرلال کی شریکِ حیات بن کر رہنا چاہتی تھی - اس نے انگریزی اشیاء کے بائیکاٹ کی تحریک کو آگے بڑھایا اور جلد ہی اسے کانگریس ورکنگ کمیٹی کا قائم مقام ممبر نامزد کر دیا گیا -

جواہرلال کے لئے کملا کا یہ روپ بالکل نیا تھا جس سے وہ اب تک بے خبر تھے - ان کے لئے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا - ان کے گمان میں بھی نہ آسکا تھا کہ کملا جیسی لاغر اور نڈھال عورت جو بسترِ علالت کی شکل بن کر رہ گئی تھی اس دلیری سے اپنی خواہش کی تکمیل میں کامیاب ہو جائے گی - اس وقت انھیں زندگی کی حقیقی مسرت کا احساس ہوا - اب تک تو وہ کملا کو اپنے گھریلو کاموں میں مصروف دیکھتے آئے تھے مگر اب وہ میدانِ سیاست میں بھی ان کے ہم دوش تھی - انھوں نے لکھا

"کملا نے مجھے متحیر کر دیا، اس کا جوشِ عمل بیماری پر غالب آگیا اور کم سے کم کچھ دنوں تک سخت محنت اور مصروفیت کے باوجود بالکل اچھی رہی ---"

تحریکِ سول نافرمانی کے دنوں میں دوسری خواتین کے ساتھ ساتھ الٰہ آباد کی سڑکوں پر دن بھر سورج کی سخت گرمی اور رات کی ٹھٹھرتی ہوئی سردی میں اس نے اپنے مشن کی کامیابی کے لئے ہر ممکن کوشش کی - پنڈت موتی لال تک نے اس کی تنظیمی صلاحیت کا اعتراف کیا - اب اس کے دل میں طوفان اُٹھ چلا تھا جسے خاموش کر دینا کسی کے بس کی بات نہ تھی - کملا کی اس صلاحیت کا اندازہ کر کے جواہرلال نے محسوس کیا کہ انھیں اپنی بے پناہ مصروفیتوں اور جیلوں کی تنہا زندگی نے کملا کی اس خواہش اور جذبے کو سمجھنے کا موقعہ نہیں دیا تھا جس پر انھیں تاسف ہونے لگا، انھیں اسی دن معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک گھریلو عورت اور رسمی بیوی بن کر نہیں رہنا چاہتی بلکہ اسے ایسی فضا بھی چاہیئے کہ جنگِ آزادی کے سلسلے میں اپنے جوہر کا مظاہرہ کر سکے - مگر اب انھوں نے اسے پہچان لیا تھا اور اس کا حقیقی روپ دیکھ لیا تھا - انھوں نے لکھا کہ "اس نے اپنے دل میں بھڑکے ہوئے جوشِ عمل اور ذہانت سے ناتجربہ کاری کی تلافی کر لی تھی اور کچھ ہی دنوں میں وہ فخرِ الٰہ آباد بن گئی ---"

جب نومبر ۱۹۳۰ء میں موتی لال علالت کے باعث کلکتہ میں ٹھہر گئے تو خاندان کے تمام افراد ان کے پاس پہنچ گئے مگر کملا تن تنہا الٰہ آباد میں کانگریس کا کام دیکھتی رہی - اس طرح اس نے کانگریس کی تحریک میں نمایاں حصہ لے کر خواتین کو آگے بڑھایا اور وہ خواتین جو خود کو صرف چولھے اور چکّی کے لئے وقف کر چکی تھیں اس کی قیادت میں مادرِ وطن کو اسیری کے دورِ سیاہ سے نجات دلانے کی جدوجہد میں مصروف ہو گئیں -

۱۹۳۱ء کی جنوری کا پہلا دن تھا - جواہرلال جیل خانے کی سلاخوں کے پیچھے اپنی بیٹی اندرا کے نام خط لکھنے میں مشغول تھے کہ انھیں الٰہ آباد کی خواتین کے ساتھ کملا کی گرفتاری کی خبر موصول ہوئی - ان کے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی آنکھیں چمکنے لگیں اور دل میں مسرتوں کے دریا موجزن ہو گئے - وہ بے حد خوش تھے کہ کملا اپنی منزل کی جانب کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی، آخر کار وہ جیل خانے تک پہنچ ہی گئی جسے وہ ستیہ گرہیوں کا نصب العین کہتے تھے - انھوں نے کملا کی دلی خواہش بر آنے پر اس کی مسرت کے اندازے کا تصور کیا کیونکہ گرفتاری کے وقت اس نے اخباری نمائندوں کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا:-

"مجھے فخر ہے کہ میں اپنے شوہر کے نقشِ قدم پر چل رہی ہوں اور امید ہے کہ لوگ پرچم لہراتے ہوئے لڑائی جاری رکھیں گے -"

یوں تو کملا ہمیشہ سماج میں عورتوں پر مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہی تھی مگر اس وقت اس کے اندر کی ہندو عورت اس کے خیالات پر غالب آگئی تھی جس نے اس کے ذہن سے مردوں کے مظالم کا احساس تک مٹا دیا - جواہرلال نے اندرا کو لکھا "تمھاری ممی کی گرفتاری کی مسرت انگیز خبر میرے لئے سالِ نو کا تحفہ ہے، اس کا امکان بہت دنوں سے تھا اور مجھے شک نہیں کہ تمھاری ممی اب بہت مسرور و مطمئن ہوں گی -" اب وہ دونوں ایک ہی صف میں آ کھڑے ہوئے تھے - کوئی فرق اور فاصلہ باقی نہیں رہ گیا تھا

کملا ایک حقیقی خاتون کی طرح امنگیں اور حوصلے لئے ہوئے کامیابی کی روشنی کا نور چہرے پر پھیلائے مجاہدانہ عزم و عمل سے منزلِ آزادی کی جانب سخت ترین راہوں سے گزر کر آگے بڑھ رہی تھی ۔ جواہرلال کملا کی گرفتاری کے بعد اس کی خیریت کے خواہاں تھے ۔ کتنا پیارا سا اور خوب صورت رومان تھا ۔ روایتی شاعری کے قاصد کا تصور ان کے ذہن میں محفوظ رہ گیا ہوگا جس نے ان سے اندرا کو لکھوایا " پندرہ روز میں تم ایک بار مجھ سے مل سکتی ہو اور ایک بار ممی سے اور اسی طرح ہماری خبریں ایک دوسرے تک پہنچاؤ گی ۔" کس قدر خوبصورت اتفاق تھا کہ وطن کی آزادی کی تمناؤں کے سائے میں ایک دوسرے کی چاہت کا احساس جاگ اٹھا تھا ۔ کملا کے اس روپ سے متاثر ہو کر ان کے دل میں یقین کی مشعلیں جل اٹھیں اور انھوں نے اندرا کو آگے لکھا :

" اس لئے اس سالِ نو کے دن ہمیں فیصلہ کر لینا چاہئے کہ اس سے پیشتر کہ سالِ نو بوڑھا ہو کر تمام ہو ہم اپنے مستقبل کے سنہرے خواب کو حال کے نزدیک لے آئیں گے اور ہندوستان کے ماضی کو تاریخ کا ایک روشن صفحہ دے دیں گے ۔ "

جواہرلال کے دل میں کملا کی یادیں اُمڈ آئیں ۔ اپنے خاندان کے افراد سے علیحدگی کا احساس انھیں بار بار چھو رہا تھا مگر انھوں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ۔ انگریزی شاعر براؤننگ کی طرح رجائیت کی روشنی میں اندرا کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا :

" جب کہ تم آنند بھون میں ہو ، تمھاری ممی ملاکا کے قید خانے میں ہیں اور میں یہاں نینی جیل میں ۔ ہم ایک دوسرے کی عدم موجودگی کو کبھی کبھی بے حد محسوس کرتے ہیں لیکن اس دن کا خیال کرو جب ہم تینوں پھر یک جا ہو جائیں گے میں اس دن کا انتظار کروں گا اور اس کا احساس میرے دل کو مسرت کی روشنی پہنچائے گا ۔ "

وہ نینی جیل میں نظر بند تھے جو الہ آباد سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے ۔ کبھی کبھی انھیں خیال ہوتا کہ وہ کملا سے صرف میلوں کے فاصلے پر ہی تو ہیں مگر خود ہی اسے ایک نادان تصور سے تعبیر کرنے لگتے ۔ انگریزی شاعر کیٹس نے بھی اپنی مشہور نظم "بلبل" میں اسی قسم کے تصور کے سہارے نہ جانے کتنے کاخ و ایوان تعمیر کر لئے تھے مگر پھر تنہائی کا احساس کرتے ہی اپنے خیالات پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ " تصور ہمیں زیادہ دیر تک فریب نہیں دے سکتا " اور اسی طرح جواہرلال نے نینی جیل کی چہار دیواری سے لکھا کہ " چاہے پانچ میل ہوں یا ایک سو پچاس ، فاصلہ ایک ہی ہے جبکہ قید خانوں کی بلند دیواریں راہ میں حائل ہوں ۔ " وہ ایک حقیقت پسند تھے ، جو محسوس کرتے تھے لکھ دیتے تھے ۔ وہ افلاطون کی طرح خیالی محل تعمیر کرنا نہیں جانتے تھے ۔ ارسطو کی طرح حقیقت پسندی کو ترجیح دیتے تھے مگر کملا کی محبت کے باعث کبھی کبھی انھیں بھی رومان پرور فضاؤں میں عارضی طور سے بھٹک جانا پڑتا تھا ۔ ازدواجی زندگی سے متعلق تمام رنگین یادیں ان کے دل و دماغ میں محفوظ تھیں ۔ وہ ان خوبصورت یادوں سے ہی اپنا دل بہلا کر صبر کر لیا کرتے تھے ۔ ان کے شباب کا بہترین حصہ جیل خانوں کی نذر ہو گیا تھا ۔ کیلنڈر پر نظر پڑتے ہی وہ چونک پڑے اور خط میں اندرا کو لکھا :

" آج بسنت پنچمی ہے یعنی آمدِ بہار ۔ موسمِ سرما گزر چکا ، ہوا سے چبھن بھی جاتی رہی ۔ اب ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ پرندے آکر روزِ روشن کو اپنے گیتوں سے پُر رکھتے ہیں ۔ آج سے پندرہ سال پہلے دلّی میں تمھاری ممی اور میں شادی کے رشتے میں منسلک کر دئے گئے تھے ۔ "

آخر کار وہ دونوں رہا کر دئے گئے ۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں ۔ ۲۶ ۔ جنوری ۱۹۳۱ء کو وہ ایک دوسرے کے سامنے تھے مگر بالکل نئے انداز میں ۔ کامریڈ ، ساتھی ، رفیق اور ہمدرد کے روپ میں ۔ لیکن ۶ ۔ فروری کو جواہرلال اپنے شفیق باپ کے سائے سے محروم ہو کر تنہا رہ گئے ۔ کملا کے پاؤں بالکل نہیں لڑکھڑائے ۔ وہ اسی طرح عزم راسخ لئے شانہ بشانہ اپنے شوہر

کا ساتھ دینے کی قسمیں کھاتی رہی اور اپنی تسلیوں سے جواہرلال کی بے بسی کے احساسات میں کمی کرتی رہی ۔ پنڈت موتی لال کی وفات وطن، تحریک آزادی اور خود جواہرلال کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان تھی ۔ سبھی اس سے متاثر تھے اور غمگین ۔ اس اندوہ ناک حادثہ کا اثر زائل کرنے کی غرض سے انھوں نے لنکا کا سفر کیا جہاں وہ اپنے جاننے پہچاننے لوگوں سے دور، بہت دور دو ہفتے اطمینان سے گزارنے کے بعد حیدرآباد اور دوسرے مقامات پر رہتے ہوئے واپس ہندوستان آئے ۔ کملا نے پردہ نشین خواتین کو جنگِ آزادی میں حصّہ لینے پر مجبور کیا ۔ وہ اب ایک رہنما، مصلحِ قوم اور مقرر کی حیثیت سے منظرِ عام پر نمایاں شخصیت کی مالک تھی ۔

یہ تبدیلی زیادہ دنوں تک ساتھ نہیں دے سکی اور وہ دوبارہ بیمار پڑ کر بمبئی میں زیرِ علاج ہو گئی ۔ ۲۶ ۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جواہرلال پھر گرفتار کر لئے گئے ۔ کملا بسترِ علالت پر ہونے کے باعث عملی سیاست میں حصّہ لینے سے معذور تھی جس کا اسے بہت شدید احساس تھا ۔ اس کے دل میں اپنے شوہر کا ساتھ دینے کی خواہش پھر ابھر آئی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی ۔ ادھر جواہرلال کملا کے لئے پریشان تھے مگر اس کا خیال ان کے دل میں آجانے کے لئے کافی تھا ۔ وہ ماضی میں گزارے ہوئے لمحات کی یادوں کو دل سے لگائے اپنی رہائی کا انتظار کرنے لگے ۔

کملا کی زندگی کے کئی پہلو تھے ۔ وہ کبھی علیل ہونے کے باوجود سروپ رانی کی تیمارداری کرتی اور کبھی اپنی بیٹی اندرا کے تعلیمی انتظامات کے لئے شانتی نکیتن کا سفر اختیار کرتی، حالانکہ وہ خود کالج یا اسکول کی تعلیم یافتہ نہیں تھی مگر اپنی بیٹی کو جدید طریقوں سے جدید تعلیم سے آراستہ کر کے سماج میں سربلند کرنے کی تمنا رکھتی تھی ۔ جواہرلال جیل کی صعوبتیں سہنے کے عادی ہو گئے تھے "جیل کے اندر اور جیل کے باہر" کا یہ چکر برابر چلتا رہا اور کملا بھی ان کے اس طرح جیل جانے کے منظر سے واقف ہو گئی تھی ۔ وہ کئی مرتبہ جیل جا چکے تھے اور ہر مرتبہ کملا ایک نیا عزم لے کر انھیں خدا حافظ کہتی ۔ مگر جب ان کی ساتویں گرفتاری کا وقت آیا تو انھیں اپنی ازدواجی زندگی میں پہلی بار بڑے عجیب واقعات سے دوچار ہونا پڑا ۔ اب تک تو ہر گرفتاری پر کملا متبسم ہونٹوں سے انھیں وداع کرتی تھی اور وہ ایک نئے جذبے کے ساتھ اس کے خیالوں کے اُجالوں میں قید کی تاریک راہیں طے کرتے ہوئے خوشی خوشی جدا ہو جاتے تھے مگر اس مرتبہ کملا خود کو دیر تک خود فریبی میں مبتلا نہیں رکھ سکی اور دلی کشمکش پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہو سکی ۔

جواہرلال کے الفاظ میں :

" جب میں فروری ۱۹۳۴ء میں کلکتہ کے ایک وارنٹ پر گرفتار کیا گیا تو کملا اوپری کمرے میں میرے کپڑے اکٹھے کرنے چلی گئی ۔ اسی کے پیچھے میں بھی اسے "خدا حافظ" کہنے چلا آیا ۔ اچانک وہ مجھ سے لپٹ گئی اور غش کھا کر بے ہوش ہو گئی ۔ یہ ایک نئی بات تھی ۔ ہم نے اب تک قید خانوں کے لئے خود کو بہت مشاق بنا لیا تھا اور جس قدر جلد ممکن تھا اس بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے سے بچتے تھے ۔ مگر کیا اسے پہلے ہی کسی قسم کا احساس ہو گیا تھا کہ یہ کم و بیش ہماری آخری ملاقات تھی ـــــ "

اس واقعہ کی حیثیت تاریخی ہے ۔ ایسا ہی ایک واقعہ جہادِ آزادی کے مجاہدِ اعظم مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو اپنی بیوی زلیخا کے ساتھ پیش آیا تھا جس کا اظہار انھوں نے اس کی وفات کے بعد "غبارِ خاطر" میں ۱۱ ۔ اپریل ۱۹۴۳ء کے احمد نگر سے لکھے گئے مکتوب میں کیا ہے لکھتے ہیں :

" ۳ ۔ اگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسبِ معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئی میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳ ۔ اگست تک واپسی کا قصد ہے ۔ اس نے "خدا حافظ" کے سوا اور کچھ نہیں کہا لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا ۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا ـــ "

خود وا بجیسلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا، وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی ـــ"

اسی طرح زلیخا اور کملا کی کیفیتیں جدا نہیں تھیں۔ دونوں ہی عظیم رہنماؤں کی شریکِ حیات تھیں، دونوں ہی اپنے محبوں کے لئے دست بدعا رہنے والی اور انھیں حوصلہ دلانے والی رفیق تھیں اور دونوں کو ہی قبل از وقت ابدی جدائی کا احساس ہو چلا تھا کہ وہ مایوسی کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن ہو گئی تھیں ورنہ گرفتاری تو ان کے شوہروں کے لئے روزمرہ کا معمول بن کر رہ گیا تھا اور قید و بند کی صعوبتوں کے احساس کے وہ عادی ہو گئے تھے بقول غالب ع

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

جواہر لال الہ آباد سے اس واقعہ کا شدید احساس لے کر کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ انھیں اپنی کوئی فکر نہ تھی اگر خیال تھا تو اپنی بیمار ماں، بیوی اور بہنوں کا، جن کے لئے ان کی طویل جدائی کا احساس غالب تھا۔

کملا پھر بسترِ علالت پر دراز ہو کر کلکتہ رکھی گئی۔ جواہر لال جیل میں تھے اور کملا ہسپتال میں۔ کیا رفاقت تھی کہ ہر طرح حقیقی معنی میں ایک دوسرے کے شریکِ حیات تھے۔ حالانکہ دونوں میں سے کوئی کسی کے لئے عملی طور سے کچھ نہیں کر سکتا تھا مگر دونوں ہی ایک دوسرے کی طرف سے فکر مند تھے۔

مولانا آزاد کی زلیخا اور جواہر لال کی کملا، دونوں ہی مادرِ وطن کی عظیم بیٹیاں تھیں جن پر ان رہنماؤں کی دل جوئی اور رفاقت کا فرض واجب کر دیا گیا تھا جسے دونوں نے زندگی بھر بحسن و خوبی انجام دیا۔ مولانا نے زلیخا کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب جواہر لال کملا کی جانب سے بہت فکر مند تھے، ان کی والدہ بیمار تھیں اور وہ جیل میں تن تنہا اپنے خاندان کے افراد سے دور زندگی گزار رہے تھے اور پھر مہاتما گاندھی سے ان کے سیاسی اختلافات بھی ہو گئے تھے جنھوں نے عوام اور جواہر لال کی مرضی کے خلاف تحریک سول نافرمانی واپس لے لی تھی۔ جیل کی تاریک کوٹھریاں جن میں نہ صبح کا سورج مسرت کی کرنیں بھیج سکتا ہے نہ رات کا چاند، نہ ماضی کی یادوں میں الجھی ہوئی مستقبل کی جھلک ہی تسکین بخش سکتی تھی۔ تفکرات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، آرزوئیں اور امیدیں مایوسی کے غار میں کود کر خودکشی کرنا چاہتی تھیں کہ ایسے عالم میں اچانک اپنی بیماری کے باوجود کملا جواہر لال کے پاس آ پہنچی۔ اس کی آنکھوں سے غم نمایاں تھا، وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس کے دل میں اس طویل جدائی اور اپنی علالت کے باعث طوفان اٹھ رہے تھے مگر اس کا چہرہ خاموش سمندر کی طرح پُرسکون تھا۔ اس نے کسی بھی طرح اپنی علالت یا غم زندگی کا اظہار نہیں کیا کیوں کہ وہ اپنے بارے میں ذکر کر کے اپنے شوہر کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کملا کے اس طرح مل جانے سے جواہر لال کو جو تسکین ہوئی اس کا احساس انھیں پہلے کبھی نہیں ہو سکا تھا۔ انھوں نے لکھا: "میں بے پناہ مسرور ہو اٹھا تھا، میرا احساسِ تنہائی جاتا رہا کیونکہ ہم ایک دوسرے کے قریب تھے۔" اس طرح کملا ان کے زخموں کا مرہم بن کر انھیں یاس و حرماں نصیبی کے تصورات سے بھی دور لے گئی۔ مئی ۱۹۳۴ء میں وہ دہرہ دون جیل میں منتقل کر دئے گئے جہاں انھیں موسم

تو خوش گوار ملا مگر پریشانیوں سے نجات نہ مل سکی۔ "کملا کی علالت اور سیاسی تفکرات" نے انھیں نڈھال کر دیا، انھوں نے خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کی اور اپنی سوانح حیات کی تصنیف میں مشغول ہو گئے۔

یہ زمانہ کم و بیش کملا کا علالت میں اور جواہر لال کا جیل میں گزرا، دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دینے کی قسمیں جو کھائی تھیں اور رفاقت کا عہد جو کیا تھا۔ کچھ دنوں بعد جواہر لال کو عارضی طور سے صرف گیارہ دن کے لئے رہا کر دیا گیا تاکہ وہ اپنی بیمار بیوی کے ساتھ کچھ دن گزار سکیں جو انتہائی نازک حالت میں بسترِ علالت پر دراز تھی۔ جب وہ کملا سے ملے تو انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک حسین پیکر کے بجائے ایک سائے کا روپ دیکھا، وہ انتہائی لاغر، کمزور، اداس، نڈھال اور تھکے ہوئے بے نور چہرے کے ساتھ علالت کا مجسمہ بن کر رہ گئی تھی اور اس وقت ان کے دل میں زندگی میں پہلی مرتبہ اس خوف کا شدید احساس اُبھرا کہ کہیں کملا ان سے جدا نہ ہو جائے۔ انھوں نے اس کی موجودہ حالت کا مقابلہ اپنی شادی کے ان ابتدائی ایام سے کیا جب ۱۹۱۶ء کی ایک خوب صورت شام کو وہ اسے دلی سے بیاہ کر لائے تھے اس وقت اور اس وقت کی کملا میں صدیوں کا فرق تھا۔ اٹھارہ سال کے عرصے میں اس میں کس قدر تبدیلی ہو گئی تھی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ شاید وہ خود تبدیل ہو کر رہ گئے تھے
انھیں دنوں ان کی والدہ سروپ رانی کی بیماری نے زور پکڑ لیا۔ مہاتما گاندھی سے ان کے سیاسی اختلافات ہو ہی چکے تھے۔ انھوں نے ایک طویل خط مہاتما جی کو لکھتے ہوئے اپنے سیاسی اختلاف، کملا کی بیماری اور اپنی ذہنی حالت کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی۔ وہ ہمیشہ مہاتما گاندھی کو اپنے باپ پنڈت موتی لال کی جگہ سمجھتے تھے اور ان کی موجودگی میں انھوں نے خود کو کبھی تنہا نہیں سمجھا مگر اس وقت انھوں نے مہاتما جی سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے اپنی تنہائی کے شدید احساس کو اُجاگر کر دیا بالکل اسی طرح جیسے انگریزی شاعر شیلے نے زندگی کے کانٹوں پر گرتے ہوئے اپنے لہولہان ہونے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

"I fall upon the thorns of life I bleed" —

یہ گیارہ گراں قیمت دن جواہر لال نے سیاست سے علیحدگی اختیار کر کے کملا کے پاس گزارے جو اُن کی قربت کے لئے ترس گئی تھی۔ انھیں اس کی طویل علالت کا شدید احساس ہونے لگا تھا اور وہ دل ہی دل میں اس کی صحت یابی کے خواہاں اور دعا گو ہونے لگے۔ بقول اختر شیرانی ؎

سارے دنیا کے مریضوں کو شفا دے یارب
آج احساس ہوا ہے کہ علالت کیا ہے

انھیں سیاست نے مہلت ہی کب دی تھی کہ وہ کسی طرف دھیان دے سکتے اور اب انھیں کملا اور اس کی بیماری کا انجام نظر آ رہا تھا۔ کملا کی طبیعت نے ذرا سنبھالا لیا ہی تھا کہ انھیں پھر سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا گیا مگر اس مرتبہ وہ نینی جیل میں ہی رکھے گئے تاکہ کسی بھی نازک وقت میں اپنے گھر جا سکیں۔ جواہر لال گہرے اور تاریک خیالوں میں ڈوب کر سوچنے لگے — "یقیناً وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جا رہی ہے جبکہ مجھے اس کی بے پناہ ضرورت ہے۔ ہم نے ابھی تو ایک دوسرے کو جاننا اور سمجھنا شروع ہی کیا ہے، دراصل ابھی تو ہماری مشترکہ زندگی کا آغاز ہوا ہے —" اس کے ساتھ ہی کملا کی خیریت اور حالت کا بلیٹن جاری ہو گیا جو کچھ دنوں بعد ہی بند کر دیا گیا۔ اکتوبر میں ایک مرتبہ پھر وہ کملا سے ملنے سے جائے گئے مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں تھی اس مجبوری کا ناجائز فائدہ اُٹھانے کی غرض سے حکومت نے ان کے سامنے ایک پیش کش رکھتے ہوئے کہا کہ اگر وہ اپنی میعادِ قید کے اختتام تک کسی طرح کی سیاست میں حصہ نہ لینے کا یقین دلا دیں تو انھیں رہا کیا جا سکتا ہے۔ مگر جواہر لال کی خودداری نے اپنا دل ٹوٹتے ہوئے سوچا:

"یقین دہانی! میرے اپنے عہد، مقصد، شرکا کار اور اپنی ذات سے غداری کے مترادف ہوگی۔ یہ ایک ناممکن شرط تھی..... ایسا کرنے کا مطلب تو میرے اپنے وجود یا ہر اس چیز پر ضرب لگانا ہے، جو مجھے مقدس ہے"

اس کی بھنک کملا کے کانوں میں بھی پڑ چکی تھی، جواہرلال جب اس سے ملنے لگے تو اس نے دریافت کیا۔

"یہ حکومت کو یقین دہانی کا کیا قصہ ہے؟ ایسا کبھی نہ کرنا۔"

اور اس کے چہرے پر وہی ابدی معصوم مسکراہٹ دوڑ گئی جو ایسے موقعوں پر دلیری سے خود پر قابو پانے کی کوشش میں اپنے مقصدِ عظیم کو نگاہوں میں رکھتے ہوئے وجود میں آجاتی ہے۔

کملا کی حالت میں کوئی افاقہ نہ ہونے کے باعث اسے اتر پردیش کی پہاڑیوں پر بھوالی سینی ٹوریم میں منتقل کر دیا گیا اور جواہرلال کو بھی قربت کے خیال سے الموڑہ جیل بھیج دیا گیا جہاں وہ یا تو اپنے سوانح کی تصنیف میں منہمک رہے یا پھر اپنی بیوی کی خیریت کے انتظار میں محو۔ ایسے عالم میں ان پر تفکرات کا بار بڑھتا ہی گیا۔ کبھی کبھی ان کو الموڑہ جیل سے بھوالی جانے کی اجازت بھی ملتی تھی تاکہ کملا سے مل سکیں یہ ملاقاتیں اگرچہ بہت مختصر ہوتی تھیں مگر ان کے لئے بہت ہی عزیز تھیں۔ انھیں کے الفاظ میں:

"یہ مختصر ملاقاتیں میرے لئے بہت ہی گراں قیمت ہوتی تھیں اور شاید کملا کے لئے بھی۔ کیونکہ ہم ایک دوسرے سے قریب تر تھے، اسے چھوڑ کر جانے کا خیال انتہائی تکلیف دہ ہوتا تھا۔ ویسے ہم صرف جدا ہونے کے لئے ملتے تھے۔"

وسط جنوری ۱۹۳۵ء میں انھیں اپنی والدہ سروپ رانی پر فالج کے حملے کی اطلاع ملی اور ان کا ذہن منجمد ہو کر رہ گیا۔ مئی ۱۹۳۵ء میں جب کملا کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو موقعہ کی نزاکت کے پیشِ نظر اسے یورپ بھیج دیا گیا۔ جواہرلال اسے 'خداحافظ' کہنے کے لئے بھوالی پہنچے۔ ہندوستان اور مقدس وطن کی سرزمین پر یہ ان کی آخری ملاقات تھی جس کی آزادی کے لئے اس نے اپنے شوہر کے شانہ بشانہ جدوجہد میں حصہ لیا تھا، وہ اسی کے دامن سے رخصت ہو کر جا رہی تھی، کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔ جواہرلال طوفانوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے مگر وہ کملا کی بہتری کے لئے اس کی طویل جدائی برداشت کرنے کو تیار تھے۔

اسے الوداع کہتے وقت ان کی خشک آنکھوں سے غم مترشح تھا اور بھاری آواز سے خدا حافظ کہتے وقت انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ حد درجہ ضعیف ہو گئے ہوں۔ پہلے تو انھیں کملا کی قربت کا احساس تھا مگر اس کی اس روانگی کے بعد وہ پھر تاریکی اور تنہائی سے دوچار ہو گئے۔ اب ذہن میں بار بار یہی خیال سر اٹھانے لگا تھا کہ شاید وہ اس سے کبھی نہ مل سکیں گے مگر وہ دل پر پتھر رکھ کر قیدی گزار کے لئے اپنی سوانح حیات کے اگلے ابواب کی تصنیف میں مصروف ہو گئے۔

اچانک ۴۔ ستمبر ۱۹۳۵ء کی صبح کو جواہرلال میعادِ اسیری ختم ہونے سے پانچ ماہ پیشتر ہی رہا کر دئے گئے کیونکہ جرمنی میں کملا کی حالت بہت نازک تھی۔ حکومتِ برطانیہ ہندوستانی عوام کے غضب کا شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اسی دن یورپ روانہ ہو گئے اور بیڈن ویلر سینٹی ٹوریم پہنچ کر انھوں نے اپنی کملا کے چہرے پر وہی جانی پہچانی دلیر مسکراہٹ رقص فرما دیکھی۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی اور درد کی تکلیف میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی، وہ جواہرلال کو دیکھ کر کھل گئی مگر ایک پژمردہ کلی کی طرح۔

جواہرلال اس کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے اور اس کی طبیعت ٹھیک ہو چلی۔ عام زندگی میں تو کملا کو جواہرلال کی قربت نصیب نہیں ہو سکی تھی مگر علالت ہی ایک ایسی دوا تھی جو ان دونوں کو مہینوں تک قریب رکھ سکی۔ کملا کی مسرور خاموشی بول اٹھتی ہے

صحتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم کے نثار
جس میں اٹھے بارہا تیری عیادت کے مزے (حسرت)

وہ انھیں پا کر بہت خوش تھی۔ اب ان کا جسم جیل خانے کی آہنی سلاخوں کے پیچھے مقید نہیں تھا، اب وہ تنہائیاں اور ان میں پلتے ہوئے تصورات نہیں تھے۔ اب دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ جواہرلال جیل سے باہر تھے اور کملا ہسپتال میں۔ وہ ہر طرح اپنی بیوی کی دلجوئی اور دلبستگی کا سامان مہیا کر رہے تھے۔ کبھی اس سے گزری ہوئی باتوں کا ذکر چھیڑ دیتے کبھی اخبار

کی خبروں پر تبصرہ کرنے لگتے۔ کبھی اپنی سوانح حیات کا کوئی باب پڑھ کر اس کی رائے طلب کرتے جسے وہ لندن کے ایک ناشر کو اشاعت کے لئے دے چکے تھے۔ کبھی کوئی اور کتاب سُنا کر اس کا دل بہلانے کی سعی کرنے لگتے۔ اور کبھی اپنے تجربات اور اس کی جدائی میں گزارے ہوئے لمحات کا تذکرہ چھیڑ کر اسے متحیر کر دیتے۔ غرضیکہ وہ اپنی زندگی کے بہترین ساتھی کو بیماری اور غموں سے نجات دلانے، اس کا دل بہلانے اور اسے خوش کرنے میں مصروف تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے ماضی کے تاریک جھروکوں میں جھانک کر حال کی افسردگی کو بحال کر دیتے۔ گزرے ہوئے سیاہ حادثے ان کا موضوع گفتگو بن جاتے اور وہ ایک قنوطی نظریے کے حامل ہو کر زندگی سے اپنی بیزاری کا اظہار کرنے لگتے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ ان کی زندگی جن مراحل سے گزر رہی تھی وہاں رجائیت کی ہلکی سی روشنی کی جھلک بھی نہیں دکھائی دے سکتی تھی۔ ملکی حالات کی ابتری، سیاسی معاملات میں نئے نئے موڑ، خاندانی تفکرات اور کملا کی علالت نے ان کے ذہن کو بُری طرح جھنجھوڑ دیا تھا۔ ایسے وقت میں کملا نفسیاتی طور سے ان کی اس قنوطی روش سے ہٹ کر رجائیت کا دامن پھیلا دیتی اور "اپنی نازک حالت کے باوجود وہ مستقبل کی تابناکی کا یقین دلاتی، اس کی آنکھیں پُرنور اور حوصلہ مند ہو جاتیں اور اس کا چہرہ روزمرہ کی طرح مسرور ہو کر کِھل اُٹھتا۔" یہ کملا ہی کی دلیری تھی کہ وہ مریض ہو کر چارہ گر کو تشفی دے رہی تھی۔

اور جواہرلال اس کی اس جرأت مندانہ صلاحیت کی داد دے اُٹھتے۔ ان کی نگاہوں میں کملا کی تصویروں کا عکس ابھر جاتا، وہ ماضی کے جھروکوں سے کملا کی مسکراتی تصویریں دیکھنے لگتے اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگتے جن میں سے بعض تو اب تک ان کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ انھیں کے الفاظ میں:

"ہماری شادی کو بیس سال ہو چکے تھے پھر بھی کئی مرتبہ اس کے کسی نئے روپ نے مجھے متحیر کر دیا تھا۔ میں اسے کتنی ہی طرح سے جانتا تھا اور بعد کے سالوں میں میں نے اسے سمجھنے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔"

کملا کی پُر درد زندگی میں اس کی رجائیت کے روشن پہلو سے سبق لے کر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کے ساتھ ازدواجی زندگی میں بڑی زیادتی ہوئی ہے اور وہ خود کو ایک شوہر کی حیثیت سے جانچنے لگے۔ مصروفیتوں اور اُلجھنوں نے انھیں جکڑ رکھا تھا اور وہ بہت کم وقت کملا کو دے سکے تھے جس کی وہ جائز طور سے مستحق تھی مگر اس کی سچّی رفاقت نے ان کا دامن نہیں چھوڑا تھا، وہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کے کاموں میں ہاتھ بٹانے میں صرف کرنے لگی۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں وہ کسی قدرتی سوتے کی مانند اُبل پڑی تھی کیونکہ اس نے اپنے لئے اپنے شوہر کے نقشِ قدم کا انتخاب کر لیا تھا۔ اس کے دل میں عزم و عمل کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اپنے شوہر کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایک سچّی خاتونِ مشرق کی طرح وہ قومی جدوجہد میں اپنا رول ادا کرنا چاہتی تھی۔ جواہرلال اس کی حیات میں سات مرتبہ جیل گئے تھے جس کی مجموعی تعداد تقریباً پانچ سال ہوتی ہے۔ جدوجہد، بیماری اور حرماں نصیبی ان کی ازدواجی زندگی کا حاصل تھی جسے انھوں نے ہنستے کھیلتے قبول کر لیا۔ دونوں نے خود کو ایک عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے وقف کر دیا تھا۔ جواہرلال کی نظریں کملا سے زیادہ ان کروڑوں عوام کی جانب تھیں جو ان کو اپنی کشتی کا ناخدا سمجھ کر توقعات کا مرکز بنائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے "اپنی ذہانت اس مقصدِ عظیم کے لئے وقف کر دی تھی اور کسی کے لئے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔" ان کے شانوں پر عوام کے اعتماد کا بوجھ تھا اور وہ اپنے فرائض سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ تھے۔ ان سب مصروفیتوں میں کملا کی یاد شمع کی مانند دل میں روشن رہتی تھی، وہ زبانِ حال سے یہ کہتے محسوس ہوتے تھے ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا (غالب)

وہ ہمیشہ اس کی یاد سے ہم کنار رہے۔ انھوں نے خود اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جب بھی میں کچھ دنوں کے لئے باہر گیا تو اس کے خیال نے

میرے دماغ کو ٹھنڈک پہنچاتی اور میں بے تابی سے گھر واپس ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ دراصل اگر وہ مجھے قوت اور آرام دینے کے لئے نہ ہوتی تو میں کر ہی کیا سکتا تھا۔"

انھیں حقیقتاً جواہر بنانے میں اس نے بہت بڑا اور اہم رول ادا کیا تھا مگر اب وہ تھک چکی تھی۔ زندگی کی سخت راہوں پر کامیابی و کامرانی سے چلنے کے بعد اب وہ اپنی علالت کے سائے میں دم لے رہی تھی۔ اس کی قوت نے جواب دے دیا تھا۔ جرمنی کے سینی ٹوریم میں جب اس کی حالت نازک ہوگئی تو ۲۵۔ دسمبر ۱۹۳۵ء کو جواہر لال نے اپنے رفیق کار ڈاکٹر سید محمود کو لکھا:

"ہم سوچ رہے تھے کہ کملا کی حالت رو بہ اصلاح ہے حالانکہ یہ عمل بہت آہستہ تھا مگر ہم خود فریبی میں مبتلا تھے اور وہ تیزی سے کمزور ہوتی رہی۔ گزشتہ ہفتہ اچانک ایک حملہ ہوا، دو دن تک اس کی زندگی ایک مہین دھاگے سے ٹنگی رہی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکے گی مگر وہ فوری کشمکش گزر گئی۔"

مگر وہ حال کے آئینے میں مستقبل کا تاریک چہرہ دیکھ کر مایوس ہو چکے تھے۔ انھوں نے آگے لکھا:

"لیکن مستقبل تاریک ہے، وہ بہت لاغر ہو کر تھک چکی ہے اور جب تک اس میں قوت نہیں آتی، وہ بمشکل اس بیماری کا مقابلہ کر سکے گی۔"

وہ اس کی صحت سے نا امید ہو چکے تھے۔ امید کی روشنی بجھتی جا رہی تھی بلکہ بجھ گئی تھی۔ وہ قنوطیت کے سیاہ اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ انھوں نے لکھا:

"سفید برف میں ڈھکا ہوا سرما کا خاموش منظر مجھے سرد موت کی خاموشی کے مانند معلوم ہوا اور میں نے ماضی کی پچھلی تمام رجائیت گنوا دی۔"

کملا اب بیڈن ویلر سینی ٹوریم سے اکتا چکی تھی۔ وہ جگہ کی تبدیلی پر مصر تھی حالانکہ وہاں وہ بہت ہر دل عزیز تھی۔ اس کی اکتاہٹ کی خاص وجہ ایک آئرش لڑکے کی موت تھی جس کی حالت کملا سے بہت اچھی تھی اور جسے ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے کی اجازت بھی دے رکھی تھی اور جو کملا کو روزانہ پھول بھیجا کرتا تھا کیونکہ جواہر لال کی طرح پھول اسے بھی پسند تھے۔ کملا کو وحشت ہونے لگی تھی اس لئے اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے اوائل جنوری ۱۹۳۶ء میں لوسین سینی ٹوریم (سوئٹزرلینڈ) میں منتقل کر دیا گیا جہاں اس کی حالت میں اصلاح ہوتی رہی اور اس کی صحت یابی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اسی دوران جواہر لال کو معلوم ہوا کہ وہ دوسری بار کانگریس کے صدر منتخب ہوئے ہیں اور اپریل میں انھیں لکھنؤ اجلاس کی صدارت کرنی ہے۔ وہی کشمکش پھر ابھرنے لگی۔ ادھر کملا کو چھوڑ کر جانا ممکن نہ تھا اور ادھر عوام ان کی واپسی کے منتظر تھے۔ ایک طرف وقت کا تقاضا تھا دوسری جانب محبت دامن کو جھٹکا دے رہی تھی۔ انھوں نے محبت کے جذبے سے مغلوب ہو کر صدارت سے مستعفی ہو جانا چاہا مگر محبت خود فرض میں تبدیل ہو گئی اور کملا نے اسے منظور نہیں کیا۔ بلکہ انھیں ہندوستان جانے کی اجازت دے دی مگر اپریل کے بعد واپس ہونے کی درخواست کی۔ بالآخر انھوں نے ۲۸۔ فروری کو اپنی روانگی کے لئے مقرر کیا مگر معالجوں کے اصرار پر کچھ روز اور قیام کے ارادے سے سفر ملتوی کر دیا۔ کملا کی خواہش یہی تھی جو دل ہی میں گھٹی ہوئی تھی۔

اب اس کی بیماری نے ایک نیا موڑ لے لیا تھا۔ اسے دن میں خواب نظر آنے لگے تھے۔ وہ اکثر اپنے شوہر سے کہا کرتی تھی کہ کوئی اسے پکار رہا ہے اور کبھی کبھی اسے اپنے کمرے میں چلتے پھرتے سائے بھی نظر آجاتے تھے۔ یقیناً اسے سکونِ ابدی کی خاموش آواز سنائی دے رہی تھی اور وہ موت کے ہی سائے چلتے پھرتے دیکھ رہی تھی۔

آخر کار اس کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ زندگی کی طویل اور سخت ترین راہوں کا دشوار سفر طے کر کے ۲۸۔ فروری ۱۹۳۶ء کی صبح کو اپنی منزل پر پہنچ گئی اور اس طرح قید و بند کی تنہائیوں میں

خیالات کا روپ لئے جواہرلال کا ساتھ دینے والی کملا نے ایک وفاپرست اور جاں نثار بیوی کی طرح اپنے شوہر کی آغوش میں جان دے دی اور "کچھ ہی لمحات میں وہ حسین جسم اور خوب صورت چہرہ جو ہمیشہ متبسم رہا کرتا تھا خاک کے ڈھیر میں تبدیل ہو کر رہ گیا

اس کی خاک ایک چھوٹی پیالی میں رکھ دی گئی جو اب اس کے خوب صورت وجود کا حاصل تھا اور اس طرح بیس سال کی طویل رفاقت اور ازدواجی زندگی نے دم توڑ دیا۔

جواہرلال اور کملا کی ازدواجی زندگی کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ چکی تھی۔ اب جواہرلال کو تنہا زندگی کے دشوار ترین دور کا آغاز کرنا تھا "وہ ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح مادرِ وطن کی آغوش میں واپس ہو رہے تھے۔" ان کی بہن کرشنا کے الفاظ میں "ان کا کھلا ہوا چہرہ جو کچھ ماہ پیشتر جوان معلوم ہوتا تھا اب ضعیف ہو چلا تھا، جس پر غم کی جھریاں نمایاں ہو چلی تھیں۔ وہ بہت زیادہ تھکے ہوئے دکھائی دینے لگے تھے، حالانکہ انھوں نے اپنا دلی ارادہ چھپانے کی سعی لاحاصل ضرور کی مگر ان کی غم ناک آنکھوں نے ان کی شدید تکلیف کا اظہار کر دیا۔" واپسی پر روم میں انھوں نے اطالوی ڈکٹیٹر مسولینی سے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ ان سے اظہارِ تعزیت کرنا چاہتا تھا۔ قاہرہ چھوڑنے کے بعد مصر کے ریگستانی ویرانوں سے گزرتے ہوئے انھیں شدید تنہائی کے احساس نے جکڑ لیا اور وہ اپنے وجود کو بے مقصد اور بے کار سمجھنے لگے۔ انھوں نے لکھا کہ "میں تنہا گھر واپس جا رہا تھا جو اب میرے لئے گھر نہیں رہ گیا تھا۔ میرے پاس ہی ایک ٹوکری میں وہ چھوٹی پیالی رکھی تھی جس میں کملا کے حسین جسم کی خاک محفوظ تھی ایسی سب اب کملا کا حاصل تھا۔ سنہرے خواب دم توڑ چکے تھے۔ میرے ذہن میں یہی ایک خیال گونجتا رہا کہ کملا اب نہیں کملا اب نہیں ہے۔"

اور انھوں نے بغداد کے ہوائی اڈے پر پہنچتے ہی لندن میں اپنی سوانح کے ناشر کو بذریعہ تار انتساب بھیج دیا

"۔ کملا کے نام — جو اب نہیں رہی"

اپنے وطن کی سرزمین سے انھوں نے لکھا:

"ہم وہ گراں قیمت پیالی تیز رو گنگا کے ساحل پر لے گئے اور کملا کے جسم کی خاک اس مقدس دریا کے آغوش میں سپرد کر دی۔ کتنے ہی پچھلے سپرد کردہ خاک کے ذرّوں کو وہ سمندر تک لے گئی تھی اور ابھی جانے کتنے ہی اپنا آخری سفر اس کے مقدس پانی کی لہروں کے آغوش میں طے کریں گے۔"

اس کے بعد کملا کا شریکِ حیات، قید و بند کی صعوبتیں سہنے والا، جنگِ آزادی کا سپاہی، مجاہد اور رہنما اپنے مقصدِ عظیم کی تکمیل کے بعد سترہ سال تک وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہو کر دن رات وطن کی خدمت میں رہا اور آخر کار ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو وطن قوم کے سپرد کر کے کملا سے جا ملا۔ اور ۹ جون کو اسی گنگا میں جواہرلال کی خاک اور کملا کی خاک کا کچھ حصہ جو اسی دن کے لئے باقی بچا لیا گیا تھا سنگم کی نذر کر دیا گیا اور شگفتہ گلاب کے پھولوں کی نازک پتیوں نے مقدس سنگم پر ان کی خاک کے ذرّوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر کملا اور جواہر کو ۱۹۱۶ء کی بسنت پنچمی کی رنگین شام کی طرح یک جا کر دیا۔ وہ دونوں ایک ہو گئے اور جیسے ان کی روحوں کو ابدی سکون نصیب ہو گیا — اور ہر شخص پکار اٹھا ؎

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں (غالب)

مادۂ سنہ رحلت از لسانِ غیب

۱۹۶۴ء

دادہ نشاں ز منزلِ ما ہندیاں و رفت — خسرو کہ بود راہبرِ تیز گام ما
تاریخ ارتحال بگو با سرِ الم — ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما (حافظ)

۲۰۲۰ + ۱ = ۲۰۲۱ (بکرمی)

(عبدالرب عرفان)

علی مہدی رضوی

موت سے کہہ دو جواہر لال مر سکتا نہیں

آج پھر دلّی ترا بدلا ہوا انداز ہے
درہم و برہم نشاطِ محفلِ صد ناز ہے
زندگی ویران ہے ٹوٹا ہوا ہر ساز ہے
کس کے غم میں ذرہ ذرہ گوش بر آواز ہے

دوپہر میں موت آئی کس کے استقبال کو
کھو دیا خاکِ وطن تو نے جواہر لال کو

کہہ رہے ہیں چاہنے والوں کے آنسو زندہ باد
غنچہ و گل میں بسی ہے تیری خوشبو زندہ باد
تو نے سلجھائے ہیں دھرتی ماں کے گیسو زندہ باد
مرنے والے اے جواہر لال نہرو زندہ باد

غم کی ڈھارس بے سہاروں کے سہارے زندہ باد
زندہ باد اے دھرتی ماتا کے دُلارے زندہ باد

کتنے ہی خطرے ہوں لیکن مرد ڈر سکتا نہیں
منتشر ہونے پہ شیرازہ بکھر سکتا نہیں
ناخدا کیا ڈوب جانے پر اُبھر سکتا نہیں
موت سے کہہ دو جواہر لال مر سکتا نہیں

روحِ بیداری کی خاطر سو گیا آرام سے
قوم زندہ ہو گئی جس کے امر پیغام سے

پھیکا پھیکا سا ہے رنگِ داستاں تیرے بغیر
اب بھٹکتا پھر رہا ہے کارواں تیرے بغیر
رو رہا ہے مے کدہ پیرِ مغاں تیرے بغیر
بجھ گیا جیسے دلِ ہندوستاں تیرے بغیر

صلح کا دل ابنِ عالم کی جوانی لے گیا
کچھ نہ لے جانے پہ روحِ زندگانی لے گیا

اپنے ماتھے کا پسینہ دے دیا مزدور کو
اپنی آنکھوں کی بصارت دیدۂ کم نور کو
اپنا استقلال بخشا ہند کے دستور کو
کس خوشی سے دے دیا دل سینۂ جمہور کو

شمع سی تھی گل ہوئی اس انجمن کے واسطے
خاک میں تو مل گیا خاکِ وطن کے واسطے

سو رہا ہے بے خبر آخر جگائیں کس طرح　　آنسوؤں سے آتشِ غم کو بجھائیں کس طرح
دیدۂ دل رو رہا ہے مسکرائیں کس طرح　　روٹھنے والے بتا تجھ کو منائیں کس طرح

اب تجھے پا ہی نہیں سکتے کسی تدبیر سے
اپنا دل بہلا رہے ہیں ہم تیری تصویر سے

سوگوار و سوگ ہی سے کام چل سکتا نہیں　　آنسوؤں سے قیمتی موتی نکل سکتا نہیں
اوس کے چھینٹوں سے ہرگز باغ پھل سکتا نہیں　　صرف آہوں سے وطن کا دیپ جل سکتا نہیں

دل میں ہو جوشِ عمل بھی آنکھ کے پانی کے ساتھ
ہم ابھاریں دیش کو بھی غم کی طغیانی کے ساتھ

غم کا بادل اس طرح برسے کہ کھیتی لہلہائے　　متحد کر دے ہمیں نفرت کے شعلوں کو بجھائے
یندر کے ماتے ہوئے اہلِ وطن کو ہوش آئے　　جس سے مزدوروں کی محنت کا پسینہ جگمگائے

موت کے مے خوار سے بھی زندگی کا جام لے
اے ترقی بڑھ کے تو نہرو کا دامن تھام لے

ساحلِ امن و اماں سے جنگ کے طوفاں ڈریں　　دم میں دم باقی رہے جب تک وفا کا دم بھریں
جو ادھورا رہ گیا ہے کام اسے پورا کریں　　دیش کی خاطر جئیں ہم دیش کی خاطر مریں

فرض کے احساس سے جائے نظر انجام پر
اپنی ہستی وقف کر دیں ہم وطن کے نام پر

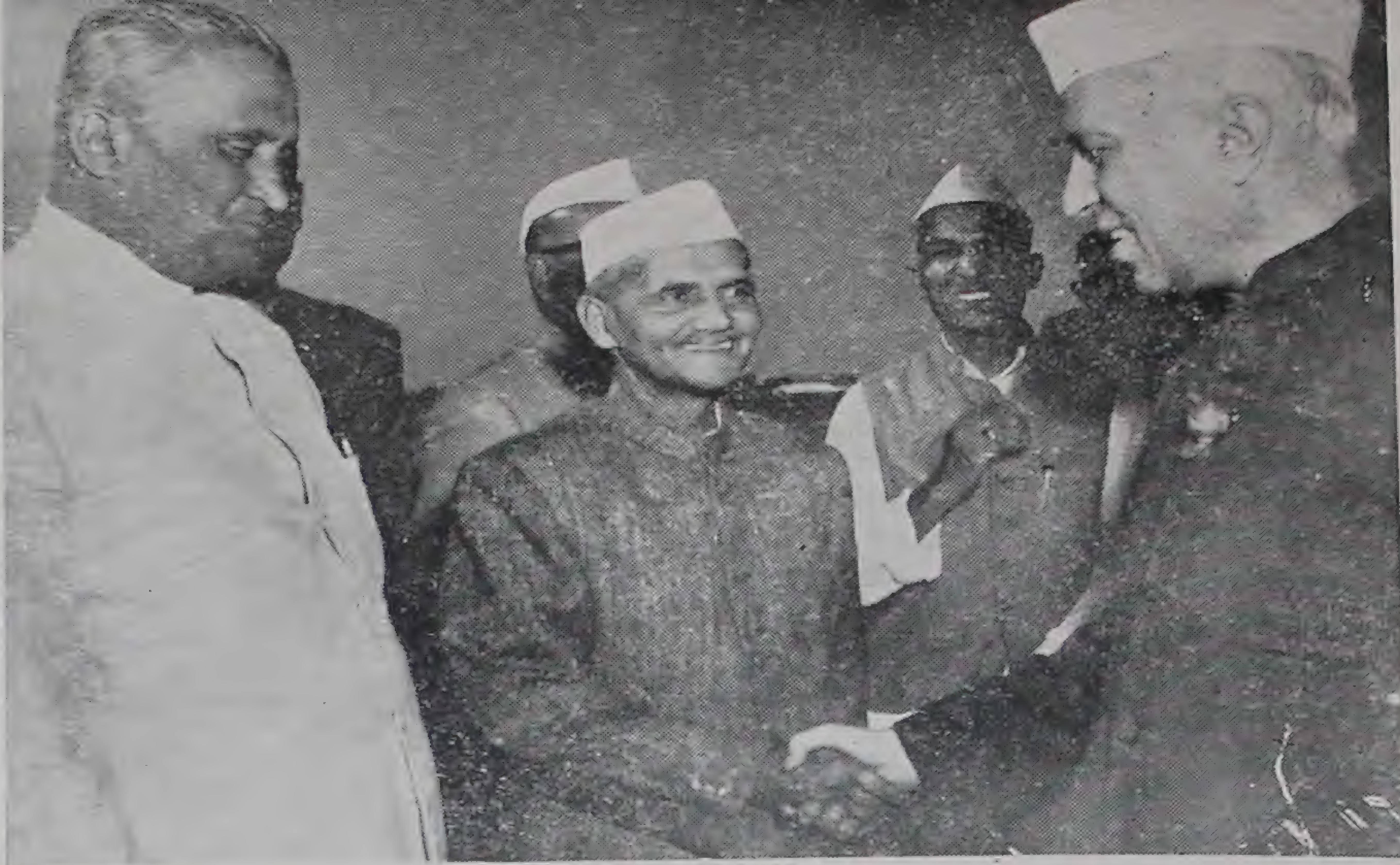
اب وطن کو اور بھی خوش حال بننا چاہیئے　　سورماؤں کو وفا کی ڈھال بننا چاہیئے
اہلِ بستی کو بلند اقبال بننا چاہیئے　　ذرے ذرے کو جواہر لال بننا چاہیئے

گلشنِ عالم پہ چھا جائیں بہاروں کی طرح
بات تو جب ہے کہ ہم چمکیں ستاروں کی طرح

اپنے دامن کو بچائیں شعلۂ پیکار سے　　گوشِ عالم کو رکھیں نا آشنا جھنکار سے
جس سے نہرو نے کیا تھا وار اسی ہتھیار سے　　جنگ کا سر کاٹ لیں ہم امن کی تلوار سے

سازِ الفت سے بدل دیں تیغ کی جھنکار کو
یاد رکھیں امنِ عالم کے علم بردار کو

شری لال بہادر شاستر
کے ساتھ



۱۹۳۹ء میں الہ آباد میں کانگریسی کارکنوں اور والنٹیروں کا ایک گروپ
جس میں مولانا ابوالکلام آزاد، شری پرشوتم داس ٹنڈن، پنڈت جواہرلال نہرو اور شری لال بہادر شاستری موجود تھے





ملکہ الزبتھ کے ساتھ



مارشل ٹیٹو کے ساتھ



شری جمال عبدالناصر صدر متحدہ عرب جمہوریہ
اور
شری سیوکارنو صدر انڈونیشیا کے ساتھ

اکابر کے ساتھ



مسٹر خروشچیف کے ساتھ

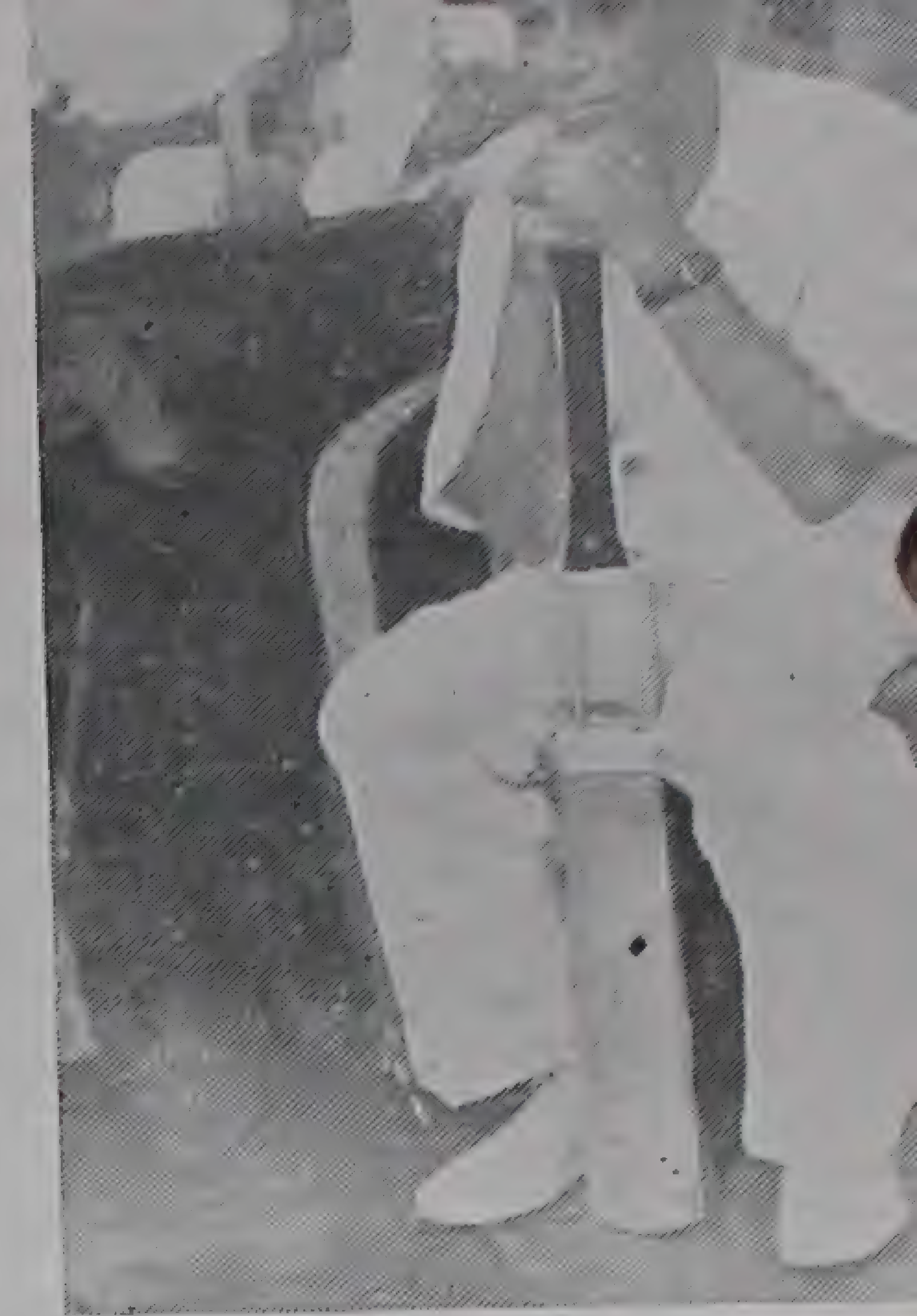


واشنگٹن میں امریکہ کے سابق
صدر مسٹر کینیڈی کے ساتھ

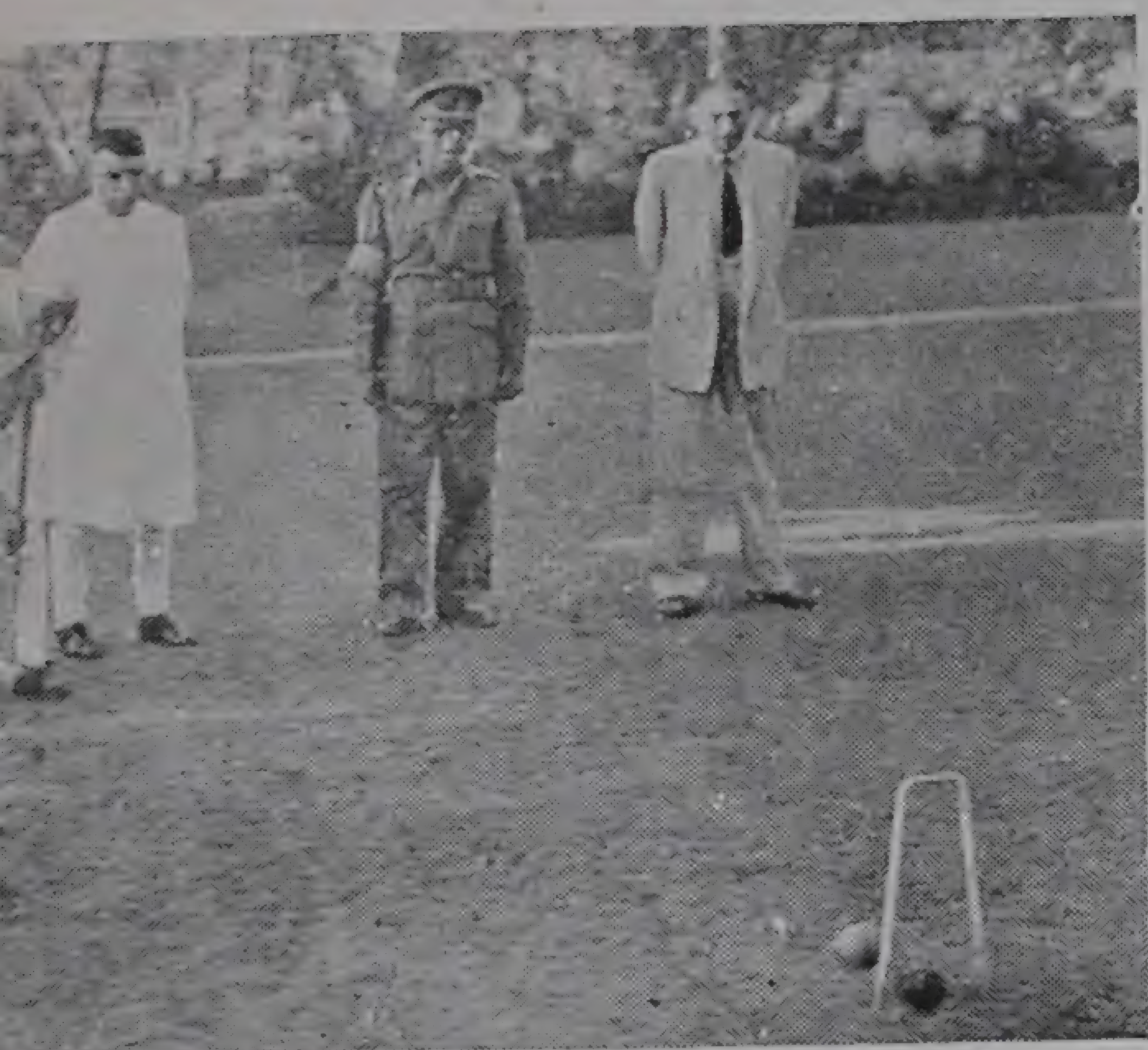


پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل
محمد ایوب خاں کے ساتھ

کھیلوں کا مشتاق
جواہر لال



کرکٹ کھیلنے کے لئے
تیار



انگریزی کھیل کراکے کھیلتے ہوئے



بلیرڈ کھیلتے ہوئے



جھولا جھولتے ہوئے



گھوڑے کی سواری

گوپی ناتھ امن

جنگِ آزادی کا سپاہی ـــ جواہر لال نہرو

دنیا کی تمام عظیم ہستیوں کی طرح پنڈت جواہر لال نہرو کی زندگی کے بھی بہت پہلو ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر اس لئے اُجاگر ہوئے کہ وہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے سپاہی تھے۔ یہ بھی عجیب جنگ تھی۔ ان سپاہیوں کے پاس تلوار نہ خنجر، نہ توپ نہ تفنگ۔ ان کے لیڈر مہاتما گاندھی نے کہا کہ بے جان ہتھیاروں پر نہیں بلکہ اپنے آپ پر اور اپنے اصولوں پر بھروسہ رکھو۔ کچھ لوگوں نے مذاق اڑایا، کچھ نے سنجیدگی سے بحث کر کے اسے ناقابلِ عمل بتایا، کچھ ناراض ہوئے لیکن لاکھوں نے اس پروگرام کو اپنایا۔ ان میں سے ایک پنڈت جواہر لال نہرو تھے جن کی پہلی ملاقات مہاتما گاندھی سے ۱۹۱۶ء میں ہوئی تھی اور جو ۱۹۱۹ء میں ان کے پیروؤں میں داخل ہوئے اور بالآخر گاندھی جی نے انھیں اپنا جانشین قرار دیا۔ جنگِ آزادی کے سپاہی کی حیثیت سے پنڈت جواہر لال نہرو اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

انڈین نیشنل کانگریس ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی تھی لیکن اس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی قبول کرنے سے پہلے انقلابی پروگرام نہیں اپنایا تھا۔ گاندھی جی کے عملی پروگرام میں سردار پٹیل، راجندر بابو اور آچاریہ کرپلانی پنڈت جواہر لال نہرو سے پہلے شریک ہو چکے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو تو ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی کے کیمپ میں آئے لیکن یہ حضرات ۱۸-۱۹۱۷ء میں ہی گاندھی جی کے رفیقِ کار بن چکے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی عملی سیاست میں آنے سے پہلے موتی لال نہرو ملک کے سیاسی لیڈروں میں تھے اور وہ ۱۹۱۷ء میں یو۔پی پراونشل کانفرنس کی صدارت کر چکے تھے۔ رولٹ بل کا ایکٹ بن جانا اور جلیانوالہ باغ میں قتلِ عام ہونا ایسے واقعات تھے جنھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو بہت متاثر کیا وہ گاندھی جی کے ستیاگرہیوں میں شامل ہو گئے اور ۱۹۲۰ء میں وکالت کو خیرباد کہا، تحریکِ ترکِ موالات میں شریک ہوئے اور جلد ہی گاندھی جی کی نظروں میں چڑھ گئے۔ چناں چہ اس تحریک کے ابتدائی دور میں جب پنڈت موتی لال نہرو صوبہ کانگریس کمیٹی یو۔پی کے صدر تھے تب جواہر لال جی سیکرٹری تھے۔ یہی زمانہ ان کی پہلی سزا یابی کا تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو لکھنؤ جیل میں اور پنڈت جواہر لال نہرو نینی جیل میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہرو خاندان جنگِ آزادیٔ وطن میں شریک ہونے میں پیش پیش تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے ماں باپ، بیوی اور بہنیں سب اس تحریک میں شریک ہوئے لیکن بالآخر پنڈت جواہر لال نہرو سب پر سبقت لے گئے۔ پنڈت موتی لال نہرو دو بار کانگریس کے صدر رہے اور پنڈت جواہر لال پانچ بار۔ ملک میں پنڈت جواہر لال نہرو کی عزت اور شہرت ان کی قربانیوں سے ہی بڑھی ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ترکِ موالات کی تحریک ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی۔ مہاتما گاندھی کی اس تحریک کو کلکتہ کے خاص اجلاس میں انڈین نیشنل کانگریس نے

لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں منظور کرلیا۔ اس میں سرکاری عہدوں، ملازمتوں، تقریبوں، کالجوں، سکولوں اور عدالتوں کا بائیکاٹ شامل تھا۔ چناں چہ پنڈت موتی لال نہرو نے بھی اپنی وکالت ترک کردی لیکن پنڈت جواہرلال نہرو ان سے پہلے ہی بیرسٹری چھوڑ چکے تھے۔ جواہرلال جی نے صرف بیرسٹری ہی نہیں چھوڑی بلکہ اپنی زندگی میں زبردست انقلاب پیدا کیا۔ انھوں نے نہ صرف گاندھی جی کی ہدایت کے بموجب بدیشی کپڑا پہننا ترک کیا بلکہ لباس بھی بہت سادہ کرلیا۔ انھوں نے دیہات کی طرف رُخ کیا۔ سیاسیات میں یہ رجحان مہاتما گاندھی نے کھیڑا اور چمپارن کی کسان تحریکوں کے ذریعہ پیدا کیا تھا ورنہ اس وقت تک کانگریس کی سیاست صرف شہروں تک محدود تھی۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے الہ آباد کے کسانوں میں بیداری پیدا کی۔ اودھ کا کسان خاص طور پر پچھڑا ہوا تھا۔ اس میں بھی ایک نئی زندگی کی لہر دوڑی۔ اب وہ جواہرلال جو پہلے بہترین انگریزی سوٹ میں ملبوس رہتا تھا۔ کُرتہ دھوتی اور چپل پہنے گاؤں میں گھومتا پھرتا تھا۔ ہاں کُرتے پر ایک واسکٹ بھی ہوتی تھی جو بعد کو جواہر جاکٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج میں آندھیوں اور طوفانوں میں بھارت کا یہ سپوت کبھی پیدل کبھی سائیکل پر، کبھی موٹر پر تو کبھی یکّہ پر گاؤں میں پھرتا تھا۔ نوجوانوں میں اس کے لئے خاص کشش تھی اور اس میں نوجوانوں کے لئے جواہرلال نہرو کو اب ویر جواہر یا بیر جواہر کہا جانے لگا۔ اس تحریک کے دوران ۲۲-۱۹۲۰ء میں اسے دو بار سزا ہوئی۔ ایک بار تین مہینے کی اور ایک بار چھ مہینے کی۔ لیکن

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ ہر سزا کے بعد

ایک سال بعد جیتو میں سکھوں کا مورچہ لگایا۔ ریاست پٹیالہ اور ریاست نابھہ کے اختلاف نے سیاسی صورت اختیار کرلی۔ برٹش سرکار نے جو مہاراجہ نابھہ کے قوم پرور نظریہ سے کھٹکتی تھی انھیں گرفتار کرکے کوڈائی کنال میں نظربند کردیا۔ اسی ریاست میں جیتو ایک مقام ہے جہاں سکھوں نے مورچہ لگایا۔ گرفتاریاں شروع ہوئیں پنڈت جواہرلال نہرو بھی وہاں پہنچے انھیں بھی گرفتار کرلیا گیا اور ایک معمولی قیدی کی طرح حوالات میں بند کردیا گیا جہاں رات بھر چوہے ان کے جسم پر سے گزرتے رہے اور دوسری صبح انھیں اور شری کے سنتانم کو ایک ہی رسّی سے کمر باندھ کر عدالت میں پیش کیا گیا لیکن یہ مقدمہ زیادہ نہیں چلا۔ پنڈت موتی لال نہرو اور حکومت کے درمیان خط وکتابت ہوئی۔ جس کی وجہ سے مقامی حکومت کو جواہرلال جی کو چھوڑنا پڑا۔

گاندھی جی مارچ ۱۹۲۲ء میں گرفتار ہو چکے تھے۔ اس وقت تک جواہرلال جی صوبہ کانگریس یو۔پی کے سیکریٹری تھے مگر جب گاندھی جی ۱۹۲۴ء میں رہا ہوکر آئے تو پنڈت جی آل انڈیا کانگریس کے سیکریٹری تھے۔ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد فرقہ وارانہ تحریکیں بہت زور پکڑ چکی تھیں گاندھی جی نے رہا ہونے کے بعد ان تحریکوں کی سخت مخالفت کی، لیکن پنڈت جواہرلال نہرو اور ان کے والدِ ماجد پنڈت موتی لال نہرو نے ان تحریکوں کی مخالفت پہلے ہی سے شروع کر رکھی تھی اور پنڈت جواہرلال نہرو ان تحریکوں کو برٹش سامراج کا کھیل سمجھتے تھے۔

۱۹۲۲ء میں گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد کانگریس کے اندر ایک اور انتشار پیدا ہوا۔ یعنی ایک طبقہ کی رائے تھی کہ اب چوں کہ گاندھی جی نے سول نافرمانی کو ختم کردیا ہے اور محض تعمیری پروگرام میں اتنی کشش نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو پوری جاذبیت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ رکھ سکے اس لئے اب کونسلوں اور اسمبلیوں میں داخل ہونا چاہیئے۔ دوسرا طبقہ اس کے خلاف تھا۔ عجیب دل چسپ بات یہ تھی کہ پنڈت موتی لال نہرو داخلۂ کونسل کے حق میں تھے اور پنڈت جواہرلال نہرو اس کے خلاف، اسی طرح سردار وٹھل بھائی پٹیل جو بعد کو پریزیڈنٹ پٹیل کے نام سے مشہور ہوئے اس داخلہ کے حق میں تھے اور ان کے چھوٹے بھائی سردار ولبھ بھائی پٹیل جو باردولی کے ستیہ گرہ کے بعد سردار پٹیل کہلانے لگے اس کے سخت خلاف تھے۔ مخالفینِ داخلۂ کونسل کو عام طور پر بایاں بازو سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ پنڈت موتی لال نہرو، دیش بندھو چترنجن داس اور مسٹر وٹھل بھائی پٹیل تو داخلۂ کونسل کے حق میں تھے اور پنڈت جواہرلال نہرو، سردار پٹیل، ڈاکٹر انصاری اور راجندر بابو اس کے مخالف تھے۔ پنڈت جواہرلال نہرو اور ان کے ہم خیال حضرات کا یہ کہنا تھا کہ اگر

ہم انتخابی چکر میں پڑ گئے اور ہماری توجہ کونسل اور اسمبلی کی بحثوں کی طرف ہو گئی تو پھر ہمارے اندر انقلابی آگ کے شعلے بجھ جائیں گے۔ آخر مولانا آزاد نے ۱۹۲۳ء میں دلّی کے خاص اجلاس کانگریس میں دونوں میں یہ سمجھوتہ کرا دیا کہ جو کانگریسی الیکشن لڑنا چاہیں وہ کانگریس کی طرف سے نہیں لڑیں گے۔ لیکن انتخاب لڑنے پر ان سے کسی قسم کی باز پرس نہ کی جائے گی۔ اس مسئلہ پر بڑی کش مکش رہی۔ دیش بندھو چترنجن داس نے ۱۹۲۲ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ختم ہوتے ہی کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور ایک کانگریس خلافت سوراج پارٹی بنائی جس کا نام بعد میں صرف سوراج پارٹی رہ گیا۔ جواہر لال جی ذاتی طور پر داخلۂ کونسل کے خلاف تھے لیکن وہ اپنے والد پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے دوست شری چترنجن داس کا احترام بھی بہت کرتے تھے اس لئے انھوں نے یہ زور نہیں دیا کہ داخلۂ کونسل کے حامیوں کو کانگریس سے نکال دیا جائے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو یہ صدمہ ہوا کہ کانگریس کے بڑے بڑے ارکان کو جیسے گاندھی جی کے پروگرام میں وشواس نہیں رہا اور اعتماد کی یہ کمی قوتِ عمل کی کمی سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ انگریز حکومت سے کونسلوں اور اسمبلیوں کے اندر نہیں بلکہ عوامی میدان میں لڑنا چاہتے تھے، اگرچہ وہ لڑائی اہنساتمک یا عدم تشدد کی لڑائی تھی۔

۱۹۲۷ء میں مدراس میں ڈاکٹر انصاری کی زیرِ صدارت انڈین نیشنل کانگریس کا جو اجلاس ہوا اس نے ظاہر کر دیا کہ ایک بار پھر برٹش حکومت سے براہِ راست ٹکراؤ ہونے والا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ لارڈ برکن ہیڈ وزیرِ ہند کے مشورے سے ایک کمیشن حکومت برطانیہ نے اس لئے مقرر کیا کہ وہ اس بات کا جائزہ لے کہ ہندوستان کس درجہ تک حکومت خود اختیاری یا ذمہ دار حکومت کے قابل ہوا ہے۔ اس کمیشن کے سات ارکان تھے اور سب کے سب انگریز۔ چونکہ اس کمیشن کے صدر سر جان سائمن تھے اس لئے اس کا نام سائمن کمیشن پڑا۔ ہندوستان میں اس کے خلاف زبردست ہیجان پیدا ہوا اور نہ صرف کانگریس بلکہ مسلم لیگ نے بھی اس کا بائیکاٹ کیا۔ جب ۱۹۲۸ء میں یہ کمیشن ہندوستان آیا تو جا بجا اس کے خلاف مظاہرے کئے گئے۔ لکھنؤ میں جب یہ کمیشن پہنچا تو اس کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں میں پنڈت جواہر لال نہرو اور پنڈت گووند بلبھ پنت تھے۔ ان دونوں پر بھی لاٹھیاں برسائی گئیں۔ لیکن پنڈت نہرو کے اردگرد کالج کے طلبا اُن سے لپٹ گئے ورنہ انھیں مار ڈالنے کا ہی منصوبہ باندھا گیا تھا۔ اسی اثنا میں کسی نے پنڈت نہرو کے ہاتھ میں ریوالور دینا چاہا مگر انھوں نے لیا نہیں غالباً یہ شخص کوئی خفیہ پولیس کا آدمی تھا جو ایک سنگین جرم میں انھیں گرفتار کرانا چاہتا تھا۔ مگر پنڈت نہرو اس کی چال میں نہیں آئے۔ پنڈت نہرو تو معمولی علاج کے بعد ٹھیک ہو گئے لیکن پنڈت گووند بلبھ پنت کے جسم میں رعشہ ہو گیا جو آخر عمر تک رہا۔

سائمن کمیشن کا جواب دینے کے لئے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک آل پارٹیز کمیٹی بنی اور پنڈت جواہر لال نہرو آل انڈیا کانگریس کے سکریٹری کی حیثیت سے اس کمیٹی کے بھی سکریٹری تھے۔ چونکہ اس کمیٹی نے مکمل آزاد ہندوستان کا آئین نہیں بنایا بلکہ درجۂ نو آبادیات کا، اس لئے پنڈت جواہر لال نہرو کو اس سے اطمینان نہ تھا اس لئے انھوں نے ایک انڈی پینڈنس لیگ بنا لی جس کا مطالبہ ہندوستان کو مکمل طور پر آزاد کرانا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور نیتا جی سبھاش چندر بوس دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کے اجلاسِ کانگریس میں بطورِ احتجاج اس روز بھی شریک نہیں ہوئے جس روز آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ اس میں منظور کی گئی۔ گاندھی جی نے منع کر دیا ورنہ یہ دونوں کھلے اجلاس میں آ کر مخالفت کرتے۔ گاندھی جی نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ گیا ہے۔ کش مکش بڑھ رہی ہے۔ اس لئے جب ۱۹۲۹ء کے اجلاس کانگریس کے لئے جو لاہور میں ہونے والا تھا ان کا نام پیش ہوا تو انھوں نے اپنا نام واپس لے کر پنڈت جواہر لال نہرو کا نام پیش کر دیا چنانچہ لاہور کے اجلاس میں پنڈت جواہر لال نہرو کی زیرِ صدارت آزادیِ کامل کا ریزولیوشن پاس ہو گیا اور پنڈت موتی لال نہرو نے جو ۱۹۲۸ء میں دوبارہ صدر منتخب ہوئے تھے، انھیں صدارت کا چارج دیتے ہوئے کہا ؎

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

آزادئ کامل کا ریزولیوشن ۳۱ ۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کو رات کے بارہ بجے پاس ہوا تو سرحد کے خدائی خدمتگاروں نے پنڈت جواہرلال نہرو کو اپنے حلقہ میں لے لیا اور ناچنے لگے ۔ پنڈت جی نے ان کے ساتھ رقص کرتے ہوئے کہا کہ اسی جوش کے ساتھ گولیاں بھی کھانی ہوں گی ۔ چند مہینے بعد قصہ خوانی بازار میں سرحدیوں نے ترنگے جھنڈے کی حفاظت کے لئے سینکڑوں کی تعداد میں جان دے کر اس کی تصدیق کر دی ۔ مہاتما گاندھی نے حسب عادت انگریزوں سے خط و کتابت کی کہ اگر وہ گیارہ مطالبات مان لیں تو ان میں آزادئ کامل کا جوہر آجاتا ہے ۔ لیکن انگریز حکومت نہ مانی ۔ آخر نمک ستیاگرہ کی تحریک شروع ہوئی اور پنڈت جواہرلال نہرو اور دوسرے لیڈر گرفتار ہو گئے ۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک پنڈت جواہرلال نہرو کا بیشتر زمانہ جیل میں گزرا ۔ ۱۹۳۱ء میں جنوری کے آخر میں وہ رہا ہوئے تھے ۔ اسی کے دو ہفتہ کے بعد ان کے والد ماجد پنڈت موتی لال نہرو کا انتقال ہو گیا ۔ انگریز حکومت نے گاندھی جی کو بات چیت کے لئے ولایت بلایا ۔ اسی مقصد کے لئے انہیں جنوری ۱۹۳۱ء میں چھوڑا گیا تھا ۔ ۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی ارون معاہدہ ہوا ۔ پنڈت جواہرلال نہرو ذاتی طور پر اس معاہدہ کے خلاف تھے مگر ڈسپلن کے بھی انتہائی پابند تھے ۔ اس لئے انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی اکثریت رائے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ۔ بہرحال سول نافرمانی کی یہ شاندار لڑائی پنڈت جواہرلال نہرو کی صدارت کے زمانے میں لڑی گئی ۔

مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے ولایت گئے لیکن وہاں فرقہ پرست ہندوؤں اور مسلمانوں کی کش مکش کی وجہ سے (جسے انگریزوں نے اور ہوا دی) مسئلہ حل نہ ہو سکا اور گاندھی جی ہندوستان واپس آئے اور جیسا انھوں نے کہا مایوسی اور شرم کے ساتھ واپس آئے کیونکہ نہ فرقہ پرست ہندو ان کی بات ماننے کو تیار تھے نہ فرقہ پرست مسلمان ۔ پنڈت جواہرلال نہرو اُن سے ملنے کے لئے بمبئی جا رہے تھے کہ راستہ ہی میں گرفتار کر لئے گئے یہ واقعہ دسمبر ۱۹۳۱ء کا ہے ۔ اب جواہرلال جی کی رفیقۂ حیات کملا نہرو تپ دق کے مہلک مرض میں مبتلا ہو چکی تھیں ۔ پنڈت جی کی طویل سزاؤں نے کملا جی کو اور بھی نڈھال کر دیا ۔ یورپ میں بھی ان کا علاج ہوا لیکن شریمتی کملا نہرو جانبر نہ ہو سکیں اور ۱۹۳۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا ۔ مگر پنڈت جواہرلال نہرو کو ماتم کی فرصت ہی کہاں تھی ۔ اسی سال وہ پھر کانگریس کے صدر منتخب ہو گئے ۔ اپنے صدارتی ایڈریس میں انھوں نے کملا جی کی موت کا ایک ہلکا سا اشارہ یہ کیا کہ

’میں اس انجمن میں بھی کچھ تنہائی سی محسوس کر رہا ہوں‘

اسی سال کانگریس انتخاب لڑی ۔ ۱۹۳۷ء میں پنڈت جی پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور ان کی صدارت کے زمانے میں صوبہ سرحد، اترپردیش، بہار، بمبئی، مدھیہ پردیش، مدراس اور آسام میں کانگریسی وزارتیں بن گئیں ۔ لیکن ابھی یہ وزارتیں دو سال بھی نہ چلی تھیں کہ دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی ۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان کی رائے لئے بغیر اسے جنگ میں شامل کر لیا جس کے خلاف احتجاج کے طور پر تمام کانگریسی وزارتوں نے استعفے دے دئے اور ایک بار پھر کانگریس اور برطانوی حکومت میں ٹکر ہو گئی ۔

مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں شرکتِ جنگ کے خلاف تحریک شروع ہوئی جو انفرادی ستیاگرہ کی تحریک کہلائی ۔ اس میں سب سے پہلی گرفتاری آچاریہ ونوبا بھاوے کی ہوئی ۔ دوسری گرفتاری (جو اس ستیاگرہ کی شرکت کے لئے نہیں بلکہ بغاوت کے لئے تھی) پنڈت جواہرلال نہرو کی ہوئی اور انھیں چار سال کی سزا دی گئی ۔ لیکن جاپان کے حملہ کر دینے پر حکومت اور کانگریس میں ایک بار پھر سمجھوتہ ہوا اور پنڈت جواہرلال نہرو گرفتاری کے ایک سال بعد ہی چھوڑ دئے گئے ۔ میں نے ۱۹۴۰ء میں پنڈت جی کی سزایابی پر جو نظم لکھی تھی اس میں ایک شعر تھا

دیکھئے ہوتا ہے کیا دنیا کا حال
کون رکھے گا قفس میں چار سال

پنڈت جی ۱۹۴۱ء کے آخر میں رہا ہوئے ۔ ۱۹۴۲ء میں

سر اسٹیفورڈ کرپس برطانوی حکومت کی طرف سے ایک اسکیم لے کر آئے جسے مہاتما
گاندھی نے تو پہلے ہی نامنظور کردیا اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے مزید غور و خوض کے
بعد۔ سر اسٹیفورڈ کرپس اُدھر کانگریس کو کوستے ہوئے ولایت واپس گئے۔ اِدھر
گاندھی جی نے "بھارت چھوڑ دو" کی تحریک چلادی۔ گاندھی جی کی صحت اس
قابل نہ تھی کہ وہ ملک میں گھوم پھر کر اس کا پرچار کریں۔ یہ کام پنڈت جواہر لال نہرو
اور ان کے رفقاءِ کار کے حصہ میں آیا۔ انھیں دنوں گاندھی جی نے اعلان کیا کہ جواہر لال
نہرو میرے جانشین ہوں گے۔ آخر بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کا وہ
تاریخی اجلاس ہوا جس میں "بھارت چھوڑ دو" کا ریزولیوشن پاس کیا گیا۔
اس کے بعد جو ہونا تھا وہی ہوا یعنی تمام لیڈر بمبئی میں ۹۔ اگست کی صبح
کو گرفتار ہوگئے۔ مہاتما گاندھی، ماتا کستوربا گاندھی اور مہادیو ڈیسائی
کو تو آغا خاں پیلس میں بند کردیا گیا اور مولانا آزاد صدر کانگریس،
پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے لیڈروں کو جو بمبئی میں گرفتار ہوئے
تھے، احمد نگر کے قلعہ میں بھیج دیا گیا اور ایک مدت تک یہ پتہ بھی نہیں چلا
کہ یہ لوگ کہاں رکھے گئے ہیں۔ ۹۔ اگست کو ہی جا بجا صوبوں میں بھی
کانگریسی لیڈروں کی گرفتاریاں ہوئیں، ہنگامے ہوئے اور تمام ملک
میں بغاوت پھیل گئی۔ ہزاروں آدمی ہلاک اور لاکھوں گرفتار ہوئے۔
نہ جانے کتنوں کی جائدادیں ضبط اور تباہ ہوئیں اور کتنے لاٹھیوں کی مار
سے زخمی ہوئے۔ آخر ۱۹۴۵ء میں جنگِ عظیم کے ختم ہوتے ہی کانگریسی
لیڈروں کو چھوڑ دیا گیا اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی جیل سے باہر آگئے۔
ایک طرف مسلم لیگ سے اور دوسری طرف برطانوی سلطنت سے
بات چیت شروع ہوئی۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں پنڈت جواہر لال نہرو
ایک بار پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اس سے پہلے وہ کشمیر میں
عارضی طور پر گرفتار بھی ہوئے تھے۔ یہ ان کی زندگی کی آخری گرفتاری
تھی۔ آخر لارڈ ویول اور مسٹر جناح سے بات چیت کے نتیجے کے طور پر
ملک میں کانگریس اور مسلم لیگ کی ملی جلی وزارت پنڈت جواہر لال نہرو
کے مشورے سے قائم ہوئی لیکن مسلم لیگی حضرات تو کیا مسلم لیگی وزراء بھی
پنڈت جواہر لال نہرو کو وزیر اعظم ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس ملی جلی

انٹیرم وزارت کا زمانہ پنڈت جی کے لئے بڑا صبر آزما گزرا کیونکہ
لیگی وزیر نہ پنڈت جی سے مشورہ لیتے تھے نہ ان کے مشوروں میں شریک
ہوتے تھے بلکہ براہِ راست لارڈ ویول سے تعلق رکھتے تھے۔ پنڈت
جواہر لال نہرو کی یہ وزارت ۲ستمبر ۱۹۴۶ء کو قائم ہوئی تھی اور نومبر
۱۹۴۶ء میں انھوں نے میرٹھ میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس
میں کہا کہ میں دو بار استعفیٰ دے چکا ہوں۔ اس دوران پنڈت جی
سرحد کا دورہ کرنے گئے تو جا بجا ان پر گولیاں چلائی گئیں۔ معاملہ
صیغۂ راز میں رہا کہ یہ حرکت کن لوگوں کی تھی اور کن کے شہ دینے
سے کی گئی تھی۔ بہرحال یہ دورہ بھی پنڈت جی کی بے خوفی کا نمونہ تھا
اور ملک کو اطمینان ہوا کہ وہ اس دورے سے صحیح و سلامت
واپس آئے۔

آخر اس انٹیرم وزارت کے نہ چلنے پر پاکستان ماننا پڑا۔ ملک
آزاد ہوا مگر تقسیم ہو کر جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں
جگہ زبردست ہنگامے ہوئے۔ پنڈت جی نے جس طرح ۱۹۴۶ء
میں کئی جگہ اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی اب پھر اسی طرح
خطرے برداشت کرکے گاندھی جی کی ہم آہنگی کرتے ہوئے
تشدد پسند طاقتوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر سکون ہوا۔ پھر بھی
بہت سا نقصانِ جان و مال ہوا جس کی خلش ابھی تک دلوں
میں باقی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے وزیر اعظم ہند ہونے کے بعد
کہا کہ ہماری جنگ اب بھی جاری رہے گی۔ اب تک یہ جنگ
انگریزی سامراج کے خلاف تھی، اب یہ جہالت، غریبی اور
تعصب کے خلاف ہوگی۔ انھوں نے یہ جنگ جاری رکھی۔ وہ
مردِ مجاہد تھے آخر تک یہ لڑائی لڑتے رہے اور لڑتے لڑتے
ہی اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ البتہ ہمارے لئے یہ سبق
چھوڑ گئے ہیں کہ ہم بھی جہالت، غریبی اور تعصب کے خلاف
جنگ جاری رکھیں۔

بدرالدین طیب جی

پنڈت جی میری نظروں میں

۱۹۲۰ء میں یا اس سے ایک دو سال پہلے جبکہ مہاتما گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف عدم تعاون کی اپنی پہلی تحریک شروع کی تھی، پنڈت موتی لال نہرو اپنے اکلوتے لڑکے جواہرلال نہرو کے ساتھ ہمارے گھر سمرسٹ لاج (بمبئی) تشریف لائے تھے۔ اس واقع کا میرے ذہن میں بڑا دھندلا سا نقش ہے۔ ممکن ہے یہ بات میں نے اپنے گھر والوں سے سنی ہو اور میرے ذہن میں ایک خیالی تصویر بن گئی ہو یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے یہ بات صحیح طور سے یاد نہ ہو۔ بدقسمتی سے میرے عزیزوں میں کوئی ایسا بڑا بوڑھا زندہ نہیں ہے جس سے میں اس کی تصدیق کر سکتا۔ لہٰذا میں پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتا، لیکن ان باپ بیٹوں کا نقشہ جیسا کہ اس وقت میں نے انھیں دیکھا تھا میرے ذہن میں حیرت ناک حد تک صاف اور واضح انداز میں موجود ہے۔ ایک لمبا چہرہ اور اس کے تیکھے و سیمابی نقوش، پُروقار انداز، لباس اور حرکات و سکنات میں دل آویزی اور نفاست، اچانک بے تکلف ہو جانے اور کسی شخص میں دلچسپی لینے کا دل پذیر ڈھنگ، پھر اس طرح اپنے آپ میں کھو جانے اور اپنے گرد و پیش سے بے خبری جس میں ہمالیہ کی سی دوری، کشش اور خنکی ہوتی تھی۔ یہ تمام باتیں مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ اس وقت میری عمر دس اور تیرہ سال کے درمیان ہوگی۔

اس کے بعد جواہرلال نے میرے تصوّر میں ایک سورما کی صورت اختیار کر لی۔ مجھے تاریخی رومان پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ اس لئے جب میں نے مہابھارت پڑھا تو مجھے موتی لال نہرو اور ان کے بیٹے کے اس ابتدائی تصوّر کو پانڈوں کے راجہ اور ارجن سے مماثلت دینے میں کوئی دقّت نہیں ہوئی۔ ان دونوں میں کسی کا براہ راست میری زندگی پر اثر نہیں پڑا جیسا کہ وقتاً فوقتاً گاندھی جی کا پڑتا رہتا تھا، کیونکہ میرے خاندان کے کئی افراد سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ لہٰذا یہ دونوں نہرو میرے ذہن پر ہیرو بن کر چھائے رہے۔

۱۹۲۹ء میں جب میں پہلی بار ٹرین سے بمبئی سے دہلی جا رہا تھا تو مجھے یاد ہے کہ میں نے جواہرلال کو دوبارہ دیکھا۔ کسی چھوٹے اسٹیشن پر ان کی ایک جھلک دیکھی۔ مجھے صرف ان کا تابناک تبسّم اور روشن آنکھیں یاد ہیں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے تاریخی اجلاس کی صدارت کرنے جا رہے تھے جو راوی کے کنارے پر ہوا تھا اور جس میں ہندوستان کا نصب العین کامل آزادی قرار دیا گیا تھا۔

اس کے فوراً ہی بعد میں آکسفورڈ چلا گیا اور انڈین سول سروس کے امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ پھر ہندوستانی سیاست

یہ مضمون اس تقریر کا حصّہ ہے جو شری جواہرلال کی سترھویں سال گرہ کے موقع پر جناب بدرالدّین طیّب جی نے بون (مغربی جرمنی) میں کی تھی۔ آپ اس وقت ہندوستانی سفیر کی حیثیت سے وہاں متعین تھے (۱۹۵۹ء)

اور جواہرلال کی شخصیت وہاں کی انڈین مجلس کے مباحثوں کے لئے ایک علمی بحث بن گئی۔

انڈین سول سروس میں کامیاب ہوکر جب میں ہندوستان واپس آیا تو مجھے پنجاب میں مقرر کیا گیا اور پنڈت جی سے میری ملاقات ۱۹۴۵ء سے پہلے نہیں ہوئی جب کہ میں حکومت ہند میں نئی دلی آگیا۔

اس وقت میں نے انھیں ان کے چچازاد بھائی رتن[1] نہرو کے مکان پر پہلی بار قریب سے دیکھا اور صحیح معنوں میں ان سے واقفیت یہیں سے شروع ہوئی۔ جب ان سے میرا تعارف کرایا گیا تو انھوں نے فوراً ہی کہا۔ ہاں، ہاں، ان کو ہی نہیں بلکہ پورے طیّب جی خاندان کو جانتا ہوں۔ مجھے یہ سن کر فخر محسوس ہوا اور بڑا سکون ملا۔ میں نے سوچا کہ یہ ان کی شرافت ہے کہ انڈین سول سروس میں ملازم طیب جی میں اور طیّب جی خاندان کی قوم پرستی کی وجہ سے جیل جانے والے افراد میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ لیکن مجھے ان کی طبیعت کے چونچال پن، وسیع دلچسپیوں اور بھرپور تجسس نے زیادہ متاثر کیا تھا۔ اس وقت کا ایک چھوٹا سا واقعہ میرے حافظے میں جم کر رہ گیا ہے۔ جب ان کے لئے خاص چینی چائے لائی گئی تو انھوں نے چائے بنانے کے فن، اس کی اقسام، تاریخ اور کاشت وغیرہ پر بڑے عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی اور یہ باتیں انھوں نے اتنی عمدگی اور جولانیٔ طبع کے ساتھ بیان کیں کہ ہم لوگ مسحور ہوکر سنتے رہے۔

ستمبر ۱۹۴۶ء میں عبوری حکومت قائم ہوئی۔ پنڈت جی اس میں وائسرائے کی کونسل کے نائب صدر تھے۔ آزاد ہندوستان کے لئے دستور بنانے کے لئے دستور ساز اسمبلی بلانے کا انتظام کیا جاچکا تھا اور سر بی۔ این راؤ دستوری مشیر تھے۔ اس وقت مجھے پنڈت جی سے سرکاری اور ذاتی حیثیت میں تقریباً روزانہ ملنے کا موقع ملا۔

سر بی۔ این۔ راؤ پنڈت جی کے معتمد تھے اور اس وقت کانگریس پارٹی، مسلم لیگ اور برطانوی حکومت کے درمیان جو نازک سیاسی اور دستوری گفت وشنید ہورہی تھی اس میں ان سے برابر اصلاح لیا کرتے تھے۔ دستور ساز اسمبلی بلانے کے سلسلے میں ابتدائی تیاریوں کے لئے سر بی۔ این راؤ نے اپنے ایک نائب کی حیثیت سے میرا انتخاب کیا تھا۔ دستوری مشیر کار کی حیثیت سے وہ جو بھی کام کرتے تھے اس کے بارے میں مجھ سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ اپنی شخصیت، کردار اور دستوری معاملوں کی وسیع معلومات کی وجہ سے سر بی۔ این۔ راؤ کی حیثیت اس زبردست سیاسی تناؤ، دستوری گفت وشنید اور ہلچل کے زمانے میں کلیدی ہوگئی تھی۔ اس وقت اس سوال پر غور کیا جارہا تھا کہ ہندوستان کو سیاسی لحاظ سے کس طرح صحت مند بنایا جائے۔ یہ اس وقت کا سب سے اہم موضوع تھا کہ اس کی صحت کے لئے طبیب (فزیشن) کی ضرورت ہے یا سرجن کی۔ سر بی۔ این راؤ بلاشبہ ایک طبیب تھے سرجن نہ تھے۔

ہندوستان کی بدقسمتی سے میدان ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو سیاست میں عمل جراحی کے قائل تھے۔ انجام کار ملک کی تقسیم کا فیصلہ ہوگیا اور بڑی سخت گیری اور تیزی کے ساتھ اس پر عمل شروع ہوگیا۔ اس بحران کے زمانے میں جبکہ ہر روز فساد، قتل اور منافرت کی خبریں آرہی تھیں، حالانکہ مہاتما گاندھی، پنڈت جی، مولانا آزاد اور سر بی۔ این۔ راؤ جیسے لوگوں کی عینیت اور انسان پرستی اس جبر وتشدد کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی لیکن اس میں رفتہ رفتہ مصالحت پسندی آگئی تھی۔ میں نے نظریوں اور شخصیتوں کی اس اندرونی کشمکش کو کافی حد تک دیکھا ہے اور اس طرح میرے سامنے ان طاقتوں کی توانائی اور زور کا واضح نقشہ آگیا جو ان آدرشوں اور اصولوں کے خلاف صف آرا تھیں جن کے پنڈت جی علمبردار تھے اور جس کے لئے وہ ساری عمر لڑنے کے لئے تیار تھے۔

ان بیتے دنوں کو یاد کرتے ہوئے بعض اوقات سوچنے

---

[1] مسٹر آر۔ کے نہرو جو اس وقت مصر میں ہندوستان کے سفیر تھے اور بعد میں سکریٹری جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

لگتا ہوں کہ کیا پنڈت جی اپنی پوزیشن کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکتے اگر انھیں مہاتما گاندھی کی حمایت حاصل نہ ہوتی۔

اس وقت جو کام ہو رہے تھے ان میں پنڈت جی کی دل چسپی کی وجہ سے میرا ان سے براہِ راست تعلق پیدا ہو گیا۔ چوں کہ دستور ساز اسمبلی کو بلانے کے سلسلے میں جو انتظامی امور تھے وہ کم و بیش میرے سپرد تھے اس لئے مجھے اکثر انھیں یہ بتلانے کا موقع ملتا تھا کہ ہم کیا کچھ کر رہے ہیں۔ میری ان سے ملاقاتیں بڑی فرحت بخش ہوتی تھیں۔ وہ بڑے خوش مزاج تھے، فوراً ہی تعریف یا نکتہ چینی کرتے، جو کچھ بھی کہنا چاہتے، صاف صاف کہہ دیتے۔ وہ اپنی رائے بدلنے کو تیار رہتے اگر وہ یہ محسوس کرتے کہ ان کی رائے کے برعکس جو رائے پیش کی گئی ہے اس میں کچھ کارآمد باتیں ہیں اور یہ کہ انھیں سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ بالکل برابری کا سلوک کرتے تھے اور ایک مساوی سطح پر آجاتے تھے اور کوئی بات چھپاتے نہ تھے۔ ان کے نزدیک سرکاری سلسلۂ مدارج، سررشتۂ آداب و رسوم کی نزاکتیں اور تقدم کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ دراصل انھیں ان کی خلاف ورزی کرنے میں ایک گونہ مسرت حاصل ہوتی تھی۔

پنڈت جی کی گرم مزاجی مشہور تھی۔ میں نے اس کا ایک دل چسپ مظاہرہ دیکھا جب کہ ۱۹۴۷ء میں نئی دلی کے پرانے قلعے میں پہلی افرایشیائی کانفرنس ہوئی تھی۔ میں اس کے اجلاس میں نقیب کی خدمات انجام دے رہا تھا۔ جس اجلاس میں مہاتما گاندھی کو تقریر کرنی تھی اس میں گڑبڑ پیدا ہو گئی۔ جو جگہ مہمانوں کے لئے مخصوص کی گئی تھی اس میں لوگوں کی بھیڑ گھس آئی۔ اس بھیڑ کو روکنا اور مدعو کردہ مہمانوں کو ان کی نشستوں پر بٹھانا تقریباً ناممکن تھا۔ اجلاس شروع ہونے کے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے سے یہ غیر مساوی جدوجہد جاری تھی اور ہم منتظمین بالکل تھک چکے تھے اور تقریباً ہار چکے تھے۔ اس وقت پنڈت جی آئے۔ وہ دوڑ کر مائیکروفون کے پاس پہونچے اور بڑے پُر جوش انداز میں مجمع سے خطاب کرنے لگے۔ اس کا فوری اثر ہوا مگر انسانوں کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا فوراً پیچھے مڑنا کوئی آسان نہ تھا۔ پھر کچھ شرارت پسند عناصر بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر موجود ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ پنڈت جی کی قوتِ برداشت بھی تیزی سے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک وہ ڈائس سے کود کر اس بھیڑ میں جا گھسے اور دائیں بائیں مکے چلانے لگے۔ مجمع میں نظم و ضبط پیدا ہو گیا اور امن قائم ہو گیا۔

جن غیر ملکی ڈیلی گیٹوں نے ہندوستان کے وزیر اعظم کو ایک پولیس مین کے فرائض انجام دیتے ہوئے دیکھا وہ نظم و ضبط قائم کرنے کی ان کی اس صلاحیت سے کافی متاثر ہوئے۔

میرا خیال ہے کہ پہلی مرتبہ میں ان کے غصے کا شکار اس وقت ہوا جب میں ان کی عارضی غیر حاضری کے زمانے میں دستور ساز اسمبلی کے سیکرٹری کا کام انجام دے رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مسئلہ یہ تھا کہ بعض سابقہ دیسی ریاستوں سے دستور ساز اسمبلی کے لئے جو امیدوار چُنے گئے تھے ان کے بارے میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ ان کے چناؤ میں راجوں یا ان کے ایجنٹوں نے دخل اندازی کی ہے یا زور زبردستی سے کام لیا ہے۔

یہ شکایتیں ریاست کی عوامی تنظیموں نے کی تھیں۔ جو کانگریس پارٹی کی شریک کار تھیں۔ جیسا کہ ہندوستان میں ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ تاروں اور درخواستوں کا تانتا بندھ گیا۔ جس میں حکام کے خلاف ہر قسم کے الزامات لگائے گئے تھے میں ایک سابق ضلع آفیسر کی حیثیت سے اپنے تجربے اور ٹریننگ کی بنا پر جانتا تھا کہ ایسی شکایتوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دینی چاہیئے یا کم سے کم اس وقت تک صحیح نہیں سمجھنا چاہیئے جب تک کسی غیر جانب دار شہادت کے ذریعے اس کی تصدیق نہ ہو جائے۔

پنڈت جی کی فطرت اور ان کا پس منظر اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ کام کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے اور بیسیوں قسم کے

مسائل نے انھیں پریشان کر رکھا تھا۔ اس کے ماسوا وہ ابھی حکومت ہند کی وسیع انتظامی مشینری اور کام کاج سے پوری طرح واقف نہ ہوئے تھے اور اس پر پورا بھروسا بھی نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا ان کی خواہش تھی کہ جو لوگ اس نئے جمہوری طریقۂ کار کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے مرتکب ہوئے ہیں ان کے خلاف فوری اور سخت کارروائی کی جائے۔

میں نے انھیں مشورہ دیا کہ جب تک کسی غیر جانبدارانہ تحقیقات کے ذریعے یہ الزامات صحیح ثابت نہ ہو جائیں ہمیں کوئی کارروائی نہیں کرنی چاہیئے۔ وہ نوکر شاہی (بیوروکریسی) کی تاخیر پسندی اور بے حسی کو بنیاد بنا کر مجھ پہ برس پڑے۔ میں ان کے غصے اور بے صبری کا بلا وجہ نشانہ بنا تھا۔ انھیں واقعی غصہ آ گیا تھا مگر اس میں ان کی شرافتِ النفسی ہی کارفرما تھی جس کا احساس مجھے اسی وقت ہی ہو گیا تھا۔ حالانکہ حقائق کی روشنی میں ان کی ناراضی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لہٰذا ان کے رویّے سے نہ تو مجھے غیر ضروری حیرت ہوئی اور نہ میں مرعوب ہوا۔ اس کے برعکس میرے دل میں اس شخص کے لئے جو خواہ مخواہ اپنے آپ کو سزا دے رہا ہے، وفاداری اور ہمدردی کا عجیب و غریب احساس پیدا ہوا۔

لہٰذا میں اپنی بات پر ڈٹا رہا اور ان کے غصے کے کم ہونے کا منتظر رہا۔ خوش قسمتی سے مجھے اس قسم کے مزاج والوں سے سابقہ پڑ چکا تھا اور مجھے اس کا تجربہ تھا۔ میرے والد کا اور خود میرا مزاج بھی اسی قسم کا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ جو کچھ وہ مجھے حکم دیں گے میں وہی کروں گا۔ مگر میری رائے میں ان حالات میں ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں دونوں فریق کی باتیں سننی چاہئیں۔

اس پر پنڈت جی نے اپنے دونوں بازو پھیلا دئے اور بڑی ہی دل کش مسکراہٹ کے ساتھ کہا — "جو تم کرنا چاہتے ہو وہی کرو، لیکن کچھ کرو ضرور۔"

پنڈت جی کے ساتھ کام کرنے کا مجھے اس وقت سب سے زیادہ خوش گوار تجربہ ہوا جبکہ دستور ساز اسمبلی کے سیکرٹریٹ میں ہندوستان کے قومی جھنڈے اور قومی نشان کا ڈیزائن طے کرنے کا مسئلہ زیرِ غور تھا۔

میں کافی پہلے ہی دستور ساز اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد سے گزارش کر چکا تھا کہ ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کے دن اور اس کے بعد استعمال کرنے کے لئے دستور ساز اسمبلی سے منظور شدہ ایک قومی جھنڈا اور نشان ہونا چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی تھی جس کا میں سیکرٹری تھا۔ قومی جھنڈے کے متعلق میرے ڈیزائن کو منظور ہونے میں کوئی خاص دقّت نہ ہوئی۔ پنڈت جی نے اس بات کو فوراً منظور کر لیا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے جھنڈے پر جو چرخہ بنا ہوا ہے اس کی جگہ دھرم چکر رکھا جائے۔ یہ نکتہ ان کے ذہن نشین ہو گیا کہ قومی جھنڈے کو قومی ہونا چاہیئے کسی پارٹی کا جھنڈا نہیں۔ مگر گاندھی جی کے لئے اس تبدیلی کو قبول کرنا ذرا مشکل تھا۔ ہندوستانی کسانوں کی حالت سدھارنے کے لئے چرخہ ان کی خاص دین تھی لیکن جب انھیں بتایا گیا کہ اگر جھنڈے پر چرخہ بنایا گیا تو صرف اس کا ایک رُخ صحیح دکھائی دے گا اور دوسری طرف جھنڈا اُلٹا نظر آئے گا تو پھر وہ اس تبدیلی کے لئے راضی ہو گئے۔

لیکن قومی نشان کے بارے میں جلد فیصلہ نہ کیا جا سکا۔ سارناتھ میں اشوک کی لاٹ پر بنے ہوئے شیروں کو قومی نشان کی حیثیت سے اختیار کرنے کا ارادہ تو میرے دل میں شروع ہی میں پیدا ہو گیا تھا لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ اس میں کچھ اور علامتیں شامل کر دی جائیں جو ہندوستان کی تاریخ کے دوسرے ادوار سے لی گئی ہوں۔

ان خیالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بہت سے ڈیزائن تیار کئے گئے اور اس سلسلے میں بار بار پنڈت جی سے ملا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ نہایت اہم اور ضروری کاموں میں مصروف ہوتے تھے لیکن انھوں نے کبھی مجھ سے ملاقات کرنے میں معذوری کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اس کام کی رفتار سے غیر مطمئن ہوئے۔

اب تک جو نتائج برآمد ہوئے تھے ہم دونوں اس سے غیر مطمئن تھے لیکن دونوں یہ تہیہ کئے ہوئے تھے کہ اس وقت تک کوشش جاری رکھی جائے جب تک کہ واقعی کوئی عمدہ اور مناسب نمونہ تیار نہ ہو جائے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں بالکل ہی غلط راستے پر چل رہا ہوں۔ اشوک کی لاٹ پر بنے ہوئے شیروں کے ساتھ کوئی اور ڈیزائن اور نمونہ کھپ ہی نہیں سکتا۔ یہ بذات خود آرٹ کا ایک مکمل نمونہ ہے۔

میں پنڈت جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں بتایا کہ ہندوستان کا قومی نشان اشوک کی لاٹ پر بنے ہوئے شیر ہی تو ہو سکتے ہیں کچھ اور نہیں۔ وہ فوراً ہی مجھ سے متفق ہو گئے اور حکومت نے اس نشان کو منظور کر لیا۔ اس کے نیچے سنسکرت کا مقولہ "ستیمو اجیتے" (سچ کی جیت ہوتی ہے) بہت بعد میں بڑھایا گیا ہے۔

اس وقت یارک روڈ کی ۱۷ نمبر کی کوٹھی میں پنڈت جی رہتے تھے۔ یہ کوٹھی نسبتاً چھوٹی تھی اور یہاں جو کچھ انتظامات کئے گئے تھے وہ عبوری حکومت کی طرح عارضی نوعیت کے تھے اس کا فائدہ بھی تھا پنڈت جی سے ملنے ملانے میں زیادہ دقت پیش نہ آتی تھی۔ ایک وزیر اعظم کے گرد حفاظتی انتظامات کا جو حصار بندھ جاتا ہے وہ ابھی پنڈت جی کے گرد نہیں بنا تھا۔

آزادی کے فوراً بعد شمالی ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا زور تھا دلی ان شہروں میں سے تھا جو فسادات سے بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ پاکستان سے بے شمار پناہ گزین آ رہے تھے اور اس طرح مسلمان دہلی چھوڑ کر جا رہے تھے۔ تقسیم ملک نے لوگوں کے ذہنوں کو بحران میں مبتلا کر دیا تھا اور لوگ فرقہ وارانہ جذبات کی شدت سے دیوانے ہو رہے تھے۔ چند مہینوں کے لئے میرے جیسے مسلمان کے لئے زندگی گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ ہر وقت جان اور مال کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ اس پُر آشوب زمانے میں پنڈت جی نے بحیثیت انسان، بحیثیت ایک شریف اور مہذب شخص اور بحیثیت ایک مدبر بڑی بلندی اور عالی ظرفی کا ثبوت دیا۔

انھوں نے اپنی پوری طاقت سے ملک کے اندر ہر محاذ پر رجعت پسند عناصر کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے ان لوگوں کو بھی سمجھانے بجھانے اور ان کا غصہ فرو کرنے کی کوشش کی جنھوں نے خود مصائب جھیلے تھے اور اب دوسروں سے اس کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ اپنی ان کوششوں میں انھوں نے جس ہمت، سرگرمی اور وسیع النظری کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی تاریخ میں کم ہی مثالیں ملیں گی۔

اس زمانے میں میرے ساتھ جو کچھ گزری وہ میرے حافظے میں محفوظ ہے۔

میں نے بیوی بچوں کو حیدرآباد بھیج دیا تھا اور خود ایک غیر مسلم دوست دیوان چمن لال کے مکان میں پناہ لی تھی کیوں کہ نئی دہلی میں تمام مسلمانوں کے مکانوں پر حملے ہو رہے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد کسی نے مجھے ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع دی کہ میرا مکان لوٹا جا رہا ہے۔ میں اپنے میزبان کے ایک ملازم کو ساتھ لے کر فوراً کار میں سوار ہوا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ جب میں مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ لٹیروں کی ایک ٹولی میرا سامان اٹھا کر لے جا رہی ہے جو کہ اسٹور روم میں حفاظت کے خیال سے بند کر دیا گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر ان میں سے چند بڑی دلیری سے میری کار تک آ گئے۔ وہ سب مسلح تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی بندوق کی نال میرے سینے سے لگا دی اور پوچھا کہ کیا میں مسلمان ہوں؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں میں مسلمان ہوں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ بہرحال میرے ہندو ساتھی کی حاضر دماغی سے میری جان بچ گئی۔ اس نے بندوق کی نال پکڑی اور کسی طرح سمجھا کر انھیں میری جان لینے سے باز رکھا۔

وزیر اعظم کو اس واقعہ کی خبر آدھی رات کو ملی اور وہ فوراً ہی میرے گھر پہنچے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ وہاں جا رہے ہیں تو میں بھی اپنے گھر کی طرف چل پڑا اور ان کے آنے کے کچھ دیر بعد وہاں پہونچا۔ میں نے اپنے اسٹور روم کی دھندلی روشنی میں جو نظارہ دیکھا وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ وزیر اعظم وہاں کھڑے تھے اور بڑے اکیلے اکیلے سے، جسمانی اور دماغی طور پر تھکے تھکے سے

نظر آ رہے تھے۔ کوئی کہیں سے چاک (سفید کھریا) لے آیا تھا اور اس سے وہ ہمارے بچے کھچے سامان پر اپنے دستخط کرنے لگے اور پھر پولیس کو جو وہاں آ پہونچی تھی ہدایت کی کہ وہ ان کی اچھی طرح حفاظت کرے۔

اس وقت سے میں نئے ہندوستان میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگا کیونکہ اس ملک کی قیادت پنڈت جی ایسے انسانوں کے ہاتھوں میں تھی۔

اس کے بعد میں شام کے وقت زیادہ تر پنڈت جی کے گھر جانے لگا۔ اکثر وہ اتنے مصروف ہوتے کہ کبھی ان کی دل کش مسکراہٹ یا محض چند الفاظ پر ہی قناعت کرنی پڑتی۔ لیکن یہ مکان اور اس کی ضو ریز شخصیت ہم جیسے لوگوں کو زبردست تقویت پہونچاتی تھی جو اپنے پیارے وطن میں حالات کے دھارے کی وجہ سے نہ صرف اپنی جان کا خطرہ محسوس کرتے تھے بلکہ سخت ذہنی اور جذباتی دباؤ میں بھی مبتلا تھے۔

دہلی میں فسادات کئی ہفتے تک ہوتے رہے اور امن و امان قائم نہ ہو سکا۔ ہزاروں آدمی اپنے گھر میں جو اب ایک نیا ملک بن گیا تھا زبردست مظالم کا شکار ہو کر چلے آ رہے تھے۔ اس طرح ہزاروں آدمی اپنے مال و اسباب سمیت دہلی سے پاکستان جا رہے تھے اس وقت سب سے زبردست مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح پناہ گزینوں کے ان گروہوں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہونے نہ دیا جائے کیونکہ اس طرح فرقہ وارانہ جذبات کے بھڑک اٹھنے کا ڈر تھا جو اس وقت اپنی انتہا کو پہونچے ہوئے تھے۔

مجھے[1] کمار اٹل کو اور مجھے گشتی ڈیوٹی سونپی گئی۔ ہم لوگ بندوقوں سے مسلح جیپ میں چکر لگاتے تاکہ بدمعاشوں کو نہتے شہریوں پر حملہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ چکر لگانے کے بعد ہم زیادہ تر ۱۷ یارک روڈ اتر جاتے اور جو کچھ ہم نے کیا ہوتا اور دیکھا ہوتا اس سے وزیر اعظم کو آگاہ کرتے۔

ایک دن شام کو ہم نے انھیں بتایا کہ مسلمان پناہ گزینوں کو شہر سے پرانے قلعے (جو نئی دلی کی دوسری طرف واقع ہے) کے مہاجر کیمپ جانے میں سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ انھیں منٹو روڈ سے گزرنا پڑتا ہے اور یہاں اکثر مسلح فسادی مسلمانوں پر حملے کر دیتے ہیں اور ان کا مال اسباب لوٹ کر آس پاس کے مکانوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔

یہ سنتے ہی پنڈت جی دوڑتے ہوئے اپنے کمرے میں گئے اور وہاں سے ایک ریوالور لے آئے جو انھوں نے بتایا کہ ان کے والد کا ہے۔ پھر انھوں نے ایک بڑی حیرت انگیز تجویز پیش کی۔ وہ کہنے لگے کہ میں تم لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔ ہم لوگ خستہ حال پناہ گزینوں کا سا بھیس بدل کر منٹو روڈ پر ادھر ادھر چکر لگائیں۔ مسلمان سمجھ کر فسادی ہم پر حملہ کریں گے اور اگر انھوں نے حملہ کیا تو ہم انھیں گولی مار دیں گے پھر اس طرح ان کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ہم لوگوں نے بہت سمجھایا اور بڑی مشکلوں سے اس بات پر راضی کیا کہ وہ اپنی تجویز پر عمل کرنے سے باز رہیں۔

اس سلسلے میں تیسرا واقعہ جو مجھے یاد ہے وہ یہ کہ ہمیں خبر ملی کہ مغربی پنجاب سے لٹے لٹائے اور مسلمانوں کے ستائے ہوئے بہت سے پناہ گزین دہلی پہونچے ہیں اور دہلی شہر کے وسط میں کیمپوں میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور دہلی کے مسلمانوں سے بدلہ لینے کی قسمیں کھا رہے ہیں۔ پنڈت جی نے فوراً وہاں جانے اور ان سے باتیں کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس وقت ان کے پاس تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو ہمیں دورِ متوسط کے میدانِ جنگ کا نقشہ نظر آیا۔ کئی ہزار رفیوجی میدان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں تلوار، درانتیاں اور دوسرے زرعی اوزار تھے۔ وہ غصے سے پاگل اور انتقام لینے کے لئے بے چین ہو رہے تھے اور اس فکر میں تھے کہ انھیں کچھ مل جائے جس پر وہ اپنا غصہ اتار سکیں۔ پنڈت جی کے ساتھ

---

[1] آپ ۱۹۵۹ء میں ترکی میں بھارت کے سفیر تھے۔

صرف ایک اور کانگریس لیڈر دیوان چمن لال تھے جو اُن ہی کی طرح نڈر اور دلیر تھے۔ اس کے علاوہ شاید تین یا چار پولیس مین تھے۔

ہم نے اپنی موٹر اس مجمع کے بیچ میں روک دی۔ پنڈت جی فوراً ہی کار کے بونٹ پر چڑھ گئے اور انھیں سمجھانے لگے۔ انھوں نے ان کی تعریف کی کہ وہ بڑی بہادری کے ساتھ لڑتے بھڑتے ہندوستان پہنچ گئے۔ ان کا جو جانی اور مالی نقصان ہوا تھا اس کے لئے ان سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا، لیکن پھر بڑی شعلہ فشانی کے ساتھ ان پر برس پڑے کہ وہ ان بے ضرر اور معصوم لوگوں سے بدلہ لینا چاہتے ہیں جن کا قصور صرف یہ ہے کہ ان کا تعلق اس مذہب سے ہے جس سے تعلق رکھنے والوں نے انھیں ستایا اور نقصان پہونچایا ہے۔

جراٗت اور ہمت کا یہ بڑا غیر معمولی مظاہرہ تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک نرم اور چھریرے بدن کا آدمی کھڑا تھا اور اس کے آگے انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو قتل و غارت گری پر تُلا ہوا تھا اور پوری طرح مسلح تھا۔ ان کے ایک وار سے ہندوستان کی اس مایۂ ناز ہستی کی زندگی ختم ہو سکتی تھی۔

اس اور ایسے بہت سے دوسرے موقعوں پر پنڈت جی نے جس زبردست خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا اور اپنے اخلاقی اقدار میں یقین کلی کی بدولت انھوں نے جس طرح بڑے بڑے مجمع کو ٹھنڈا اور شانت کیا ہے جو اپنے جان و مال اور عزت و آبرو کے لٹ جانے کی وجہ سے نہایت بے چین اور آمادۂ فساد تھا وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جنگ وغیرہ کے زمانے میں اگر ایسی ہی صورت حال پیدا ہو جائے تو ان کے اس کارنامے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

وزارتِ خارجہ میں کام کرنے کی وجہ سے قدرتی طور پر پنڈت جی سے میرا نزدیکی رابطہ قائم ہو گیا۔ میں صرف خارجی امور کے سلسلے میں ان سے ملاقات نہیں کرتا تھا بلکہ وہ ہر چیز میں دلچسپی لیتے تھے۔ وہ ہر اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے اپنا وقت دیتے اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کے لئے تیار رہتے اگر انھیں یقین ہو جاتا کہ اس کام سے ملک و قوم کو فائدہ پہونچے گا۔

۵۳-۱۹۵۲ء میں میں کامن ویلتھ سیکریٹری بنا اور پاکستان کے ساتھ تعلقات کا محکمہ میرے تحت آیا اور اس حیثیت میں سرکاری طور سے میں ان کے قریب آیا۔ پاکستان کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں میں نے ان کی ان خوبیوں کو سراہا جن کو میں نے کئی واقعات بیان کر کے آپ کے سامنے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، یقیناً یہ واقعات بذاتِ خود کچھ زیادہ اہم نہیں ہیں لیکن کم سے کم میرے نزدیک یہ ان کے وجود کے اندرونی گوشوں کو روشن کرنے والے ہیں۔

بلاشبہ رفیوجوں کا مسئلہ، نہری پانی کا جھگڑا اور کسی وقت بھڑک اُٹھنے والا کشمیر کا مسئلہ ہمیشہ ہماری توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا اور ان کی وجہ سے ہم بڑے متردد رہتے تھے لیکن ان کے علاوہ ان گنت دوسرے مسائل بھی تھے۔ یہ سوچا جا سکتا ہے کہ میرے جیسے ہندوستانی مسلمان کو ان مسائل سے نپٹنے میں مشکل کا سامنا ہوا ہوگا۔ حالانکہ میرے خاندان کے زیادہ تر لوگ ہندوستان میں تھے اور کئی نسلوں سے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل تھے۔ میرے خاندان کے کچھ لوگ تقسیم سے پہلے پاکستان جا کر آباد ہوئے تھے مگر کچھ لوگ تقسیم کے بعد بھی وہاں گئے تھے۔ لیکن میرے بہت سے دوست، انڈین سول سروس کے ساتھی اور دوسرے لوگ اپنے سیاسی اعتقادات، جائے سکونت یا دیگر وجوہ کی بناء پر پاکستان گئے تھے۔

اس کی وجہ سے جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی وہ مضحکہ خیز ہونے کے ساتھ بڑی الم ناک بھی تھی۔ میں ایک مثال کے ذریعے اس کی وضاحت کر دوں گا۔ جب میں کامن ویلتھ سیکریٹری کی حیثیت سے سرکاری طور پر پاکستان گیا تو ہوائی اڈے پر پاکستان کے چیف آف دی پروٹوکول نے جو میرے ماموں تھے، پورے سرکاری اعزازات کے ساتھ میرا استقبال کیا۔

بہرحال پنڈت جی کے ساتھ کامن ویلتھ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے مجھے کبھی کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہ آئی بلکہ یہ زمانہ میرے دورِ ملازمت کا بڑا اطمینان بخش اور خوشگوار زمانہ ہے۔ پاکستان کے بارے میں پنڈت جی کے خیالات، برصغیر ہند کے منقسم شدہ [illegible]ں کے درمیان خوشگوار تعلقات، دونوں طرف کے لوگوں کو یہ محسوس کرانا کہ دونوں کی خوشی اور خوشحالی کا انحصار ایک دوسرے پر ہے اور ان کی قسمتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، ان سب کے بارے میں ان کی جو رائے تھی وہ میری، ایک ہندوستانی مسلمان کی رائے سے پوری طرح ہم آہنگ تھی جو پاکستان سے خون، دوستی اور مذہب کا تعلق رکھتا ہے۔

پنڈت جی چالیس کروڑ ہندوستانیوں کے مسائل کو حل کرنے میں بے حد مصروف رہتے تھے۔ تقسیمِ ملک نے بڑے ہولناک نتائج پیدا کئے تھے اور لاکھوں آدمیوں نے ترکِ وطن کیا تھا۔ بڑے پیمانے پر دوسری مصیبتیں بھی موجود تھیں۔ صدیوں کی غلامی نے زبردست غریبی کو جنم دیا تھا۔ پنڈت جی ان مسائل میں ڈوبے رہتے تھے مگر اس کے باوجود وہ اتنا وقت نکال لیتے تھے کہ ایک بھگوڑے لڑکے کو اپنے والدین سے ملانے یا کسی بیوہ کو جو سرحد کے اس پار رہ گئی تھی اپنے نزدیکی رشتہ داروں کے پاس پہونچ جانے میں مدد دے سکیں۔ مختصر یہ کہ وہ ہر آنکھ سے آنسو پونچھنا چاہتے تھے اور ہر مصیبت زدہ شخص کی عزتِ نفس کو بلند کرنا چاہتے تھے خواہ اس کا تعلق ہندوستان سے ہو یا پاکستان سے۔ اور اس معاملے میں ان سخت قاعدے اور قانونوں کی پروا نہ کرتے تھے جن کا دونوں ملکوں نے اپنی علیحدگی کے بعد ایک دوسرے سے بے اعتمادی اور منافرت کی وجہ سے ڈھیر لگا رکھا ہے۔

ایک مدبر اور انسان کی حیثیت سے پنڈت جی میں جو خوبیاں تھیں، ان سے قطع نظر پنڈت جی نے ایک نہایت ہی اچھے منتظم کی حیثیت سے بھی مجھے متاثر کیا۔ بڑی ہی پیچیدہ اور گنجلک فائلیں اور بڑے لمبے اور حوالوں سے بھرپور نوٹ شام کو چاہے جتنی دیر سے ان کے پاس بھیج دیجئے اور اس بات کا پورا یقین رکھئے کہ دوسرے دن صبح کو بڑا واضح اور اختصار کے ساتھ دلائل سے بھرپور حکم آپ کو مل جائے گا۔

خطوط اور نوٹ لکھانے کی ان میں بے پناہ صلاحیت تھی۔ مشکل سے مشکل مسئلے پر بھی جب وہ خط یا نوٹ لکھاتے تو اس میں زبان یا واقعے کی کوئی غلطی نہ ہوتی یا جس بات پر زور دینا ہوتا اس پر بالکل صحیح زور ہوتا۔ شاید ہی وہ کبھی کسی محاورے کو بدلتے یا کسی لفظ کو درست کرتے۔ وہ جتنا کام کرتے تھے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جسمانی یا ذہنی طور پر تھکتے ہی نہ تھے، چاہے دن میں کتنی ہی دیر تک کام کیا ہو۔ اگر کسی اہم یا دلچسپ بات پر گفتگو کرنی ہے تو وہ اس کے لئے وقت نکال لیتے اور پھر اگر انھیں اس موضوع سے دلچسپی پیدا ہو جاتی تو تھکن ان کے چہرے سے بالکل غائب ہو جاتی۔

ہندوستان کے بڑے بڑے مسئلوں اور عالمی معاملوں کو حل کرنے میں ایک مدبر کی حیثیت سے پنڈت جی میں کیا خوبیاں ہیں اس کا میں سرسری ذکر کروں گا۔ میں آپ کو یہ یاد دلانا چاہوں گا کہ انھوں نے ۴۰ کروڑ افراد پر مشتمل ایک قوم کو، جو صدیوں پرانے ذات پات، مذہب، تاریخ اور جغرافیہ کے پیدا کردہ اختلافات کا شکار رہی تھی، جذباتی طور پر متحد کرنے کے لئے کیا کچھ کیا۔ تقسیمِ ملک سے نہ صرف لاکھوں افراد ظلم و ستم کا شکار ہوئے اور انھوں نے بے انتہا مصائب برداشت کئے بلکہ اس کی وجہ سے ملک کا معاشی توازن درہم برہم ہو گیا اور وہ اپنی قدرتی سرحدوں سے محروم ہو گیا اور دفاع اور امورِ خارجہ کے مسائل پیدا ہو گئے۔ بلکہ سب سے بڑھ کر تو یہ ہوا کہ ایک بہت ہی بڑا نفسیاتی مسئلہ پیدا ہو گیا۔

انھوں نے ہندوستان کے لئے ایک ایسی خارجہ پالیسی وضع کی جس کی وجہ سے یہ ملک بین اقوامی مجلسوں میں اپنا سر اونچا اٹھا سکتا ہے اور دنیا کی نہایت ہی طاقتور قوموں کے ساتھ

برابری کی سطح پر بات کر سکتا ہے۔

چین کے حملے سے پہلے لگ بھگ دس برسوں تک وہ نہایت پرامن طریقے سے اور ہندوستان کی آزاد حیثیت سے کسی طرح کا کوئی سمجھوتہ کئے بغیر ملک کو تمام قسم کے بیرونی دباؤ اور دھمکیوں سے الگ رکھنے میں کامیاب رہے۔ ان کی بقائے باہم کی پالیسی مسلسل رکاوٹوں اور قصداً پیدا کی گئی غلط فہمیوں کے باوجود صحیح و درست ثابت ہوئی جس کا ثبوت وہ کوششیں ہیں جو دنیا کی دو بڑی قومیں آپس میں مفاہمت پیدا کرنے کے لئے کر رہی ہیں۔ سرد جنگ کے نازک ترین لمحوں میں ان کی مداخلت نے دنیا کے دور دراز حصوں میں لوگوں کو امن کی امید دلائی ہے۔

ان باتوں پر میں نے تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ میں نے پنڈت جی کے بارے میں صرف وہی باتیں کہی ہیں جنھیں میں نے ذاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔

تلوک چند محروم

ماتمِ نہرو

ہیہات گیا قافلہ سالارِ وطن — وہ راہ برِ منزلِ دشوارِ وطن

وہ ہاتھ کہاں ہیں جو اسے لہرائیں — حیرت میں ہے پرچمِ نگونسارِ وطن

•

شہر و صحرا میں سوگ نہرو کا ہے — دشت و دیار میں سوگ نہرو کا ہے

ساری دنیا کا بسکہ تھا وہ غم خوار — ساری دنیا میں سوگ نہرو کا ہے

•

نہرو کے نام سے تھی توقیرِ وطن — محنت سے بنا رہا تھا تقدیرِ وطن

افسوس، صد افسوس، مصوّر نہ رہا — تکمیل کی طالب رہی تصویرِ وطن

•

خونابہ فشاں ہے چشمِ نمناکِ وطن — مصروفِ فغاں ہے دلِ صد چاکِ وطن

نہرو کی خاکِ پاک جب اس میں ملی — سرمایۂ تقدیس ہوئی خاکِ وطن

•

جب تک کرۂ ارض پہ انساں ہوں گے — نہرو کی یاد کے بھی ساماں ہوں گے

مشرق مغرب سے اہلِ دل آ آ کر — نہرو کی سمادھ پر گل افشاں ہوں گے



اپنے مرشد کے ساتھ

۱۵ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ملک کے حق میں ووٹ دے رہے ہیں





قائدِاعظم محمد علی جناح کے ساتھ
(شملہ - مئی ۱۹۴۶ء)

۱۹۴۸ء میں کامن ویلتھ کانفرنس میں
(لنڈن)



غلام رسول مہر

پنڈت جواہر لال نہرو

دنیا میں روزانہ بے شمار انسان پیدا ہوتے ہیں اور بے شمار مرتے ہیں۔ انبیائے کرام ہوں یا اوتار، اولیا ہوں یا مہاتما، شاہنشاہ ہوں یا مشاہیر کوئی بھی موت کی دسترس سے باہر نہیں رہ سکا، کسی کو بھی اس سے رستگاری نہیں مل سکی۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی انسان تھے۔ ان کے لئے بھی یہاں سے کوچ کی مقررہ ساعت آپہنچی تو سب کچھ چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔

کیا آپ نے سوچا کہ پنڈت جی کا ماتم کیوں اس پیمانے پر کیا گیا جو اکثر شاہنشاہوں اور فرمانرواؤں کو بھی شاید ہی نصیب ہوا ہو؟ کیوں دنیا بھر میں ان کے لیے صفِ ماتم بچھی؟ کیا اس لیے کہ وہ ایک جماعت کے لیڈر اور ایک ملک کے وزیر اعظم تھے؟ لیڈر اور وزیر اعظم تو ہمارے سامنے ایک دو نہیں سیکڑوں گزر گئے، مگر اکثر کا ماتم اہلِ جماعت اور اہلِ ملک نے بھی خاص اہتمام سے نہ کیا۔ انسان کی قدر و منزلت اس کے جسم یا خاندان، عہدے اور منصب کی بنا پر نہیں، اس کے عمل و کردار، اس کے اخلاق و ایثار، اس کے جذبۂ خدمتِ خلق اور اس کے بلند مقاصد و عزائم کی بنا پر ہوتی ہے۔

پنڈت جواہر لال کی عظمت و برتری انھیں جوہروں کی درخشانی پر مبنی تھی، ان کی زندگی کا اصل سرمایہ یہی تھا، جس نے ان میں ہمہ گیر محبوبیت کی کشش پیدا کی۔ یقین رکھیے کہ انسانیت، جسم یا دولت یا املاک یا مناصب کا نام نہیں، صرف حسنِ عمل، خوبیٔ کردار اور اپنی ذات کو دوسروں کی بہبود کے لیے مٹا دینے کا نام ہے۔ اگر یہ ہے تو سب کچھ ہے، یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

نادر خصوصیتیں

پنڈت جی میں قدرت نے ایسی خصوصیتیں جمع کر دی تھیں، جو کسی انسان میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ وہ بڑے دولت مند باپ کے اکلوتے بیٹے تھے، گویا انگریزی محاورے کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ "سونے کا چمچا" منہ میں لیے پیدا ہوئے تھے۔ پھر باپ محض دولت مند ہی نہ تھا۔ اپنے عہد کا ممتاز قانون دان، ملک کا مشہور لیڈر اور معاشرے کا نہایت سربرآوردہ رکن بھی تھا۔ بعد ازاں ان چند لیڈروں میں شمار ہوا، جن کی بدولت تحریکِ آزادیٔ وطن کو ایسی قوت، طاقت اور عوامیت نصیب ہوئی جیسی پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

پھر پنڈت جی کو اعلیٰ فطری صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے وہ تمام سامان بوجہ احسن مہیّا ہو گئے، جو بہت کم افراد کے لیے مہیا ہوتے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پنڈت جی نے اپنے عہد اور ماحول کی بہترین تعلیم پائی، جس سے ان کی خداداد صلاحیتوں کو خاص جِلا ملی۔

فطری جوہروں کا ظہور

جب پنڈت جی ولایت میں تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آئے تو اہلِ ملک کے عوامی تصوّراتِ عزّت و برتری میں عوامیت کی کوئی بھی جھلک نمایاں نہ تھی اور پنڈت جی کی پیدائش سے

تعلیم و تربیت کی تکمیل تک کوئی بھی پہلو ایسا معلوم نہیں ہوتا تھا، جسے عوامیت یا خدمتِ خلق سے کوئی مناسبت ہوتی۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں انسانی فطرت کے حقیقی جوہر گردوپیش کی تمام مصنوعی دیواروں کو توڑ کر آشکارہ ہوتے ہیں اور انسانوں کے بنائے ہوئے بندھن چند لمحوں میں پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔ اسباب و احوال نے انھیں جس منزل کے لیے تیار کیا تھا، اس سے یکایک رُخ پھیرا اور بے تکلف اس راستے پر گامزن ہو لیے، جو انھیں عظمت و رفعت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچانے والا تھا۔ انھوں نے راحت و آسایش کے بہترین سامانوں کو ٹھکرایا، جو پیدایش کے وقت سے انھیں گھیرے ہوئے تھے، اس کے برعکس زیادہ سے زیادہ تکلیفوں، مشقّتوں، پریشانیوں اور اذیتوں کا راستہ اختیار کر لیا۔ فرشِ گل سے اُٹھے اور خارزار میں ننگے پاؤں پھرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس لیے نہیں کہ بڑے آدمی بن جائیں، اس لیے نہیں کہ انھیں عظمت کا بلند درجہ مل جائے۔ ایسی آرزوؤں سے ان کی فطرت کا دامن کبھی آلودہ نہ ہوا۔ اس لیے اور صرف اس لیے کہ ان کے دل اور روح کی آسودگی کا تقاضا یہی تھا۔ ان کے سازِ وجود کا اصلی ترانہ اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ غور فرمائیں۔ عنفوانِ شباب کا دَور، دولت کی ریل پیل، عزت و آسایش کی فراوانی، اہلِ خاندان کی محبت پروری و دل نوازی، بہار آفرینی کون سی نعمت ہے جو انھیں میسّر نہ تھی، لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز جواہر لال کی عناں گیر نہ ہو سکی۔

کایا پلٹ

غالباً یہی دور ہے، جب انھیں ہم وطنوں کی خستگی و بدحالی کا صحیح اندازہ ہوا اور ان کے قلبِ صافی میں عوام سے گہری محبت کا بیج بویا گیا، یہی دور ہے جس میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک ملک آزاد نہ ہو، معاملات کی باگ ڈور اپنوں کے ہاتھ میں نہ آئے عوام کی بہبود کے لیے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ یوں آناً فاناً پنڈت جی کی کایا پلٹی اور وہ اس دائرے میں پہنچ گئے، جہاں انھیں وقت کے عام تصوّرات کے مطابق کامیاب بیرسٹر اور کامیاب فرد نہیں بننا تھا بلکہ آزاد ہندوستان کا سرتاج بننا اور دَورِ حاضر کے چند اکابر میں شمار ہونا مقدر تھا۔

یہ بھی واضح رہے کہ آج سے پینتالیس پچاس سال پیشتر وہ راستہ اختیار کرنا سہل نہ تھا جو پنڈت جی نے بہ طیبِ خاطر اختیار کر لیا تھا۔ اس وقت اجنبی حکومت کی بنیادیں اتنی مضبوط و مستحکم تھیں کہ بڑی سے بڑی قوت کا حوصلہ بھی اس کے ساتھ ٹکرانے کے خیال سے افسردہ ہو جاتا تھا اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ آزادی کے لیے جہاد کتنی مدت میں پایۂ تکمیل پر پہنچے گا، لیکن منزل کی دوری، راستے کی دشواری اور سفر کی صعوبتیں پنڈت جی کے حوصلے پر قطعاً اثر انداز نہ ہو سکیں۔ وہ جانتے تھے کہ استبداد کے پہاڑ کو جاں فشانی سے کاٹے بغیر آزادی کی جوئے شیر نہیں بہائی جا سکتی، لہٰذا نتائج سے بے پروا ہو کر پہاڑ کاٹنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ خدا کی رحمت تھی کہ ان کی زندگی میں پہاڑ کٹ گیا اور کم و بیش سترہ سال کی مہلت مل گئی، جس میں وہ ملکی انتظامات کو اپنے تصوّرات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے تگ و دو کر سکے۔ ایسی مہلت بھی زندگی میں بہت کم انسانوں کو میسّر آتی ہے۔

ایک وجود نہیں ایک پروگرام

پنڈت جی کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی خاص توجہ کا محتاج ہے۔ انھوں نے جو راستہ والہانہ طریق پر اختیار کر لیا تھا، ان کے خاندان کا ایک ایک فرد بالکل انھیں کی طرح اسی راستے پر چلتا رہا۔ دار و گیر کی سختیاں اور قید و بند کی پریشانیاں جس طرح پنڈت جی نے خوشی خوشی قبول کر لیں، اسی طرح ان کی اہلیہ، ان کی بیٹی، ان کے والد، ان کی والدہ اور ان کی بہنوں نے بھی یہ سب کچھ قبول کیا۔ اگر پنڈت جی جیسی شخصیتیں بہ آسانی نہیں مل سکتیں تو ان کے خاندان جیسا ایثار پیشہ خاندان بھی کہاں نظر آتا ہے۔ گویا اس ایک وجود نے سب کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔

پنڈت جی ایک وجود نہیں تھے، ایک پروگرام اور ایک لائحہ عمل تھے۔ حق کے لئے سعی و جہد میں سب سے آگے، باطل کی مخالفت میں سب سے بڑھ کر سرگرم، دوستوں، رفیقوں اور

قومی کارکنوں کی ہمدردی اور اعانت میں ہر لحظہ بے تاب، اہلِ وطن کی بہبود میں مسلسل پائیدار و استوار، فرقہ وارانہ امتیازات سے بالا، مذہبی تعصبات سے پاک، ایثار و قربانی میں یگانہ، اس کا روشن ترین ثبوت اور کیا ہوگا کہ جو کچھ انھیں ورثے میں ملا یا مل سکتا تھا، وہ اس وقت خوشی خوشی قوم کی نذر کر دیا، جب آزادی کے لیے جد و جہد کی مصیبتوں میں مبتلا تھے اور اپنا کوئی مادی ورثہ قائم نہ کیا۔

پنڈت جی کی میراث

ان کی نہایت قیمتی زندگی کے پچاس سال کن مقاصد کے لیے وقف رہے؟ ملک آزاد ہو، تمام قومیں آزاد ہوں، وہ باہم امن و خیرسگالی کی زندگی بسر کریں، عوام کی حالت زیادہ سے زیادہ خوش گوار و اطمینان بخش ہو جائے۔ مذہبی تعصبات ختم ہو جائیں، اونچ نیچ مٹ جائے کش مکش جاتی رہیں، انسان شرفِ انسانی سے بہرہ مند ہوں، بھائیوں، خویشوں اور ایک کنبے کے افراد کی طرح زندگی گزاریں۔ یہی ان کی زندگی کا واحد سرمایہ تھا، یہی ان کی میراث ہے۔ انھوں نے اپنے لیے بھول کر بھی شہرت یا عزت یا برتری کی آرزو نہ کی۔ خدا نے انھیں شہرت، عزت اور برتری اس پیمانے پر عطا کی، جو بہت کم انسانوں کے حصے میں آتی ہے۔ یہی جواہر لال تھے، جن کا ماتم دنیا بھر نے کیا اور جن کی محبت بھری یاد نہ صرف اہلِ ہند بلکہ دنیا کے ہر انسانیت دوست اور امن پرور طبقے میں برابر قائم رہے گی۔ دوام صرف اللہ کے لیے ہے۔

نریش کمار شاد

جاوداں نہرو

(مکمل نظم پانچ بندوں پر مشتمل ہے۔ دو بند کہیں اور شائع ہو گئے ہیں۔ یہاں صرف تین بند ہی درج کئے جاتے ہیں۔ ادارہ)

یوں تو اکثر ملول رہتا ہوں   لیکن امشب کچھ اور ہے عالم
بولتا ہوں تو ہونٹ جلتے ہیں   بات کرتا ہوں تو بڑی مبہم
سوچتا ہوں تو ایسے لگتا ہے   ہے خیالوں کی آنکھ بھی پُرنم
دیکھتا ہوں تو دیکھتا کیا ہوں   صفِ انجم بھی ہے صفِ ماتم
اس جہاں میں تو باوجودِ وجود   ہر کوئی گام زن ہے سوئے عدم
اس کا انجام دل شکن ہے بہت   زندگی ہی کی دلکشی کی قسم
اس کی تعمیر شاندار سہی   اس کی بنیاد تو ہے نامحکم
خاک میں مل کے خاک ہو جانا   کیا یہی کچھ ہے قسمتِ آدم
جب یہی کائنات ہے اس کی   خاک ہے پھر جہانِ آتش و نم
اس طرح کے اداس اداس خیال   آ رہے ہیں دماغ میں پیہم
کائنات آبدیدہ ہو جیسے   غم میں ایک ایک چیز ہو مدغم
ایک مغموم فلسفی کی طرح   سرنگوں میرے دیس کا پرچم
کر رہا ہے زبانِ حسرت سے   شکوۂ بے ثباتیٔ عالم

گونجتی ہوں فضا کے سینے میں
جیسے یہ دل خراش آوازیں

جس نے بخشی نئی حیات ہمیں   وہ مسیحا وہ صاحبِ اعجاز
جس کی تو قیر ملک کی توقیر   جس کی آواز قوم کی آواز
جس کو دردِ وطن نے پالا تھا   لبِ ہستی کا وہ تبسمِ ناز
جس کی دھن جس کی فکر جس کی نظر   دلنشیں جاں فروز روح نواز
جس کی تعلیم جد و جہد مدام   جس کا پیغام مستقل تگ و تاز
جس کی گیرائیٔ نظر پاتال   اور آکاش ذہن کی پرواز
کشتگانِ حیات کا ہمدرد   خوش دلانِ حیات کا ہمراز
ہمہ تن حسن عشق سر تا پا   گاہ محمود اور گاہ ایاز
ایسا کافر کہ جس کے کفر میں بھی   جیسے ایمان پڑھ رہا ہو نماز
ایک ایسا سپوت جس کا وجود   مادرِ ہند کا تھا اک اعزاز
ایک اتنا بڑا سیاست داں   جو سیاست پہ تھا اثر انداز
ایک دنیائے نور جس کا شعور   جس کا دل اک جہانِ سوز و گداز
جانِ تھے حکمت و بصیرت کی   جس کے اندیشہ ہائے دور و دراز
رہنماؤں کا رہنما یعنی   رہنمایانِ دہر میں ممتاز

ہائے کیا بے نظیر تھا نہرو
وائے افسوس چل بسا نہرو

لیکن اے میرے دیس کے لوگو!   اے ستم خوردگانِ لیل و نہار
آج ہیں ہم شکستہ دل بے حد   اور ہیں بے شمار غم بکنار
پھر بھی غم کی ہنسی اڑائیں کیوں   ہو کے اس دیوتا کے غم کا شکار
کس لئے دل بجھا کے بیٹھ رہیں   غم تو ہے ایک چشمۂ انوار
غم سے خیر آشنا تو ہوتے ہیں   غم سے مرتے نہیں کبھی خوددار
آدمی بے ثبات ہے لیکن   آدمیت نہیں زوال آثار
آدمیت کی بھی ہے موت اگر   مان لی جائے حادثات سے ہار
موت اک امرِ ناگزیر سہی   کیوں کیا جائے زندگی سے فرار
کیوں نہ اہلِ وطن قسم کھائیں   کہ رہیں گے اسی کے پیروکار
جو تھا جمہوریت کا پیغمبر   عالمی امن کا جو تھا اوتار
ہم رہیں گے رواں دواں پیہم   منزلیں ہوں گی راستے کا غبار
کیونکہ اپنے ہی دیوتا کے بقول   یہ جہاں ہے عمل کا ایک دیار
للہ الحمد اس سکوت میں بھی   سن رہا ہوں یہ وقت کی للکار
اصل میں قابلِ پرستش ہیں   یہ جو غم کے بھڑک رہے ہیں شرار

کیوں نہ کام ان سے بھی لیا جائے
خود کو بے سوز کیوں کہا جائے

جواہر لال

کبھی دلّی میں لب کھولے کبھی کشمیر سے بولا
سیاسی گُتھیّوں کو ناخنِ تدبیر سے کھولا

سمیٹا اپنی پیشانی میں مشرق کے دماغوں کو
اُجالے مرحمت فرمائے بھارت کے چراغوں کو

سموئے راستی اور امن کے رنگ اپنے پرچم میں
نہ رکھّا فرق کچھ بھی عظمتِ سیتا و مریم میں

ہر اک تازہ بلا کو مسکرا کر ٹالنے والا
بہادر، وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والا

ہیں اب بھی اہلِ یورپ معترف جس کی درایت کے
سو دی مملکت نے گائے گُن جس کی فراست کے

کبھی بھوٹان میں پہنچی کبھی نیپال تک پہنچی
نوا اِس سازِ خوش آہنگ کی پاتال[1] تک پہنچی

بہاروں نے جبینِ ہر چمن میں نکہتیں بھر دیں
تقدّس حُور کا غلماں کے رُخ کی طلعتیں بھر دیں

طرب زارِ محبّت بن گئی اس دیس کی بھومی
کیا ہِنسا کو زیرِ گام اہنسا کی جبیں چُومی

بہاریں اپنی رکھ دیں جس کے چرنوں میں ہمالے نے
ہمیشہ پاؤں چومے جس کے گنگا اور جمنا نے

وہ جس نے حوصلوں سے آندھیوں کی دُھول اُڑائی ہے
وہ جس کو دیکھ کر طوفان کی بھی آنکھ آئی ہے

وہ جس کی ہر نظر کو پردہ دارِ آب و گِل کہیئے
وہ جس کو ایشیا کی آنکھ اور بھارت کا دل کہیئے

وہ جس کے ہوش میں آتے ہی ذہنی انقلاب آیا
وہ جس کے عہد میں فہم و فراست پر شباب آیا

وہ جس کے گھر کی چھت پر شانتی کی جوت لہرائی
وہ جس کی گود میں امن و اماں نے پرورش پائی

وہ جس کے سامنے ہر وقت تھا اک رام اک رب تھا
وہ جس کا دھرم تھا انسانیت، اخلاق مذہب تھا

وہ جس کے غور و فکر و عزم میں قدرت ہی قدرت تھی
وہ جس کے دل میں سوز اعصاب میں بجلی کی قوت تھی

[1] امریکہ

وہ جس کی رہگزر میں منزلِ حق و صداقت ہے   وہ جس کا نقشِ پا نقشِ دوامِ آدمیّت ہے
وہ جس کو مادرِ ہندوستاں کا لاڈلا کہئے   وہ جس کو بے جھجک انسانیت کا دیوتا کہئے
وہ جس کے دستِ بازو میں قیادت مسکراتی تھی   وہ جس کے آستانے پر سیاست سر جھکاتی تھی

وہ جس کی موت پر دھرتی کا بھی سینہ دہل جائے
چتا پر جس کی چرخِ آبدیدہ پھول برسائے

وہ جس نے راکھ ہو کر بھی وطن سے منہ نہیں موڑا   رہا مٹ کر بھی ماں کی گود میں دامن نہیں چھوڑا
وہ جس کی زندگی کو موقفِ ملک و ملل کہئے   فلاحِ قوم کی تحریک کا حسنِ عمل کہئے
وہ جس کے خامۂ پرکار کو پرکار کہتے ہیں   محاسب، زاویہ سازِ درِ دُربار کہتے ہیں
وہ جس کے سامنے آتے ہوئے ضیغم بھی ڈرتے تھے   گرجنے والے پانی جس کے دروازے پہ بھرتے تھے
وہ جس کے ذہن میں سلجھی ہوئی تدبیریں آتی تھیں   لکیریں جس کی پیشانی کی تقدیریں بناتی تھیں

وہ جس کی راکھ کھیتوں میں اماں کے گیت گاتی ہے
امر ہے وہ، اُسے معدوم کہتے شرم آتی ہے

جو نقش اس نے بنائے ہیں انھیں رنگِ حنا دے دو   صفائی قلب کی نورِ سویدائے وفا دے دو
رہے تاریخ کے اوراق پر نام و نشاں اس کا   پڑھا جائے بعنوانِ وفا روشن بیاں اس کا
دیا ہے جو پیام اس نے اسے فرضِ وفا سمجھو   دکھائی ہے جو اس نے راہ اس کو حق نما سمجھو
خزاں میں بھی رہو آئینۂ حسنِ چمن بن کر   چمک اپنی دکھاؤ غازۂ روئے وطن بن کر
بڑھیں طوفان لاکھوں، زلزلے پر زلزلہ آئے   بلا کی آندھیوں میں بھی ترنگا اپنا لہرائے
اخوّت، دوستی، مہر و صداقت عام ہو جائے   محبّت سب کا ورثہ ہے محبّت عام ہو جائے
تپش باقی رہے دل میں نہ مطلق اب ثقاوت کی   نظر آئے نہ چنگاری کہیں بغض و عداوت کی
جو ہیں مظلوم انھیں بڑھ کر لگاؤ اپنے سینے سے   جو اُجڑے ہیں انھیں جا کر بساؤ پھر قرینے سے
کسی عنوان سے بھی سامنے آئے نہ رسوائی   نہ ہونے پائے ناموسِ وطن پر حرف آرائی

وطن کی آن کو سمجھو وطن کی شان دہراؤ
وطن سے ہے محبّت تو جواہر لال بن جاؤ

جنتا کا جواہرلال

بمبئی کے لوک ناچ آرٹسٹوں
کے ساتھ اُن کے لباس میں





اگاؤں کے لباس میں



لداخی لباس میں

یوم جمہوریت کے موقعے پر
وک ناچ کرنے والوں کے ساتھ



ادیبوں کا دوست
جواہرلال

برنارڈ شا کے ساتھ





فراق گورکھپوری کو
ساہتیہ اکادمی کا انعام
دے رہے ہیں۔

ہمایوں کبیر

نہرو — ایک ادیب کی حیثیت سے

جواہر لال کی تحریروں سے اس بات کا تازہ اور معقول ثبوت ملتا ہے کہ ایک ادیب میں جو خصوصیتیں ہوتی ہیں وہ وہی ہوتی ہیں جو ایک انسان کی حیثیت سے اس میں موجود ہوں۔ ایک ادیب جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے وہی اس کے تجربے کی بنیاد ہوتی ہے۔ اس کا پس منظر کردار اور اس کی تربیت بالکل ذاتی اور شخصی ہوتی ہے، مگر یہی چیزیں عوام سے اس کے رابطے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کو دبانے یا چھپانے کی لاکھ کوشش کرے مگر اس کی شخصیت کا اظہار ہو ہی جاتا ہے۔ اس اصول کا اطلاق تمام فن کاروں پر ہوتا ہے خواہ وہ شاعر ہوں یا مصوّر، موسیقار ہوں یا بت ساز یا فنِ تعمیر کے ماہر۔

شری نہرو کی بنیادی خصوصیت یہ رہی ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات اور ان کے اظہار میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ تسلیم نہیں کی۔ ان کے نزدیک فکر کا مطلب احساس اور احساس کا مطلب قول یا فعل کے ذریعے اس پر عمل ہے۔ ان کی تیزی اور ذہنی جودتِ ذہن لوگوں کو اُلجھن میں ڈال دیتی تھی اور بعض اوقات ان میں غصّہ بھی پیدا کر دیتی تھی۔ ان کے ردِ عمل کی تیزی سے بوکھلا کر بعض لوگ انھیں تیز مزاج سمجھتے تھے اور بعض اوقات ان کی تحکم پسندی پر محمول کرتے تھے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے نہ ان کی تنک مزاجی کا اظہار ہوتا تھا اور نہ تحکم پسندی کا۔ اس سے تو درحقیقت ان کے فن کارانہ جذبے کا انکشاف ہوتا ہے۔ کیونکہ فن کار کے یہاں تجربہ اور اس کا اظہار دونوں کا عمل ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

نہرو کی تحریروں کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ وہ براہ راست ہوتی ہیں اور ان میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں زور بھی ہے اور سادگی بھی، جس سے پڑھنے والا پہلی ہی نظر میں ان کا مدّاح ہو جاتا ہے اور اس کی یہ تحسین بعد میں بھی برقرار رہتی ہے۔ یہ علامت اس بات کی ہے کہ نہرو کے دل میں کسی قسم کی اندرونی کش مکش نہیں ہے۔ خواہ مظاہرِ فطرت ہوں یا انسانی تجربہ، دونوں سے ان کے دل میں ایک ایسا ردِ عمل ہوتا ہے جس میں ان کی شخصیت پوری طرح کام کرتی نظر آتی ہے۔ پہاڑ انھیں دل کش نظر آتے ہیں۔ غروبِ آفتاب کا نظارہ انھیں بار بار یاد آتا ہے۔ حسین و جمیل الفاظ اور اچھے کام انھیں بے حد پسند ہیں۔ ان سب کے بارے میں جب ان کا قلم اٹھتا ہے تو اتنی نزاکت اور قدرت کے ساتھ اُٹھتا ہے جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی قوتِ ادراک و احساس کیسی عمدہ اور نفیس ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ اکثر فن کار غصّے یا ہمدردی کے جذبات کے تحت سیاست کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ عام آدمی کے دل میں موجودہ خرابیوں کے خلاف غیظ و غضب کا جو شعلہ بھڑکتا ہے وہ امتدادِ وقت سے سرد پڑ جاتا ہے۔ مگر فن کار کے یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی

شری ہمایوں کبیر کا مضمون ٹائمز آف انڈیا کی شائع کردہ کتاب "A story of Nehru' سے لیا گیا ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے اور تجربے بڑھتے جاتے ہیں اس کے احساسات اور جذبات میں بھی شدّت پیدا ہوتی جاتی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ اسے اپنے تصوّرات کی دنیا میں ذرا دیر کے لئے بھی چین نہیں لینے دیتے۔ دکھ اور مصیبت کے ساتھ ہمدردی کا نتیجہ بھی یہی نکلتا ہے۔ پھر فن کار اپنی شخصیت کے خول میں چھپا نہیں رہ سکتا اور خواہ وہ پسند کرے یا نہ کرے اسے اس خول سے باہر نکل کر بُرائیوں کے خلاف مورچہ لینے کے لئے مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ یہی نہرو کی قسمت میں بھی تھا، کیوں کہ ان کا تخیل انھیں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھنے دیتا جب تک وہ سیاسیات کے اکھاڑے میں کود نہ پڑتے۔

نہرو ایک عملی سیاست دان تو بن گئے لیکن ان کے اندر چھپے ہوئے فن کار نے دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا۔ عملی آدمی کو تو ان باتوں سے مطلب ہوتا ہے جس سے فوری طور پر اس کا واسطہ ہو۔ ہر جگہ اور خاص طور پر ہندوستان میں ایسا شخص اپنے ذاتی تردّدات اور آلام کے بوجھ سے دبا ہوتا ہے۔ خود اپنی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد اس میں دوسروں کے آلام و مسرّت میں شریک ہونے کی سکت بہت تھوڑی باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن ایک فن کار کی کیفیت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ اسے اپنی تخیّل کی دنیا میں جن آلام سے سابقہ پڑتا ہے وہ انھیں اسی طرح محسوس کرتا ہے جیسے یہ آلام خود اس پر گزر رہے ہوں۔ اس کا اس پر اسی طرح شدید ردِّ عمل ہوتا ہے جس طرح براہ راست واسطہ پڑنے کی صورت میں ہوتا۔ کسی فن کار کے دل میں دُکھ اور درد کا جو شدید احساس ہوتا ہے اس احساس کے تحت نہرو کا دل بھی دور دراز ملکوں کے لوگوں کے دُکھ اور مصیبت کا حال سُن کر اسی شدّت کے ساتھ تڑپ اُٹھتا ہے جتنی شدّت کے ساتھ گرد و پیش کے لوگوں کے حالِ زار پر تڑپتا ہے۔ بعض لوگ اس کا جواز انھیں ایک بین اقوامی شخصیت کہہ کر پیدا کرتے ہیں، لیکن سچّی بات یہ ہے کہ دکھ درد اور مصائب کے بارے میں ان کا رویّہ ایک فن کار کا رویّہ ہے۔

نہرو کی پہلی تصنیف 'باپ کا خط بیٹی کے نام' دنیا کی تعمیر اور اس کی نشو و نما کی داستان ہے۔ ان کی اس تصنیف کو نوجوانوں کے پڑھنے کے لائق سائنس کا محض ایک کتابچہ سمجھنا غلط ہوگا۔ اس میں علم الارض اور علم الحیات کا بیان گہرے انسانی جذبات کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ہماری زندگی کے آلام اور خوشیاں کائنات کی ایک وسیع تر زندگی میں مدغم ہو جاتی ہیں اور اُن کو ایسی پائداری حاصل ہو جاتی ہے کہ پھر ان پر انقلابات وقت کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ اس کی حدود سے بالاتر ہو جاتی ہیں۔ فرد و اجتماع کے ردِّ عمل اور دنیا کے عوامل کے درمیان جو تغیّر پذیری ہوتی رہتی ہے اس کا کبھی خاتمہ نہیں ہوتا۔

Ghnipses of the World History (تاریخِ عالم کی جھلکیاں) اور اس کے بعد کی تصنیف Discovery of India (تلاشِ ہند) دونوں کتابیں معاملاتِ انسانی کے بارے میں شدید ترین جمالیاتی احساس اور وسیع تر دلچسپی کے امتزاج کی مظہر ہیں۔ "تاریخِ عالم کی جھلکیاں" میں انسانی تہذیب کی نشو و نما کا ذکر وسیع اور جامع الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ازمنہ گزشتہ کے پُر شکوہ مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے نہایت نمایاں شکل میں پیش ہوتے رہتے ہیں۔ کینوس بہت وسیع ہے لیکن مصنّف کی شخصیت ہر وقت موجود نظر آتی ہے۔ ہم یہ بات بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ دنیا کا مرقع خود مصنّف کا مرقع ہے اور صرف یہی نہیں ہے نہرو تو مسحور کن سادگی کے ساتھ پُر جوش واقعات کے دوران ہمیں اپنے ذاتی محسوسات سے بھی آگاہ کرنے لگتے ہیں یا اس تنہا پھول کا ذکر کرنے لگتے ہیں جو جیل کے صحن میں کھلا ہے۔ ایک معنی میں ہر آرٹ تجریدی ہوتا ہے۔ جہاں تک نہرو کی تصنیفات کا تعلق ہے قید خانے کی زندگی کی پابندیاں اکثر ایک ایسے چوکھٹے کا کام کرتی ہیں جس میں رنگا رنگ تصویریں لگی ہیں۔

'تلاشِ ہند' کے مطالعے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں فرد اور دنیا کا یکساں خیال ہے اور ان میں غمِ ذات کو غمِ کائنات سے ہم آہنگ کر دینے کی قدرت ہے۔ ان کی یہ تصنیف ہندوستان کی کھوج تو ہے ہی، مگر ان کی شخصیت کو آشکار کرتی ہے۔ ان دونوں

باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہر فرد کی زندگی فی الواقع ایک ایسا نقطۂ ماسکہ ہے جس میں تمام کائنات نظر آتی ہے۔ ایک معمولی انسان کا مشاہدہ غیر شعوری اور کورانہ ہوتا ہے لیکن فن کار کا مشاہدہ تو شعوری ہوتا ہے اور یہ اس کی تمام تخلیقوں کو معنی و مقصد عطا کرتا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے کہا ہے کہ فن کا کوئی اعلیٰ نمونہ نہ صرف پہلے کے تمام فنی کارناموں سے متاثر ہوتا ہے بلکہ اپنے وجود میں آنے کے بعد سابقہ فن پاروں میں تغیر و تبدل کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح آرٹ کی دنیا میں اس دنیاوی قانون کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے کہ پہلے سبب ظاہر ہوتا ہے اور پھر نتیجہ برآمد ہوتا ہے کسی قدر غور و خوض کرنے سے معلوم ہوگا کہ ایلیٹ کے بیان کا تضاد صرف ظاہری ہے۔ فنی تخلیق کا وجود انسان کے ذہن میں ہوتا ہے کسی نئے فن پارے کے بارے میں ہمیں جو تجربہ ہوتا ہے اس کا دارومدار ان تجربات پر ہوتا ہے جن سے ہم گزر چکے ہیں۔ جب ایک بار ہم اس تجربے سے گزر جاتے ہیں تو وہ ہمارے وجود کا ایک حصہ بن جاتا ہے اور حتیٰ کہ پرانے آقتدار سے متعلق ہمارے احساسات کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس لئے کسی نئی فنی تخلیق کا ادراک سابقہ فنی تخلیقوں کے بارے میں ہماری پسند میں تبدیلی لے آتا ہے۔ لہٰذا 'تلاش ہند' میں ہندوستان کی کھوج کے ساتھ ساتھ تجربات کی دل کش دنیا، جو خود نہرو کی ذات ہے، کا بھی پتہ چلتا ہے۔

بہر حال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری ادبی دنیا میں ایک بلند ترین کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سوانح عمری میں بیک وقت غنائی شاعری اور رزمیے کا لطف ملتا ہے۔ اس سے ایک مصنف اور ایک انسان کی حیثیت سے متعدد خوبیاں مترشح ہوتی ہیں۔ ان کی اپنی زندگی کی کہانی، قوم کی کہانی اور آزادی کے لئے کی گئی اس کی جدوجہد سے ہم آہنگ ہے۔ ان کی سوانح عمری کے ہر صفحے سے خلوص، صاف گوئی اور گرمیٔ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ واقعات کے انبار سے انھوں نے بڑی اچھی طرح کام لیا ہے اور انسانوں اور مسائل کے بارے میں بڑی صحیح رائے قائم کی ہے۔ اس کے باوجود یہ تصنیف جذبۂ تلاش اور احساسِ تجسس سے بھری ہوئی ہے۔

ان کی خود نوشت سوانح عمری ہندوستان کی قومی جدوجہد کی داستان کی حیثیت سے اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس معرکہ خیز دور میں جن لوگوں نے ہندوستان کی قسمت بنانے میں حصّہ لیا ہے اس میں سے چند کے کردار کے ہمدردانہ مطالعے کی حیثیت سے غالباً اس کتاب کا کوئی جواب نہیں ہے۔

ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو کا کردار داستان پر کچھ اس طرح چھایا ہوا ہے کہ بیٹے کی خود نوشت سوانح عمری بیک وقت باپ کی سوانح عمری بن گئی ہے۔ طے شدہ مقصد یا کسی شعوری کوشش کے بغیر باپ کی زبردست ذہانت اور دلیری کا موازنہ بیٹے کے جوشیلے پن اور جذباتی خوبی سے ہو گیا ہے۔ جواہر لال نہرو کی نگاہ میں گاندھی جی کا کتنا احترام تھا یہ تمام دنیا کو معلوم ہے۔ لیکن اس سوانح عمری میں انھوں نے مہاتما گاندھی کو بھی خوردبین سے دیکھا ہے۔

انسانی دماغ کا تحقیقی تجزیہ کرنے کی قدرت سے مصنف میں دروں بینی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر دوسری طرف تاریخ کی وسیع محرکات کے احساس سے خارجی اندازِ فکر کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس امتزاج کے ساتھ ساتھ جب ہم موسموں کے ردّ و بدل اور رنگ و نور کے تغیرات کے معاملے میں نہرو کی سریع الحسی اور اس چھوٹی سی زندگی کے کھیل میں ان کی بے پناہ خوشی، شام اور صبح کے بدلتے ہوئے انداز کے متعلق ان کے احساسات کا بھی اضافہ کر دیتے ہیں تو ایسی حالت میں اگر کسی شخص کو یہ افسوس ہوتا ہے کہ ایک عظیم سیاسی رہنما کو پا کر ہندوستان ایک ایسے مصنف سے محروم ہو گیا ہے جو اس سے بھی زیادہ عظیم ہو سکتا تھا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

ہمیں پنڈت نہرو کی تمام تصانیف میں ایک ایسا توازن اور ایک ایسی سنجیدگی ملتی ہے جو ایک سائنسی مزاج کا مابہ الامتیاز ہوتی ہے۔ انھوں نے انسانوں اور ان کے متعلق تمام معاملات کا مطالعہ کرنے میں سائنس کا غیر شخصی اور خارجی انداز اختیار کیا ہے۔ وہ تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنے کی کوشش کرتے تھے اور اسی لئے ان کے نکتہ چیں ان کو ہندوستانی سیاسیات کا 'ہیملٹ'

سکتے تھے۔ اس کا ان کی عوامی سرگرمیوں پر جو اثر پڑا اس کے بارے میں سب کو تو نہیں کچھ لوگوں کو البتہ افسوس ہوا مگر کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ جہاں تک ان کی تصنیفات کا تعلق ہے اس کا بے حد فائدہ ہوا۔ وہ بنیادی طور سے سائنسی مزاج کے مالک تھے۔ ان میں تجسس و تلاش کا جذبہ اور ناقدانہ نظر تھی۔ اس میں شاعر کے تخیل اور ایک انسانی دوست کی عالی ظرفی کا بھی اضافہ ہوگیا۔

اپنی خود نوشت سوانح عمری کی بدولت نہرو نے دنیائے ادب میں ایک مستقل جگہ حاصل کرلی ہے۔ ان کے دیگر تمام کاموں کے مقابلہ میں یہ کتاب ان کی بھرپور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو کہیں زیادہ اجاگر کرتی ہے۔ ایک فن کار کی طرح ان کے دل میں درد و کرب کا احساس تو موجود ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ غلط کاری کے خلاف ان کے دل میں ایک جنگجو کا سا غیظ و غضب بھی پایا جاتا ہے۔ خود نوشت سوانح عمری میں ان کی شخصیت کے دونوں پہلوؤں کا مکمل اور اطمینان بخش اظہار ملتا ہے۔ پست اور درماندہ لوگوں کے دلوں میں ان کے شعلہ انگیز الفاظ مسرت پیدا کرتے ہیں۔ ان کی آواز تاریکی کو چیرتی ہوئی بددلی اور مایوسی کے شکار لوگوں کو امید کی کرن دکھاتی ہے۔ وہ نہایت شد و مد کے ساتھ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی معاملے کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے میں ہمیشہ معقول پسندی سے کام لیا جانا چاہیئے اور ان کا یہی وہ وصف ہے جس سے ان کی تصانیف میں معاملہ فہمی اور کشادہ نظری کی خوبیاں موجود ہیں۔

ان کی خود نوشت سوانح عمری سے جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں وہ ان کی دوسری تصنیف "کچھ پرانے خطوط" سے اور بھی زیادہ گہرے ہوجاتے ہیں۔ یہ کتاب ایسے خطوط کا مجموعہ ہے جو زیادہ تر نہرو کے نام لکھے گئے ہیں۔ چند ایسے ہیں جو انھوں نے لکھے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا جو خط ملتا ہے وہ ۱۹۱۷ء کا لکھا ہوا ہے اور آخری خط ۱۹۴۸ء کا ہے جو ان کے نام ہے۔ ان میں بعض خطوط خالص سیاسی نوعیت کے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن میں غور و فکر اور ذاتی تاثرات کی آمیزش ہے اور ملک کی سماجی اور معاشی بہتری کے لئے کچھ کرنے کی خواہش کا اظہار ہے۔ یہ کہنا غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ یہ خطوط پچھلے چالیس یا ان سے کچھ زیادہ برسوں کی ہندوستان کی تاریخ کا نچوڑ ہیں۔ ان سے ہمارے اس تصور کی تصدیق ہوتی ہے کہ نہرو عوامی زندگی میں ایک آرٹسٹ تھے۔ اس کے علاوہ ان میں ایک اور بھی پہلو نمایاں ہے جو اُن کی خود نوشت سوانح عمری میں زیادہ واضح نہیں تھا۔ بسا اوقات لوگوں نے نہرو کو غلط سمجھا ہے اور اس لئے انھیں جذباتی انسان قرار دیا ہے۔ نہرو جذبات کی رو میں اکثر بہ جاتے ہیں لیکن ان خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے جذبات کی اس وقتی اور عارضی ہیجان انگیزی کی تہ میں ایک گہرا اور نہ بدلنے والا مقصد بھی چھپا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ اُن کی ذاتی دل کشی اور ان کے اندازِ گفتگو کی دل نشینی اور آب و تاب سے مسحور ہوجاتے ہیں مگر ان کی قوت ارادی کتنی زبردست تھی اور وہ اپنے مقاصد پر کتنی مضبوطی سے جمے، اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ ان خطوط سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ چالیس سال یا اس سے زیادہ مدت کے دوران نہرو اکثر بلند شخصیتوں کے آگے سر جھکائے نظر آتے ہیں بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آخرکار انھیں کا اندازِ فکر اور انھیں کا فلسفۂ زندگی سب پر غالب رہا۔

"کچھ پرانے خطوط" سے نہرو کے کردار کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے جس سے ان کی شخصیت کی دل کشی میں اضافہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن جو بعض مرتبہ سیاسی عمل میں کمزوری کا باعث بھی ثابت ہوا ہے۔ جو قدریں انھیں واقعی عزیز تھیں ان پر نہایت صبر و استقلال کے ساتھ عامل رہے لیکن اس کے باوجود ان کے کردار میں ایک حد تک برداشت اور رواداری کا مادہ بھی تھا اور اس کا امکان ہے کہ سرسری نگاہ سے دیکھنے والوں کی نظروں سے یہ پہلو نظر انداز ہوجائے۔ ان خطوط سے اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ کام کرتے تھے ان سے بعض اوقات شدید اختلافات پیدا ہوجاتے تھے مگر ان کی طرف سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی گئی کہ وہ ان اختلافات

کی وجہ سے قطع تعلق کر لیں گے۔ وہ اس حد تک اشتراک اور تعاون کے لئے تیار رہتے ہیں جب تک کہ ایسا کرنا ممکن ہے۔ اگر قطع تعلق کی نوبت آ ہی جاتی تو پہل ان کی طرف سے کبھی نہیں ہوئی۔

'کچھ پرانے خطوط' سے اس بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ حالانکہ نہرو گاندھی جی کے بڑے مدّاح تھے پھر بھی اُن کا عالمی نقطۂ نظر گاندھی جی کے نظریہ سے بنیادی لحاظ سے مختلف تھا۔ دراصل وہ گاندھی جی کے بمقابلہ ٹیگور کے زیادہ قریب تھے۔ زندگی کے بارے میں ٹیگور کا نظریہ بنیادی طور سے جمالیاتی تھا۔ شاید نہرو عوامی زندگی کے بہترین فن کار ہیں۔ ٹیگور نے اپنے جذباتی محسوسات کے ساتھ زبردست تعقل پسندی کو بھی شامل کر لیا تھا جس کی وجہ سے انھیں موجودہ مغربی زندگی اور ثقافت کو قبول کرنے میں آسانی ہو گئی تھی۔ نہرو نے بھی مغربی اقدار کو قبول کر لیا تھا۔ ٹیگور کا خیال تھا کہ جسمانی محنت اور فن کے ذریعے روحِ انسانی میں بالیدگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ نہایت آزادی اور شدّت کے ساتھ اس غلامی سے بھی نجات چاہتے تھے جس کا امکان مشینوں کے استعمال کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ مستقبل کے ہندوستان کا جو تصوّر نہرو کے ذہن میں تھا اُس میں وہ ایک ایسا معاشی نظام چاہتے تھے جہاں ہاتھ سے کام کرنے کی مہارت کو مشینوں کے زیادہ سے زیادہ استعمال سے سہارا ملے۔

ٹیگور کی طرح نہرو کی ہستی بھی ایک بین اقوامی ہستی ہے جن کے دل میں ہندوستان کے لئے زیادہ گہری ہمدردی ہے کیونکہ ہندوستان نے بیرونی اثرات کے لئے اپنا دروازہ کبھی بند نہیں کیا۔ بجائے اس کے اس نے تو ہمیشہ اپنے قدیم ساحلوں پر آنے والی نہ جانے کتنی تہذیبوں اور ثقافتوں کو خوش آمدید کہا ہے۔



نجیب رامش

آہ ..... نہرو!

پیامِ صبح دے کر ہنسنے والے آخری تارو ـــ !
وہ شب بیدار جو تم سے بھی پہلے جاگ اٹھتا تھا
ابھی سویا ہے، تھوڑی دیر سو لینے دو، پھر آنا
ہواؤ ! اتنی تیزی سے نہ گزرو صحنِ گلشن سے
وہ دانش ور، صبا رفتار تھی فکرِ رسا جس کی
ابھی خوابیدہ ہے، بیدار ہو لینے دو، پھر آنا
زمیں پر خُلد کی تعمیر کے بے باک منصوبو!
وہ انساں جس کی باہوں میں تمھیں آرام ملتا تھا
جہاں سے اٹھ گیا ہے اس پہ رو لینے دو، پھر آنا
اگر آؤ، تو پھر نوحے پڑھو اپنی زبانوں میں
تمھارا نام بھی شامل ہے اس کے سوز خوانوں میں

تھکی آنکھو ! تمھاری دسترس سے دور ہے نہرو
بس اب چھپتے ہوئے سورج کی کرنیں اس کو دیکھیں گی
کہ دن ڈھلتے ہی راہی چل پڑا ہے اپنی منزل کو
وہ ہاتھ اب دہر کی تزئین کرنے سے گریزاں ہیں
کہ جن کے لمس سے پتھر پگھل کر موم ہوتے تھے
وہ دل گم ہے جو دھڑکاتا تھا ہندوستان کے دل کو
وہ مشعل بجھ گئی ہے جس کے بے پایاں اُجالے میں
جبینِ مادرِ گیتی کی افشاں جگمگاتی تھی
وہ لب چپ ہیں جو چونکاتے تھے سازِ دل کو، سلاسل کو
فرشتے اس کی کومل آتما کو لے کے اڑتے ہیں
وہ دیکھو آسماں سے سورگ کی جانب کو مڑتے ہیں

•

لڑکپن کی حسیں کلکاریو ! خاموش ہو جاؤ
وہ آنکھیں مُند گئی ہیں، بھول جن کی وہ حسیں آنکھیں
جو تم میں دیکھتی تھیں ایک بہتر نسلِ انساں کو
ہٹا دو ہر چمن سے ادھ کھلے غنچے گلابوں کے
کہ ان کا شاخِ گُل پر مسکرانا بے ضرورت ہے
سجائے گا اب ان سے کون اپنے جیب و داماں کو؟
دشائیں رو رہی ہیں بادلوں سے نیر جھرتا ہے
دلوں میں چُبھ رہی ہے آج اس چہرے کی بے نوری
کہ جس نے شانتی کا گیت بخشا بزمِ امکاں کو
کمندیں پھینکنے والو ! نہ لوٹے گا ٹھکانوں میں
کبوتر اڑ گیا ہے نیلے نیلے آسمانوں میں

مری دنیا سے آج اک امن کا پیغامبر گُم ہے
جہاں سے روٹھ کر اک چاند پہونچا ہے خلاؤں میں
افق کے ماہ پارو ! اس کو اپنی بزم میں ڈھونڈو
زمینو ! تم میں ہو گا کوئی عنصر اس کی کایا کا
جو حصہ تھا تمھارا، تم میں آ کر مل گیا ہو گا
رو پہلے کوہسارو ! اس کو اپنے عزم میں ڈھونڈو
ہمارا رہنما اب ہم میں تو شامل نہیں لیکن
جو کل تک تھا ہمارا، آج وہ تم سب میں شامل ہے
سنہرے ساحلو ! موجوں کے رقصِ دل آرام میں ڈھونڈو
اگر مل جائے تو تم اس کی جے جے کار کر لینا
مری دھرتی کی جانب سے تم اس کو پیار کر لینا

امجد نجمی

روشنی بجھ گئی

محفلِ ہند ہے وقفِ تیرہ شبی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی
چارسو ہے بپا شورشِ ماتمی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

سہمی سہمی فضائیں سیہ پوش ہیں، مچلی مچلی تمنّائیں خاموش ہیں
کلفتِ رنج و غم اور بھی بڑھ گئی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

ہو گیا گُل چراغِ سرِ رہگذر، اب کہاں وہ تب و تابِ قلب و نظر
ظلمت آگیں ہوئی پھر شبِ زندگی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

اک دہکتا سا انگارا جل ساگیا، ایک شعلہ لپکتا سا سنولا گیا
اے غمِ بے کسی اے غمِ بے کسی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

وہ ستارا تھا سورج تھا یا چاند تھا، اس کے آگے یہاں ہر کوئی ماند تھا
اب کہاں وہ فروغِ مہ و مشتری روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

اب وہ رقصِ شرر کی نمائش کہاں، اب وہ آبِ گہر کی تراوش کہاں
اب کہاں مہرِ روشن کی تابندگی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

شمعِ سوزاں تھی یا قمقمہ برق کا آخری لمحہ تک جو چمکتا رہا
ہر طرف پھر مسلّط ہوئی تیرگی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

جس کی ہر ہر ادا نغمۂ دل نشیں، جس کا ہر ہر نفس تھا حیات آفریں
ڈھونڈتی ہے اسے آنکھ ہر ایک کی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

بادۂ ناب مینا میں باقی رہا اور نہ مینا بکف کوئی ساقی رہا
مے کشو اب نہیں لذّتِ مے کشی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

قوم روتی ہے فخرِ وطن اٹھ گیا، پھول کہتے ہیں رشکِ چمن اٹھ گیا
اب نہیں ہے بہاروں میں وہ دلکشی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

داغ سینے کے جاکر دکھائیں کسے، داستانِ شبِ غم سنائیں کسے
حالِ دل اپنا نجمیؔ نہیں گفتنی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

بشر نواز

صداقت مر نہیں سکتی

ہوائیں چلتے چلتے تھم گئیں گہنا گیا سورج
بگولے تلملاتے خاک اڑاتے چار سو نکلے
فضائیں ماتمی چیخوں سے بوجھل ہیں گلستاں میں —
—نسیم صبح چلتی ہے تو ہوتا ہے گماں جیسے
کئی ناکام روحیں دور صحرا میں سسکتی ہیں
وہ غم ہے اشک آنکھوں میں لبوں پر حرفِ ماتم جم کے رہ جائے
رگوں میں دوڑتا خوں لمحہ بھر کو تھم کے رہ جائے
مغنّی سر بزانو چاک دامن ہے
کہ تنہا فرد کا نوحہ بھی مانگے ہے لہو دل کا
یہاں اک قوم کا اک دور کا نوحہ سنانا ہے
مغنّی سر بزانو ہے
کہاں سے ساز پائے کون سی آواز لے آئے
وہ کیسے اس غمِ جانکاہ کا اظہار کر پائے
گھٹا جاتا ہے دم، بڑھنے لگے ہیں رات کے سائے
مگر اک پیار میں ڈوبی ہوئی آواز کی مشعل
فروزاں ہے
یہ کہتی ہے
محبّت کی صدا چاہت کا نغمہ مر نہیں سکتا
وہ نغمہ پھیل جاتا ہے
کبھی خوشبوئے گل بن کر کبھی رنگِ چمن بن کر
کسی گلنار چہرے پر تبسم کی کرن بن کر
کبھی حرفِ وفا بن کر
کبھی بلبل و غا بن کر
کسی معصوم کے ہونٹوں پہ پاکیزہ دعا بن کر
وہ نغمہ پھیل جاتا ہے
نئے سورج کی گاتی ناچتی کرنوں کی صورت میں
سمندر کی ابھرتی ڈوبتی موجوں کی صورت میں
کسی دلبر کسی دلدار کے اشکوں کی صورت میں
محبّت کی صدا چاہت کا نغمہ اک صداقت ہے
صداقت مر نہیں سکتی وہ ہر محفل میں جلتی ہے
ہمیشہ دامنِ انسانیت کے چاک سیلتی ہے

•

اخلاص و عقیدت کے پھول

ہدیہ بحضورِ عزت مآب رہنمائے ملک عالیجناب پنڈت جواہر لال نہرو آنجہانی

۶۴ (از حروفِ منقوطہ) ۱۹ء

منجانب خلوص کیش عبد الرّب عرفان ایم اے

۱۹۶۴ء

صدرِ شعبۂ فارسی، وِدربھ مہاوِدّیالیہ (کالج)، امراوتی

۱۹۶۴ء

ہند کے اے رہبرِ ہر دل عزیز کیوں نہ تیرے غم میں دل ہو داغ داغ
تجھ سے پاکر منزلِ انسانیت مل گیا انساں کو انساں کا سراغ
راہِ ہستی میں ترا ہر نقشِ پا دے رہا ہے ایک منزل کا سراغ
حق یہ ہے، حاصل کسی لمحہ نہ تھا فکرِ ملک و قوم سے تجھ کو فراغ
پھر بھی بل آیا نہ ماتھے پر کبھی تیرے قابو میں رہے قلب و دماغ
آہ تیری طبعِ روشن کے بغیر ہو گئی بزمِ سیاست بے چراغ
پا رہے ہیں تیرے کھو جانے کے بعد ہم "تلاشِ ہند" سے تیرا سراغ

کہہ دو یوں عرفان تاریخِ وفات
ہو گیا گل امن کا روشن چراغ

۱۹۶۴ء

تاریخ کی مشعل بجھی

وصی سیتاپوری

زندگی نے اس عجب انداز سے کروٹ سی لی نبضِ فطرت چلتے چلتے بے ارادہ رک گئی
وقت کو ٹھوکر لگی تاریخ کی مشعل بجھی لڑکھڑا کر رہ گئی ہے جیسے پوری اک صدی
وقت کے کچے گھروندے میں ہمالہ کھو گیا دیش پوچھا ہے ادھوری اور شوالہ کھو گیا
ایک عظمت چھن گئی ہے اک جیالا کھو گیا ساحلِ جمنا پہ طوفانوں کا پالا کھو گیا
بن گیا طوفاں کا رہبر مشعلوں کا قافلہ کتنے ہی معصوم پھولوں کا تبسم لٹ گیا
اک چتا نے آگ اگلی امن کا سورج چھپا چند شعلے پھڑپھڑا اٹھے 'امر ہے آتما'

کون کہتا ہے جواہر لال نہرو مر گیا
زندگی خوش ہو ترا معیار اونچا کر گیا

سحر عشق آبادی

قطعاتِ تاریخِ وفات

(جواہر لال نہرو)

سُرگ میں جانے کی اِچھا کامیوں کی ہو تو ہو
راگ میں نہرو کے دردِ آدمیّت کی ہے لَے
دیش کی نشکام سیوا سے مُنش ہوتا ہے مُکت
موت بھی مر جائے گی ہوگی امر پھر کون شے

اب جواب ان کا ہزاروں سال ہو سکتا نہیں
حُکم پر چلنے کا وعدہ کرتے ہیں، چلتے ہیں کے؟
قیدِ جنّت میں جواہر لال جا سکتے نہیں
شامل اُس پرماتما میں آتما نہرو کی ہے

(۲۷-مئی ۱۹۶۴ء)

پھیر سے آواگون کے ایسے نیتا ہیں بری
جو دل و جاں دیں وطن پر موکش پاتے ہیں وہی
سُرگ کا لالچ نہ رکھتے تھے جواہر لال جی
ایشور کی جوتی میں نہرو کی جوتی مل گئی

(جیٹھ بدی ۶ ۱۸۸۶ شاکھا)

ہے آتما کے حق میں آواگون مصیبت
لیکن میں اب امر ہوں منزل وہ پا گیا ہوں
جو پاسبانِ جاں تھی لائی ہے وہ قضا ہی
میں تیرا بندہ نہرو اے برہم آگیا ہوں

(۱۴ محرّم ۱۳۸۴ ہجری)

پریم پال اشک

ایک شہنشاہ ایک غلام

(سانیٹ)

پھول کی پتّی سے کاٹا تو نے پتّھر کا جگر
تجھ کو گھٹّی میں ملا گوتم کا لافانی شعور
تیری رگ رگ میں سرایت نانکؔ و چشتیؔ کا نور
تیری ایک ایک بات میں تھی وسعتِ قلب و نظر

زندگی بھر تو نے کِیلے جنگ کے زہریلے ناگ
تو نے شنکر بن کے سب زہرِ ہلاہل پی لیا
کرشن کا سندیش تو نے کُل زمانے کو دیا
عمر بھر تو نے لگائی حرص کی لنکا کو آگ

کر دئے تو نے کھڑے اک صف میں محمود و ایاز
دُور تو نے کر دکھایا امتیازِ خاص و عام
تو اخوّت کا شہنشہ تو محبّت کا غلام
کون ہے بندہ کسی کا؟ کون ہے بندہ نواز؟

تو نے ڈھارس دی ہمیشہ ہر دلِ ناکام کو
تو نے شیشے میں اُتارا گردشِ ایّام کو

جواہر لال نہرو کی وصیت سے اقتباسات

مجھے ہندوستان کی جنتا سے اتنا پیار ملا ہے کہ چاہے جو کچھ بھی کروں وہ اس پیار اور محبت کے چھوٹے سے حصے کا بھی بدلا نہیں ہو سکتا اور بلاشبہ پیار جیسی بیش قیمت چیز کی کوئی قیمت بھی ادا نہیں کی جا سکتی۔ بہت سے ایسے لوگ گزرے ہیں جن کی قدر و منزلت کی گئی۔ کچھ ایسے ہیں جن کے ساتھ نہایت عزت و احترام کا سلوک کیا گیا۔ لیکن میرے حصے میں ہندوستان کے ہر طبقے کے لوگوں کی اس قدر اور بے پایاں محبت آئی کہ میں اس کے بوجھ سے دب گیا ہوں۔ میں صرف اس امید کا اظہار کر سکتا ہوں کہ اپنی زندگی کے بقیہ دنوں میں بھی میں اپنے لوگوں کی توقعات اور ان کے پیار و محبت کے ناقابل ثابت نہیں ہوں گا۔

میں پوری سنجیدگی کے ساتھ یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ میری موت کے بعد میرے لئے کوئی مذہبی رسم ادا نہ کی جائے۔ اس قسم کی رسوم پر میرا عقیدہ نہیں ہے اور محض رسمی طور پر ان کے ادا کئے جانے پر راضی ہونا ریاکاری اور اپنے آپ اور دوسروں کو دھوکا دینے کے مترادف ہوگا۔

میری خواہش ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری لاش جلا دی جائے۔ اگر میں کسی غیر ملک میں مروں تو میری لاش وہیں جلا دی جائے اور میری خاک الہ آباد بھیج دی جائے۔ اس میں سے مٹھی بھر خاک گنگا میں ڈال دی جائے اور اس کا بیشتر حصہ اس طرح ٹھکانے لگایا جائے جیسا کہ میں نے نیچے لکھا ہے۔ میری استھیوں کا کوئی حصہ ہرگز بچایا یا محفوظ نہ رکھا جائے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میری اس خواہش کے پیچھے کوئی مذہبی جذبہ کار فرما نہیں ہے کہ میری مٹھی بھر خاک الہ آباد میں گنگا میں بہا دی جائے۔ بچپن سے ہی مجھے الہ آباد میں گنگا اور جمنا سے گہرا لگاؤ رہا ہے اور جیسے جیسے میں بڑھتا گیا یہ لگاؤ بھی بڑھتا گیا۔ جیسے جیسے موسم بدلتا ہے میں نے ان ندیوں کے بدلتے ہوئے مزاج کو دیکھا ہے اور میں نے اکثر اس تاریخ، دیومالا، روایت، گیت اور کہانی کے بارے میں سوچا ہے جو اس سے زمانۂ قدیم سے وابستہ چلی آ رہی ہے اور اس کے بہتے ہوئے پانی کا حصہ بن گئی ہے۔

خاص طور سے گنگا ہندوستان کی ندی ہے۔ اس کے گرد اس ملک کی تہذیبی یادیں، اس کی امیدیں اور اندیشے، فتح مندیوں کے گیت اور اس کی ہار اور جیت کا تانا بانا بنا ہوا ہے۔ وہ ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب اور تمدن کی علامت ہے۔ سدا بدلتی اور ہمیشہ بہتی پھر وہی گنگا کی گنگا رہتی ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں اور گہری گھاٹیوں کا خیال آتا ہے جن سے مجھے بے حد محبت ہے۔ مجھے اس کے نیچے کے وہ وسیع اور زرخیز میدان یاد آ جاتے ہیں جہاں میری زندگی اور عمل کی راہیں متعین ہوئی ہیں۔ صبح کی روشنی میں مسکراتی و ناچتی اور شام کے پھیلے ہوئے سائے میں تاریک، اداس اداس اور پُراسرار بنی ہوئی اور جاڑوں میں دامن سمیٹے آہستہ خرامی اور دلیری کے ساتھ بہتی ہوئی اور برسات میں سینہ چوڑا کئے ہوئے گرجتی، دھاڑتی یعنی سمندر بنی ہوئی اور اسی کی طرح تباہ کر دینے والی طاقت کا مظاہرہ کرتی ہوئی یہی گنگا میرے لئے ہندوستان کی ماضی کی علامت اور اس کی یاد ہے۔ یہ ماضی سے بہتی ہوئی زمانۂ حال میں آئی ہے اور مستقبل کے عظیم

سمندر کی طرف بہتی چلی جا رہی ہے۔ اگرچہ میں نے بہت سی قدیم رسموں اور روایتوں کو ترک کر دیا ہے اور مجھے اس کی بڑی فکر ہے کہ ہندوستان ان تمام بندھنوں سے نجات پا جائے جو اسے جکڑے اور دبائے ہوئے، اور اس کے عوام میں پھوٹ پیدا کیے ہوئے اور ان کی بڑی تعداد کو کچلے ہوئے ہیں اور ان کے جسم و روح کی ترقی میں حائل ہیں۔ گو کہ میں یہ سب کچھ چاہتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں اپنے آپ کو اس ماضی سے بالکل منقطع کرنا نہیں چاہتا۔ ہندوستان کا جو قدیم ورثہ رہا ہے اور جو اب بھی ہمارا ہے، میں اس پہ فخر کرتا ہوں اور مجھے اس کا احساس ہے کہ میں بھی اپنے تمام دوسرے ہم وطنوں کی طرح اس سلسلۂ زنجیر کی ایک کڑی ہوں جس کا سرا ہندوستان کی قدیم ترین تاریخ تک پہنچا ہے۔ میں اس زنجیر کو توڑنا نہیں چاہتا کیونکہ میں اس کی قدر کرتا ہوں اور اس سے جوش اور حوصلہ حاصل کرتا ہوں۔ اپنی اس خواہش اور ہندوستان کے تہذیبی ورثے کو اپنا آخری خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ مٹھی بھر میری خاک الہ آباد کے پاس گنگا میں ڈال دی جائے تاکہ وہ بہہ کر اس مہان ساگر میں جا گرے جو ہندوستان کے کنارے سے ٹکرا رہا ہے۔

میری خاک کے بیشتر حصے کو دوسرے ڈھنگ سے ٹھکانے لگایا جائے۔ اسے ہوائی جہاز میں رکھ کر کافی اونچائی پر لے جایا جائے اور وہاں سے ان کھیتوں میں بکھیر دیا جائے جہاں ہندوستان کا کسان اپنا پسینہ بہاتا ہے تاکہ میری راکھ ہندوستان کی مٹی اور خاک میں اس طرح مل جائے کہ پہچانی نہ جا سکے۔

خراجِ عقیدت

میرے پاس آج بولنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ دنیا نے انسانیت کا ایک پرستار کھویا ہے اور اپنے دیس کی جنتا نے لاثانی قائد۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ غم کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اس وقت ہم سب کو ہمت رکھنی چاہیئے۔ آپس میں اتحاد، محبت، الفت اور شفقت بڑھانی چاہیئے......

—— ونوبا —— بھودان تحریک ——

ہر کام کے کرنے والے کو قدردان کی تلاش رہتی ہے اور پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنی قوم پر جو احسانات کئے ان میں سے ایک نمایاں احسان یہ ہے کہ انھوں نے اپنی قدرشناسی کی بدولت ہزاروں لاکھوں کی ہمت بڑھائی اور ملک میں اس یقین کو عام کر دیا کہ اس کا جوہر شناس رہنما ہر کمال کی پوری اور سچی قدر کر سکتا ہے۔ اس سے کیا کیا شوق اور ولولے پیدا ہوئے یہ ان گمنام یا غیر معروف لوگوں سے پوچھئے جن کے حوصلوں کو جواہرلال کے حیات آفریں تبسم نے نئی زندگی عطا کی....

—— محمد مجیب —— کتاب نما' دہلی ——

وہ آزاد ہندوستان ہی کے بانی اور اس کے معمار نہ تھے بلکہ پورے ایشیا کی آبرو اور دنیا کی عظیم شخصیتوں میں سے تھے۔ انھوں نے نصف صدی تک ہندوستان کی مسلسل اور ان تھک خدمت کی۔ وہ جنگِ آزادی کے سپہ سالار بھی تھے اور آزاد ہندوستان کے معمار بھی...

—— شاہ معین الدین احمد ندوی —— معارف ——

..... شروع ہی سے زندگی پاکیزہ، سنجیدہ، شریفانہ رہی۔ اور ظرف بڑا ہی عالی رہا۔ پڑھنے لکھنے میں برق، علمی بلندیوں کے شیدا ملک کی آزادی اور وطن کی خدمت ہی کو شروع سے اپنا مقصودِ زندگی بنا لیا اور اس لگن کو آخر تک نباہ دیا۔ نہ دنیا کا لالچ کیا، نہ مال و جاہ کی محبت کو سینے میں جگہ دی۔ نہ اپنے کو بڑا مانا نہ کسی پر اپنا تفوق جتایا۔ خدمت لینے کی نہیں، خدمت کرنے کی دُھن سوار رہی....

—— عبدالماجد دریابادی —— صدق جدید ——

سب سے پہلے تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس خیال سے میرا دل بیٹھا جا رہا ہے کہ میرے محبوب دوست پنڈت جواہرلال اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں، اور میں بدبخت، ابھی تک جی رہا ہوں

شاد عظیم آبادی کا یہ شعر میرے دل کا خون کئے دیتا ہے کہ:۔

پس از معشوق، جینا، عشق کو بدنام کرنا ہے
خدا مجنوں کو بخشے مر گیا، اور ہم کو مرنا ہے

پنڈت جی کو میں اس وقت سے جانتا تھا جب کہ میری مسیں بھیگ رہی تھیں، اور انھوں نے سیاست کے میدان میں پہلا قدم رکھا تھا۔

ان کی شخصیت میں اس قدر جاذبیت و محبوبیت اور ان کے تبسم میں اس بلا کی دل کشی تھی کہ جب ان کی جانب نظر اٹھاتا تھا تو مجھ کو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا جیتا جاگتا اور ہنستا بولتا تاج محل سانس لے رہا ہے۔

پنڈت جی، آپ چلے گئے، اب میں بھی آپ کے پاس بہت
جلد آرہا ہوں، میرا انتظار کیجئے ع آیا، اے یارِ رفتہ، آیا، آیا

—— جوش ملیح آبادی ——

...... پنڈت نہرو واقعی ایک عظیم سیاست دان تھے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ ان معمر سیاست دانوں کے عمر و تجربہ کے لحاظ سے سرخیل تھے جو پچھلی نصف صدی میں یورپی قوموں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتے رہے .....

.... اب اس مرتبہ اور اس صف کا کوئی راہنما نہیں رہا وہ بیک وقت کئی تصویروں کا مرقع تھے۔ وہ وزارت عظمیٰ کے لئے وجۂ افتخار تھے۔ ان کے قلم کا سکہ چلتا تھا۔ انگریزی کے انشاپرداز کی حیثیت سے یورپ کے نامور اہلِ قلم بھی ان کا اعتراف کرتے تھے ...

—— شورش کاشمیری —— چٹان لاہور، پاکستان ——

ہزار رنگ ملے، اک سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا غبار۔ مشتِ بہار
ہوا ہے، وادیٔ جنت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے، بہت دور جستجو بن کر

—— مخدوم —— حیدرآباد

وہ چاند چھپا جس چاند سے روشن بھارت تیرا امبر تھا
وہ پھول جھڑا جس پھول سے مہکا آنگن آنگن گھر گھر تھا
در در پر اس نے دستک دی انگریز کو بڑھ کر للکارا
یا ریل میں اس کی بیٹھک تھی یا جیل میں اس کا بستر تھا
سوراج سے برسوں پہلے ہی ہر دل پر اس کا راج رہا
وہ راج دلارا بھارت کا ہر بات میں سب سے بڑھ کر تھا

—— وقار انبالوی —— لاہور پاکستان ——

مرے وطن کی زمیں کے اداس آنچل میں
نہ آج رنگ نہ خوشبو، بھری ہوئی ہے دھول
خبر نہیں ہے کہ کس دل جلے کی راکھ ہے یہ
کہ سر جھکا کے پہاڑوں نے بھی کیا ہے قبول
سنا ہے جس کی چتا سے یہ خاک آئی ہے
وہ فصلِ گل کا پیمبر تھا، عہدِ نو کا رسول
اُسے خبر تھی خزاں کس چمن میں سوئی ہے
وہ جانتا تھا کہ کیا ہے بہار کا معمول
سکھایا کشمکشِ جنگ و امن میں اس نے
جراحتوں کو چمن بندیٔ جہاں کا اصول
اُنھیں دلوں میں محبت کی کیاریاں بو دیں
اُگے ہوئے تھے جہاں صرف نفرتوں کے ببول
جو آج موت کے دامن میں اک ستارہ ہے
وہ زندگی کے گریباں میں تھا گلاب کا پھول

—— سردار جعفری ——

پھول رنجیدہ، صبا غم گیں، چمن افسردہ ہے
آج تاباں انجمن کی انجمن افسردہ ہے
ایک دیوانہ تھا وہ بھی اپنے رستے چل دیا
سوگ میں ڈوبا ہے صحرا اور بن افسردہ ہے

—— غلام ربانی تاباں —— جامعہ ——

.... نہرو اب اس دنیا میں نہیں ہیں ذہن اس امر کو تسلیم نہیں کرتا۔ ٹھیک ہے کہ وہ کافی عرصہ سے بیمار چلے آرہے تھے اور ان کی صحت سے تشویش پیدا ہو رہی تھی لیکن ان کی موت پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا دل و دماغ پر ایک سکوت طاری ہو جاتا ہے ہونٹوں سے ایک آہ نکل جاتی ہے دل کا دکھ گہرا ہو جاتا ہے۔ ان کی موت سے ہندوستان اپنے سب سے بڑے سپوت اور دنیا ایک عظیم مدبّر سے محروم ہو گئی ہے۔ ان کے جانے سے دنیا غریب تر ہو گئی ہے۔ لاکھوں نفوس کے دل بجھ گئے ہیں۔

—— اے۔ایل خطیب —— مارننگ نیوز ڈھاکہ کراچی پاکستان

....جواہرلال نہرو جن کا سعودی عرب میں رسول السلام کہہ کر استقبال کیا گیا تھا اس دنیا کو امن کا پیغام سناتے سناتے آخر ابدی نیند سو گئے۔ ہندوستانی قوم کہتی ہے کہ ہمارا انمول جواہر کھو گیا لیکن دنیا کی دوسری قوموں اور ان کے لیڈروں میں بھی محرومی کا اسی قدر شدید احساس پایا جاتا ہے۔ ساری دنیا ان کے غم میں سوگوار ہے....

— عشرت علی صدیقی — قومی آواز لکھنؤ —

ملک اپنے سب سے بڑے دوست سے محروم ہو گیا۔ قوم کے سچے غم خوار اور شفیق کا سایہ اس کے سر سے اُٹھ گیا۔ ایشیا اور افریقہ ایک انقلابی لیڈر سے تہی دامن ہو گئے۔ دنیا ایک ایسے گوہر تابدار بلکہ سورج سے محروم ہو گئی جو مایوسی اور تاریکی میں اس کی ہمت بڑھایا کرتا تھا اور اسے امن و امان اور عالمی بھائی چارے کا پیغام سکون افزا دیا کرتا تھا۔

وہ اس صدی میں ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی عظیم ترین شخصیت تھے۔ اپنے ملک اور دنیا کو بہت کم لوگوں نے اتنا متاثر کیا جتنا انھوں نے کیا.... ہند — کلکتہ

نہرو کے عظیم نظریات ہر دور میں ہماری رہنمائی کرسکیں گے....

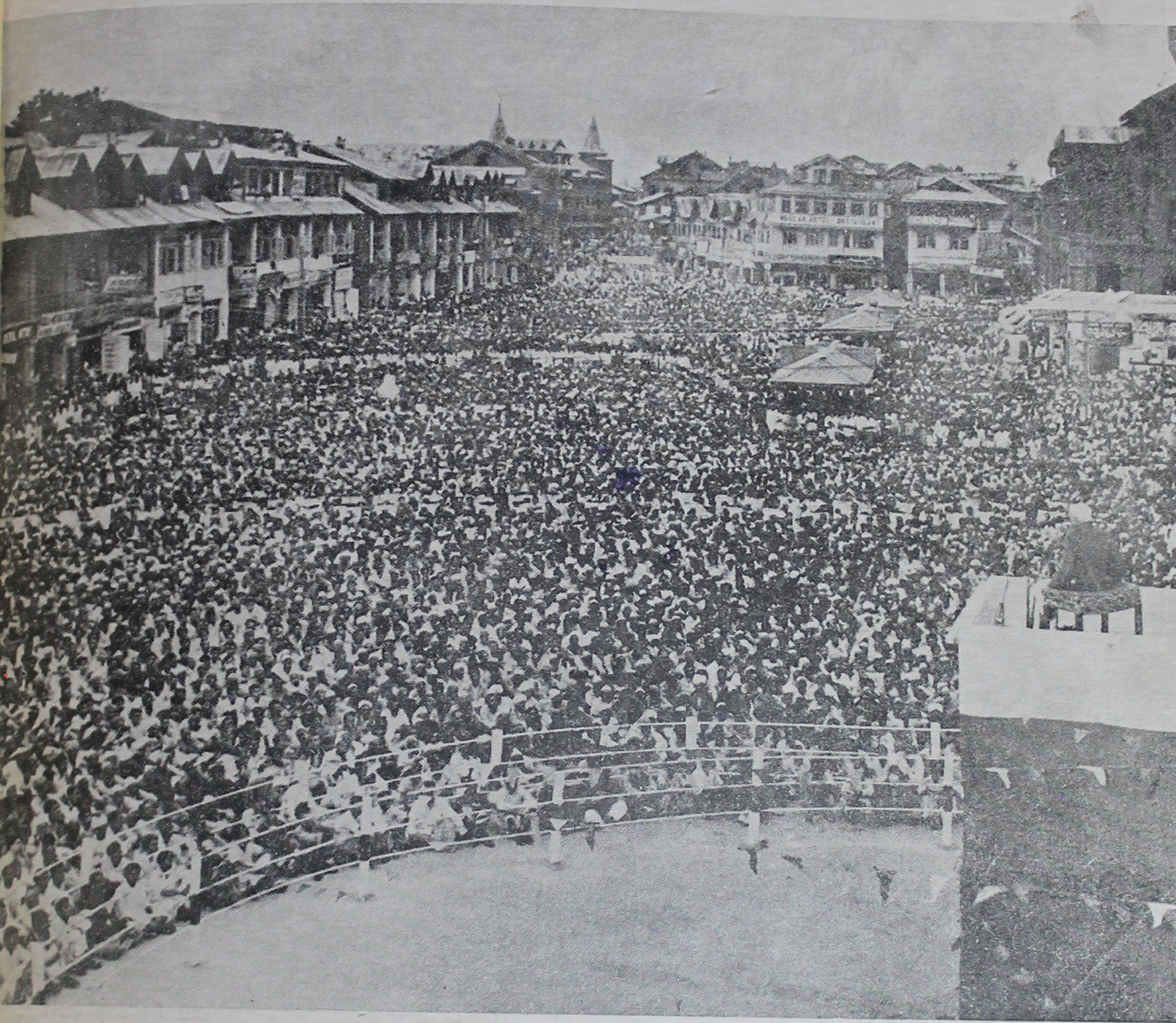
— انقلاب۔ بمبئی —

....جواہرلال نہرو جیسی شخصیتیں کسی ملک میں تو کیا پوری دنیا میں کم ہی پیدا ہوا کرتی ہیں۔ ان کا اُٹھ جانا صرف ہندوستان کا نہیں پوری ترقی پسند دنیا کا نقصان ہے....

اجمل — بمبئی —

ہندوستان کی تاریخ میں یوں تو کئی عظیم الشان شخصیتوں کے نام آتے ہیں لیکن جواہرلال نہرو کا کوئی بدل نہیں اور کوئی مقابلہ نہیں۔ جواہرلال نہرو نے اپنے فکر و عمل سے ہندوستان اور ایشیا کی تحریک آزادی کی رہنمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ جواہرلال نہرو ہندوستان اور ساری دنیا کے ایک عظیم قائد تھے۔ ہندوستان کی یہ یقیناً بدقسمتی ہے کہ آج ہمارا ایک ایسا قائد اٹھ گیا ہے کہ جس نے دنیا میں نئے ہندوستان کو ایک مقام دیا تھا....

سیاست — حیدرآباد —



Edited & published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
Printed by Union Printers Co-op. Industrial Society Ltd., Karol Bagh, New Delhi-5

Regd. No. D-509